سیماب اکبر آبادی اور ان کی ادبی خدمات

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مقالہ نگار

مقیم احمد

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

نگراں

پروفیسر احمد محفوظ

شعبۂ اردو

فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

SEEMAB AKBARABADI AUR UNKI ADABI KHIDMAT

Thesis

submitted to

Jamia Millia Islamia

In partial fulfilment of the requirements of the award of the Degree of

Doctor of Philosophy

URDU

by

Moqeem Ahmad

Under the supervision of

Prof. Ahmad Mahfooz

Department of Urdu

Faculty of Humanities and Languages

JAMIA MILLIA ISLAMIA

New Delhi

فہرست

پیش لفظ

بیسویں صدی میں جن شعرا نے اردو شاعری کو اعتبار بخشا، ان میں عاشق حسین صدیقی سیماب اکبرآبادی قابل ذکر ہیں۔ سیماب ۱۸۸۰ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ اور کثیرالجہت شخصیت کے مالک تھے۔ سیماب نے اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ مروجہ علوم وفنون اور ادبیات اردو، علم عروض، عربی اور فارسی کی تحصیل و تکمیل میں بسر کیا اور تعلیمی زندگی کے مختلف مراحل میں متعدد اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ سیماب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ایک طرف انہوں نے شاعری کی اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی، مرثیہ، قطعات و رباعیات میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا تو دوسری طرف نثر میں بھی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ شروع میں انہوں نے غزلیں لکھیں اور اصلاح کے لیے داغؔ دہلوی کو استاد بنایا اور ۱۸۹۸ میں داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ شاعری کے میدان میں سیماب نے اتنی ترقی کی کہ آگے چل کر خود ایک کامیاب استاد کے مرتبے پر فائز ہوئے اور ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تیار ہوا۔ انہوں نے صدہا شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دیں۔ جس طرح داغ نے حیدرآباد میں ایک دفترِ شعری اصلاح کے لیے قائم کیا تھا، اسی طرح سیماب نے بھی اپنے وطن آگرہ میں ۱۹۲۲ میں ''قصرالادب'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ انہوں نے رسائل واخبارات جاری کیے، جن میں رسالہ ''شاعر'' ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور یہ رسالہ تا حال جاری ہے۔

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں کا ضخیم دیوان ''کلیم عجم'' کے نام سے ۱۹۳۶ میں شائع ہوا۔ ''کلیم عجم'' میں تین ابواب ہیں۔ پہلا ''صہبائے کہن'' دوسرا ''بادۂ دوشیں'' اور تیسرا ''نشید

نو‘‘ ۔ان تینوں ابواب میں کل ۱۷۲ غزلیں ہیں اور آخر میں ’’جرعات‘‘اور’’موج ناتمام‘‘ کے عنوان سے متفرق اشعار شامل کیے گئے ہیں ۔ ایک تضمین اور تین مثلث بھی یہاں موجود ہیں۔ان کی غزلوں کا دوسرا دیوان ۱۹۴۶ میں ’’سدرۃ المنتہیٰ‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔اس دیوان کی پہلی غزل کو’’میرا نصب العین‘‘ کا عنوان دیا گیا ہے۔اس میں کل ۱۴۴ غزلیں اور دو تضمین ہیں اور’’جرعے‘‘ کے تحت متفرق اشعار درج ہیں۔سیماب اکبرآبادی کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ ’’لوحِ محفوظ‘‘ ۱۹۷۹ میں منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے میں ۱۹۴۳ سے ۱۹۵۱ تک کی غزلیں شامل ہیں۔’’لوحِ محفوظ‘‘ میں غزلوں کی کل تعداد ۱۰۵ ہے۔ان غزلوں میں پختگی، شائستگی اور زبان و تراکیب کے تجربات بھی ملتے ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کے تخلیقی ذہن کے تنوع کا اندازہ ان کتابوں سے کیا جا سکتا ہے، جو انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں۔ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ نیستاں (۱۹۲۵) کارامروز (۱۹۳۲) ساز و آہنگ (۱۹۴۱) اور شعرِ انقلاب (۱۹۴۷) میں شائع ہوئے۔اِسی دوران دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے متاثر ہوکر انہوں نے رباعیاں لکھیں، جو’’عالم آشوب‘‘ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔سرودِ غم اور نفیرِ غم ۱۹۴۳ میں شائع ہوئے، جو عزائی نظموں اور سلاموں پر مشتمل ہیں۔’’الہامِ منظوم‘‘ کے نام سے مثنوی مولانا روم کی چھ جلدوں کا انہوں نے ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔سیماب نے’’وحیِ منظوم‘‘ کے نام سے قرآن مجید کا مکمل ترجمہ کیا۔

سیماب اکبرآبادی کا شمار اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اصناف شاعری کے ساتھ اصناف نثر میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔علامہ سیماب نے اصناف نظم کی طرح نثر کی بھی کئی صنفوں میں طبع آزمائی کی۔تحقیق و تنقید، افسانہ، ڈرامہ اور ناول نگاری ان سب میں ان کی ایک الگ شناخت ہے۔یوں تو سیماب اکبرآبادی کی نثری خدمات کی فہرست طویل ہے تاہم ان میں ان کی دو کتابیں’’دستور الاصلاح‘‘اور’’راز عروض‘‘ کو

بلند حیثیت حاصل ہے۔ان دونوں کتابوں کا تعلق شاعری کے فن سے ہے لیکن اس میں استعمال زبان وبیان اور اپنی بات کو مدلل پیش کرنے کا انداز نثر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ ''سیماب اکبرآبادی اور ان کی ادبی خدمات'' میرے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا موضوع قرار پایا۔اس موضوع سے متعلق کچھ کام تو سامنے آئے لیکن تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر ابھی تک کام نہیں ہوا تھا۔

میں نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ''سیماب اکبرآبادی: حالات زندگی اور شخصی کوائف'' ہے۔اس میں ان کے بچپن، خاندان، ابتدائی واعلیٰ تعلیم، شخصیت، مرغوب غذائیں، ماحول، ملازمت، اولاد، شاعری کی ابتدا، داغ کی شاگردی، رسالہ شاعر، آگرہ اسکول اور آخری ایام علالت وانتقال وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''سیماب اکبرآبادی کی شاعری'' ہے۔اس کے دو ذیلی عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا ذیلی عنوان ''سیماب بحثیت غزل گو'' ہے۔ یہ عنوان سیماب کی غزلیہ شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سیماب اکبرآبادی کے دستیاب تین غزلیہ مجموعوں (کلیم عجم، سدرۃ المنتہیٰ، لوح محفوظ) کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔دوسرا ذیلی عنوان ''سیماب بحثیت نظم نگار'' ہے۔اس میں سیماب کی نظموں کے چار مجموعوں (نیستاں، کارامروز، شعر انقلاب، ساز وآہنگ) کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب ''سیماب اکبرآبادی کے منظوم تراجم'' ہے۔اس باب میں تین ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا عنوان '' وحی منظوم'' ہے۔اردو شاعری میں بحثیت مترجم سیماب کا بڑا درجہ ہے۔ سیماب نے قرآن مجید کے تیسوں پاروں کا شعری انداز میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''وحی منظوم'' رکھا۔دوسرا ذیلی عنوان ''الہام منظوم'' ہے۔قرآن پاک کے ترجمہ ''وحی منظوم'' کے بعد سیماب اکبرآبادی نے ترجمہ کے فن میں ایک اور اہم کارنامہ انجام دیا۔

مشہور مفکر اور فارسی کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معرکہ آرا تخلیق ''مثنوی معنوی'' یا ''مثنوی مولانا روم'' کا منظوم ترجمہ سیماب نے دل جمعی، محنت، توجہ اور بھرپور فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا۔فن شعر پر کامل عبور اور فارسی ادبیات وشاعری پر گہری نظر کا ہی نتیجہ تھا کہ موصوف نے کلام پاک کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مثنوی مولانا روم جیسے مشکل اور طویل شہ پارے کا ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ تیسرا ذیلی عنوان ''دیگر اصناف سخن'' ہے۔اس میں سیماب کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں رباعی، مرثیہ، عزائی شاعری وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔علاوہ ازیں سیماب کی کتاب ''نفیر غم'' اور ''سرود غم'' کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب ''سیماب اکبرآبادی اور اصلاح سخن'' ہے۔اس کے دو ذیلی عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا ذیلی عنوان ''سیماب طریقۂ اصلاح'' ہے۔اس میں سیماب اکبرآبادی کا طریقۂ اصلاح، وقت اصلاح، مرتبہ اصلاح، طرز اصلاح، اصول اصلاح (برائے اساتذہ) اصول اصلاح (برائے تلامذہ) کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسرا ذیلی عنوان ''تلامذہ کے کلام پر سیماب اکبرآبادی کی اصلاحوں کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔اس میں سیماب کے ستائس (۲۷) تلامذہ کی غزلوں پر سیماب کی اصلاحوں کا تجزیہ جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجم ''سیماب اکبرآبادی کی دیگر نثری تحریریں'' ہے۔اس میں سیماب کی نثری کتابوں ''دستورالاصلاح''، ''راز عروض''، ''خطبات شاعری''، ''مکاتیب سیماب اکبرآبادی'' اور ''سیرۃ النبوی'' کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ سیماب کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر بھی اس باب میں بحث کی گئی ہے۔

اس مقالے کے نگراں پروفیسر احمد محفوظ صاحب کا میں ممنون ہوں جن کی تربیت سے

میں نے بہت کچھ سیکھا۔مزید برآں ان کے قیمتی مشوروں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔
بی۔اے کے دوران سے ہی استادمحترم پروفیسر احمد محفوظ صاحب سے قربت رہی۔ مجھے یاد ہے
کہ مجھ جیسے نااہل طالب علم کو بی۔ اے سال آخر میں رسالہ ''تہذیب'' کا ایڈیٹر بھی مقرر
کیا۔اس دوران جس طرح سے استادمحترم نے میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی اس کا نقش
میرے دل پر گہرا ہے،اور یہ واضح ہو گیا کہ والدین کے بعد سب سے بڑا درجہ استاد کا
ہوتا ہے۔یہ میرے لیے خوش نصیبی رہی کہ جب ایم۔فل میں داخلہ ہوا تو میرے مقالے کا
عنوان''دستورالاصلاح کا تجزیاتی مطالعہ''پروفیسر احمد محفوظ کے زیرنگرانی منتخب ہوا،اور پی ایچ۔
ڈی(سیماب اکبرآبادی اوران کی ادبی خدمات) بھی ان کے ساتھ کرنے کا موقع ملا۔تعلیمی و
تحقیقی سال میں کئی پریشانیاں آئیں مگر استادمحترم کی تربیت اور رہنمائی کی بدولت ہمیشہ نئے
حوصلے وعزم کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں استادمحترم نے
ہمیشہ میری رہنمائی کی۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ انہوں نے مجھے آزادانہ طور پر تحقیق
کرنے اور تحقیق کی روشنی میں مقالے کی تکمیل میں پوری مدد کی۔پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی دوران
میں، استادمحترم اور نگراں پروفیسر احمد محفوظ صاحب نے نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت پر بھی زور
دیا۔انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات بھی بتائے تاکہ وہ تجربات مستقبل میں ہمارے لیے مفید
ثابت ہوں۔ان کی حوصلہ افزائی اور توجہ کے بغیر میرے لیے اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا
آسان نہ تھا۔

میں اپنے شعبے کے صدر پروفیسر شہزاد انجم صاحب اور دیگر تمام اساتذہ کا بے حد شکرگزار
ہوں کہ اس مقالے کے لیے موضوع کے تعین سے لے کر تکمیل تک تمام حضرات کی عنایات اور
شفقتیں میرے شامل حال رہی ہیں۔

اس مقالے کی تیاری میں جن کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا،ان میں ڈاکٹر ذاکر

حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی اور داراشکوہ لائبریری اردو اکادمی دہلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ بنیادی مآخذ کے علاوہ دیگر مواد کی فراہمی میں جناب افتخار امام صدیقی (سیماب اکبرآبادی کے پوتے اور حالیہ ایڈیٹر رسالہ شاعر)، جناب حامد اقبال صدیقی اور چاند میاں طیب (کانپور، چمن گنج) نے خاص طور پر میری بہت مدد کی ۔ میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں ۔

میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد مقیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا اور مقالے کا پروف پڑھنے کی مشکلیں برداشت کیں ۔ اس کے علاوہ میں اپنے ان دوستوں کا ممنون ہوں جن کی صحبتیں ہمیشہ میری زندگی کی معنویت میں اضافہ کرتی ہیں ۔ ہم سبق دوستوں میں رضی احمد، عبدالرحمٰن جمال الدین، عدیل احمد، معاذ احمد، محمد اکمل، ڈاکٹر ثاقب عمران، محمد اعظم اور عبداللہ اسلم وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

میرے پاس اپنے والدین کی شفقتوں، محبتوں اور عنایتوں کے شکریے کے لیے الفاظ نہیں ہیں، بس دعا گو ہوں کہ ان کا سایہ ہمیشہ مجھ پر قائم رہے ۔ آخر میں اپنی اہلیہ ثمرین فاروق کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں میری ہر طرح مدد کی ۔

مقیم احمد

باب اول

سیماب اکبرآبادی: حالات زندگی اور شخصی کوائف

خاندان

مسلم حکمرانوں کے دور میں عرب، ایران، مشرق وسطیٰ اور دیگر مسلم ممالک سے تجارتی قافلے ہندوستان آتے رہے۔ ان میں سے اکثر لوگ یہیں آباد ہوئے۔ عہد مغلیہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں سیماب اکبرآبادی کے مورث اعلیٰ شیخ چودھری نبی بخش صدیقی بھی شال دوشالے کی تجارت کے سلسلے میں بخارا سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ یہاں کی آب و ہوا اور ماحول کو موافق پاکر آگرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ شیخ صدیقی نے خود تیراکی و پہلوانی میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر بھی توجہ کی۔ حصول تعلیم کے بعد کمپوزیٹری کو بطور پیشہ اختیار کیا اور الہ آباد میں ایک مخصوص پوسٹ پر تعینات ہوگئے۔ یہ فرض انھوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔ مولانا محمد حسین صدیقی ان کے اکلوتے فرزند تھے۔

محمد حسین صدیقی کا تخلص فقیر تھا۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ 'شعرالحدیث' کے نام سے انہوں نے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا اور رسالہ 'رہنما' کے مدیر بھی رہے۔ ان کی نظمیں مجموعہ 'شہادت' میں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ گلدستۂ عطار کے چار حصے کرامات غوثیہ وغیرہ اس زمانے میں ان کی مقبول عام کتابیں تھیں۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ بڑے عالم وفاضل اور دیندار بزرگ تھے۔ احکامِ شریعت پر عمل پیرا، صوم وصلوٰۃ کے نہایت پابند اور تہجد گزار تھے۔ اس زمانے میں غلام امام شہید الہ آبادی اور حکیم امیر الدین عطار میلا دخواں تھے۔ مولوی محمد حسین حضرت عطار کے شاگرد بنے اور میلا دخوانی میں صاحب کمال ہوگئے۔ مولانا عید میلا دالنبیؐ کے مبارک موقع پر وعظ فرماتے تھے اور مولود شریف، نعت خوانی و درود خوانی کرتے تھے اور اس سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے، وہ بھی اس مبارک تقریب میں ان ہی کی طرح یہی کار خیر انجام دیتے تھے۔

آخری ایام میں مولوی محمد حسین صاحب سل کے مرض میں مبتلا ہوئے۔اسی حالت میں وہ واپس آگرہ آگئے اور مورخہ ۱۴/اپریل ۱۸۹۸ کو پچاس برس کی عمر میں اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ان کے احوال زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا بچہ ان کی شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔یہی وہ بچہ ہے جو عاشق حسین کے نام سے موسوم ہوا اور اقلیم سخنوری وادب میں سیماب اکبرآبادی کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔

ولادت

سیماب اکبرآبادی کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔سیماب خود 'کلیم عجم' کے باب (شعرالحیات) میں لکھتے ہیں:

''میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ بروز شنبہ وقت صبح
اکبرآباد (آگرہ) کے محلّہ نائی منڈی، ککوگلی، املی والے مکان
میں پیدا ہوا۔'' (۱)

لیکن علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ضیا فتح آبادی کو اس سے اختلاف ہے۔وہ اپنی کتاب 'ذکر سیماب' میں تحریر کرتے ہیں:

''سنہ ہجری کی سنہ عیسوی میں بدلنے میں کہیں غلطی ہوگئی اور کسی
نے اسے درست کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔'' (۲)

اس قضیے کا خاتمہ حامد اقبال صدیقی نے اپنی کتاب 'سیماب اکبرآبادی' (مونوگراف) میں کر دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''حضرت سیماب اکبرآبادی دوشنبہ ۲۸ رجب المرجب ۱۲۹۹
ہجری مطابق ۵ جون ۱۸۸۰ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلّہ
نائی منڈی ککوگلی، املی والے مکان میں پیدا ہوئے''۔ (۳)

والدین نے ان کا نام شیخ عاشق حسین صدیقی رکھا۔ہجری سالِ پیدائش کے تعلق سے

حامد اقبال صدیقی اپنی کتاب ''سیماب اکبرآبادی'' میں لکھتے ہیں:

ستاسی سال بعدِ میر ہے تخلیق غالب کی
یہی وقفہ ہے میری اور غالب کی ولادت میں

''میر تقی میر ۱۱۲۵ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اس کے ستاسی سال بعد غالب ۱۲۱۲ ہجری میں پیدا ہوئے اور اس کے ستاسی سال بعد یعنی ۱۲۹۹ ہجری میں سیماب پیدا ہوئے۔'' (۴)

سنہ ہجری اکثر مقامات پر ۱۲۹۹ ہجری ہی درج کیا گیا ہے اور یہی ان کا صحیح سنہ ولادت معلوم ہوتا ہے۔ سیماب نے اپنی پیدائش کا مہینہ جمادی الثانی لکھا ہے اور کوئی تاریخ نہیں بتائی۔ آگرہ میں اپنے خاندان اور گھر کے متعلق سیمابؔ خود 'کلیم عجم' کے باب (شعر الحیات) میں یوں لکھتے ہیں:

''یہ مکان اب بھی اپنی حدودِ متعارفہ کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود ہے، لیکن اس کے مکین اپنی سکونت دوسری دنیا میں منتقل کر چکے ہیں اور نئے مالکانِ مکان نے وہ املی کا درخت بھی کاٹ دیا ہے جو برسات کے موسم میں ہمیشہ محلے بھر کی خواتین کے جھولے سے جھوما کرتا تھا اور جس کے قرمزی پھولوں کا ترش و شیریں ذائقہ اب تک میرے کام و دہن میں محفوظ ہے۔ آہ، وہ آباد گھر، مقدس نفوس معمور خاندان! دادا صاحب، ان کے بھائی، ان کی بہن، دادی صاحبہ، والد صاحب، والدہ ماجدہ، میرے دو بھائی، دو بہنیں، چھوٹے دادا صاحب کا فرزند، کیسی زندگی افروز دنیا تھی! جسے انقلاب نے نقشِ موہوم بنا دیا۔ وہ چہل پہل، وہ میٹھے کنوؤں کا پانی، کڑوے تیل کا چراغ، وہ پنساریوں کا کاغذی ہلکے ظروف (ٹھانٹوں) میں آٹا پیس کر لانا۔ وہ شہنشاہِ اکبر کے نام

سے مسکوک سکّے، ایک ڈبل (پیسے) میں دو۔ وہ زندگی کی
ارزانی، وہ فراغ وآسودگی اور شگفتہ سامانی! اب وہ زمانہ خواب
وخیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ حقیقتیں فسانہ ہوگئیں اور وہ زمانے بدل
گئے ۔ اب صرف ایک بھائی (صادق حسین) اور ایک بہن
باقیات الصالحات سے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے''۔ (۵)

جیسا کہ سیماب نے اپنی پیدائش کا مہینہ جمادی الثانی بتایا ہے لیکن تاریخ نہیں لکھی، جبکہ انہی کے ایک شاگرد قاسم علی خاں قادری نے ''حیات سیماب'' میں ان کی پیدائش کا مہینہ رجب لکھا ہے۔ شاعر کے (کارامروز نمبر) جولائی ۱۹۳۵ صفحہ ۹ میں سیماب اکبرآبادی کی پیدائش کا مہینہ رجب المرجب تحریر ہے۔ تقویم کے مطابق یہی دن، تاریخ، مہینہ اور سنہ صحیح ہے۔ یعنی علامہ سیماب اکبرآبادی کی پیدائش ۲۸ رجب المرجب ۱۲۹۹ ھ، مطابق ۵ جون ۱۸۸۰ کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم

سیماب کے والدین نے ان کا نام شیخ عاشق حسین صدیقی رکھا تھا۔ ان کے بچپن کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ سیماب اکبرآبادی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز مروجہ رسم ورواج کے مطابق عربی اور فارسی سے ہوا۔ عربی ادب، اصول اور منطق کے ساتھ ساتھ فارسی میں سکندر نامہ، مینا بازار ،مثنوی غنیمت ،رقعات مرزا قتیل ،سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں انھوں نے مولانا جمال الدین سرحدی ،مولانا رشید احمد گنگوہی ،مولانا قمر الدین اور مولانا عبدالغفور سے پڑھیں۔ قرآن و حدیث کا درس انھوں نے اپنے والد محترم اور دیگر علمائے کرام سے لیا۔ کم عمری میں ہی انھوں نے علم عروض میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ان کا معمول تھا اور شعر وسخن سے ان کو بے حد دلچسپی تھی۔

چونکہ علامہ سیماب اکبرآبادی کے والد خود تعلیم یافتہ تھے اس لیے وہ اپنے بیٹے کو بھی بہتر

سے بہتر تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں انگریزی اسکول میں داخل کردیا گیا جو گورمنٹ کالج اجمیر سے تعلق اورالحاق کی وجہ سے برانچ اسکول کہلاتا تھا۔

اعلیٰ تعلیم

سیماب اکبرآبادی بچپن سے ہی غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے۔ چنانچہ انھوں نے برانچ اسکول کے مدارج طے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے گورمنٹ کالج میں داخلہ لیا، جہاں انھیں مولوی سدیدالدین قریشی اکبرآبادی ، مولوی تحسین علی اجمیری اور مولوی عابد حسین جیسے عالم وفاضل استاد ملے۔ ان مشفق اساتذۂ اکرام کی خصوصی توجہ نے سیماب کے شعری ذوق کو مزید صیقل کردیا جوان کو خدا کی طرف سے ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فارسی کی نصابی کتابوں میں انہیں جتنے اشعار ملتے وہ ان کا اردو میں منظوم ترجمہ کرکے اپنے اساتذہ کی خدمت میں پیش کردیتے۔ مشفق اور خلوص ومحبت کے پیکر اساتذۂ اکرام نہ صرف سیماب کی دلچسپی ، ذوق شعری اور محنت کی تعریف کرتے بلکہ اصلاح کرکے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ اساتذہ کی رہنمائی اور شفقت نے ایک فطری شاعر کو زمانۂ طالب علمی میں ہی وہ راہ فراہم کی جو آگے چل کر شاہراہ میں تبدیل ہوئی۔

غرضیکہ علامہ سیماب اکبرآبادی کی تعلیم اور مشق سخن کا سلسلہ جاری رہا لیکن ان کے والد محترم ابتدا میں ان کی شعر گوئی کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۸۸۶ میں سیماب کے والد مولانا محمد حسین صدیقی خرابی صحت کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوش ہوکر آگرہ چلے آئے۔ یہاں ۱۶/اپریل ۱۸۹۷ کو ۵۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ سیماب اس وقت ایف۔اے کے آخری سال میں تھے۔ چونکہ وہ اپنے والدین کے سب سے بڑے فرزند تھے اس لیے والد کے انتقال کے بعد والدہ، دو بھائیوں اور بہنوں کی پرورش وپرداخت کا بوجھ ان کے کندھوں پر آپڑا، جس کی وجہ

سے ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ وہ ایف۔اے کا امتحان بھی نہ دے سکے۔

دریں اثنا سیماب اکبرآبادی نے اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اور ساتھ ہی انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اس کے ادب عالیہ اور زبان کی باریکیوں پر بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح کئی زبانوں پر عبور نے ان کے ذہن و فکر کو نئی سمتیں اور وسعتیں عطا کر دیں۔

ملازمت

والد کے انتقال کے بعد ماں، بھائیوں اور بہنوں کی کفالت اور گھریلو اخراجات کی پوری ذمہ داری سیماب کے کندھوں پر آ پڑی۔ چنانچہ سیماب آگرہ میں سیٹھ چھوٹانی کی ٹال پر چند روز ملازمت کرنے کے بعد کانپور میں شیخ عبدالرزاق کمیشن ایجنٹ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ وہاں ایک برس کام کرنے کے بعد وہ واپس آگرہ آ گئے اور ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے وقت ان کی عمر سولہ سال کی رہی ہو گی مگر خود ان کا کہنا تھا کہ میری شادی بیس برس کی عمر میں ہوئی اور بیس برس کی عمر یعنی ۱۹۰۰ میں شادی کا ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اس وقت ان کو کانپور میں ہی ایک دوسری ملازمت مل گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری بار کانپور جانے سے قبل ہی آگرہ میں ان کی شادی ہوئی تھی۔

بغرض ملازمت سیماب کا قیام کانپور میں کب تک رہا، اس کا حتمی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کے بڑے صاحب زادے شمشاد حسین منظر صدیقی کانپور ہی میں ۱۹۰۹ میں پیدا ہوئے اور منشی امیر الدین نظر اکبرآبادی کی گود میں کھیلا کودا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظر کی وفات بھی اسی سال ہوئی اور غالباً نظر کی وفات کے بعد ہی سیماب کانپور چھوڑ کر آگرہ پہنچ گئے اور کچھ دن بعد ریلوے آڈٹ (Audit) آفس کی ملازمت کے سلسلے میں اجمیر چلے گئے، جہاں ان کا قیام کم و بیش پانچ برس تک رہا۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ میں وہ ٹنڈلہ گئے، جہاں ڈی۔ٹی۔ایس (DTS) آفس میں ایک کلرک

کی حیثیت سے تعینات ہو گئے۔۱۹۲۲میں ریلوے Reliving ٹکٹ کلکٹر مقرر کئے گئے مگر نائٹ ڈیوٹی ملنے کے سبب انھیں اس کام میں بھی دشواری ہوئی اور ۱۹۲۳ میں ہمیشہ کے لیے انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ بقول سیماب:

"فطرت نے مجھے اس لیے نہیں پیدا کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کردوں بلکہ میری تخلیق خدمت ادب کے لیے ہوئی ہے۔" (۲)

ملازمت سے مستعفی ہو کر سیماب اکبر آبادی ۱۹۲۳ میں مستقلاً آگرہ میں قیام پذیر ہو گئے اور اپنی تمام صلاحتیں بیشتر علمی اور ادبی تخلیقات اور خدمت ادب اردو کے لیے وقف کر دی۔ اب تصنیف و تالیف ہی ان کا پیشہ تھا اور مشاعروں میں شرکت، شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور رسائل و جرائد کی ترتیب ان کی زندگی کا مقصد اور ذریعۂ معاش تھا۔

اولاد

سیماب اکبر آبادی کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام شمشاد حسین صدیقی اور منظر تخلص تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۹ میں کانپور میں ہوئی تھی اور وفات ۱۲را کتوبر ۱۹۷۱میں کراچی میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد محترم کے معاون کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کیا۔ چونکہ شعر گوئی انہیں وراثت میں ملی تھی اس لیے بہت سی نظمیں کہیں اور نثر میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے عروض پر بھی ایک مختصر کتاب لکھی اور رسالہ "شاعر" کے ابتدائی دو تین برسوں تک مدیر بھی رہے۔ ۱۹۳۵میں "کنول" نام کا آگرہ سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جو زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کے دوسرے فرزند کا نام اعجاز حسین صدیقی تھا اور تخلص اعجاز تھا۔ وہ ۱۹۱۲میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۹ فروری ۱۹۷۸ میں ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ اعجاز حسین

صدیقی جو صحیح معنوں میں سیماب کے جانشین ثابت ہوئے، ان کو اردو ،فارسی ،عربی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔غزل،نظم،تحقیق،تنقید اور اصلاح سخن میں مہارت حاصل تھی۔ مذہب کی پابندی اور روایات کی پاسداری میں گویا وہ سیماب کے سچے پیرو اور خلیفہ ثابت ہوئے۔اعجاز حسین صدیقی ۱۹۳۵ سے رسالہ ''شاعر'' کے تاحیات مدیر رہے اور کمزور معاشی حالت کے باوجود ماہنامے کو جاری رکھا جو ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ان کی نظموں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے۔''خوابوں کا مسیحا'' اعجاز حسین صدیقی کی طویل نظم ہے جو اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں یکجا ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئی اور ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''کرب خود کلامی'' ان کی وفات کے بعد فروری ۱۹۷۹ میں شائع ہوا۔تقسیم ہند کے بعد اعجاز حسین صدیقی کا پورا خاندان پاکستان چلا گیا تھا لیکن یہ خود ہندوستان میں ہی رہے اور آگرے سے بمبئی منتقل ہو گئے۔''مہاراشٹر اردو اکادمی'' کے قیام کی تحریک ان کا ایک اہم اور تاریخی کارنامہ ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے تیسرے بیٹے سجاد حسین صدیقی تھے جو ۱۹۱۷ میں پیدا ہوئے۔سجاد حسین صدیقی پر والد اور دو بڑے بھائیوں کا کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔ان کا تخلیقی ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا،لیکن ایک اچھے آرٹسٹ ضرور تھے اور کراچی میں علامہ سیماب کا قائم کردہ ''پرچم پرنٹنگ پریس'' چلاتے تھے، وہیں ۱۹۶۷ میں ان کا انتقال ہوا۔

سیماب کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام مظہر حسین صدیقی تھا۔ان کی تاریخ پیدائش اور سال وفات معلوم نہیں ہے۔مظہر حسین صدیقی نے پاکستان میں ''سیماب اکادمی'' قائم کی اور سیماب کی کئی کتابیں شائع کیں۔کراچی میں سیماب کے زیر سرپرستی ہفت روزہ ''پرچم'' جاری کیا لیکن یہ جریدہ دو برس سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

علامہ سیماب کی بڑی بیٹی کا نام حسینہ خاتون تھا۔ان کی وفات ۱۹۱۹ میں ہوئی ،جب کہ

دوسری بیٹی جمیلہ خاتون ۱۹۰۶ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی امیر الدین حیدر جو بی بی اینڈ سی آئی ریلوے میں گارڈ کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے ان سے کر دی گئی تھی۔ جمیلہ خاتون کی وفات ۹/اگست ۱۹۳۷ کو ہوئی۔

سیماب اکبر آبادی کے خاندان میں اعجاز حسین صدیقی جو سیماب کے دوسرے بیٹے ہیں، انہوں نے باپ کی ادبی وراثت کو سنبھال کر رکھا اور آج بھی اعجاز حسین کے تیسرے بیٹے افتخار امام صدیقی جو نہ صرف ماہنامہ رسالہ ''شاعر'' کے مدیر ہیں بلکہ اپنی ادبی صلاحیتوں کے سبب اردو زبان وادب میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اعجاز حسین صدیقی کے بڑے بیٹے تاجدار احتشام صدیقی اچھے افسانہ نگار اور طنز ومزاح نگار تھے۔ اعجاز حسین صدیقی کی وفات کے بعد تاجدار احتشام حسین صدیقی ہی رسالہ ''شاعر'' کے مدیر اعلیٰ ہوئے۔ ان کا انتقال ۴/فروری ۱۹۸۱ کو سعودی عرب میں ہوا۔ اعجاز حسین صدیقی کے دوسرے بیٹے ناظر نعمان صدیقی رسالہ ''شاعر'' اور مکتبہ ''قصر الادب'' کے انتظامی امور سے وابستہ رہے۔ اعجاز حسین صدیقی کے تیسرے فرزند افتخار امام صدیقی جو جانشین سیماب ہیں، ادبی حلقوں میں محترم سمجھے جاتے ہیں اور خاص کر رسالہ ''شاعر'' کے مدیر اور ناگفتہ بہ حالات کے باوجود اس رسالہ کو جاری رکھنے کے لیے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

شخصیت

علامہ سیماب اپنے معاصر اساتذہ کی طرح تلامذہ اور ادبی دنیا میں ابوالفخر، علامہ، مولانا، شیخ، سیماب، صدیقی الوارثی، افصح الملک جیسے خطابات سے جانے جاتے تھے۔ افصح الملک کا خطاب غالباً ریاست ٹونک کے والی نے دیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے ایسے خطابات یا ایسے القاب اپنے لیے کبھی پسند نہیں کیے۔ وضع قطع عقائد واطوار اور معمولات کے ذیل میں علامہ کے فرزند مرحوم اعجاز صدیقی کے بیان پر مشتمل ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

یہ مضمون ماہنامہ شاعر (ممبئی) کے شمارہ ۴، ۵۔ ۱۹۷۶ میں شامل ہے:

''... گورا چٹا رنگ، بھرا ہوا جسم، میانہ قد، نہایت پرکشش غلافی آنکھیں، چوڑی پیشانی، چال میں وقار، گفتگو میں ٹھہراؤ، عالمانہ لہجہ، نہایت مشفق، خدا ترس اور رقیق القلب، کم سخن، چہرہ رعب دار، بے حد خوش عقیدہ، اپنے مذہب میں راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود دوسرے مذاہب کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ جہاں یوم النبیؐ اور یومِ حسینؑ شاندار پیمانے پر مناتے تھے وہیں ہولی، دیوالی اور بسنت کے پروگراموں میں بھی نہایت خوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ جہاں انھوں نے رسولِ اکرمؐ پر متعدد نظمیں اور نعتیں لکھیں وہیں شری کرشن جی، مہاتما بدھ اور گرونانک پر بھی نظمیں لکھیں۔ وہ گہرا سیاسی شعور رکھتے تھے مگر عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا... ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ تقریر کرنے کے عادی نہ تھے مگر تحریر کا یہ عالم تھا کہ نظم ہو یا نثر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بول رہا ہے اور وہ لکھ رہے ہیں''۔ (۷)

میں یہاں افتخار امام صدیقی (سیماب اکبرآبادی کے پوتے اور حالیہ رسالہ 'شاعر' کے ایڈیٹر) سے لیے گئے انٹرویو سے نقل کررہا ہوں۔ واضح رہے کہ میں اپنی ریسرچ کے دوران کئی مرتبہ ممبئی گیا اور افتخار امام صدیقی کا ایک مفصل انٹرویو ریکارڈ کیا:

''... علامہ ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔ زیادہ غصہ نہیں آتا تھا... صبح سردیوں میں دودھ میں شہد ڈال کر پیتے تھے اور دو بسکٹ کھاتے تھے۔ اس کے بعد ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ جب دفتر چلے جاتے تو نوکر کھانے کا ڈبہ لے جاتا تھا۔ وہاں اعجاز

صاحب، سجاد صاحب بھی رہتے تھے اور سیماب صاحب بھی۔ تینوں کا کھانا نوکر لے جاتا تھا۔ علامہ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ اگر دو آدمی آجاتے تو ان کو بھی بٹھا دیتے۔ سیماؔب صاحب کا کیا تھا کہ وہ گھر میں بات بہت کم کرتے تھے۔ پردہ اٹھایا، سمجھ لو کہ وہ کھانے کی بات کر رہے ہیں یعنی صبح میں ان کو چھ بجے چائے چاہیے۔ چائے دانی میں چائے کا پانی، دودھ دانی میں دودھ، کپ، ساسرس، چمچے یہ سب الگ ان کو ٹرے' میں چاہیے تھا۔ کھانا تو دفتر میں جاتا تھا۔ شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتے، رات میں لنگی پہنتے تھے۔ دن میں پائجامہ، قمیض اور شیروانی...اچھا کھانا پسند کرتے تھے''۔ (۸)

وہ مزید کہتے ہیں:

''ان کا کمرہ الگ تھا۔ اس کمرے کے دو دروازے تھے۔ ایک باہر کا اور ایک گھر میں اندر کھلتا تھا۔ ان کے پاس لوگ باہر سے ہی آتے جاتے تھے... بس پردہ کھول کر اتنا کہتے تھے۔ دو چائے، تین چائے...ان کی شخصیت میں کیا بیان کروں بیٹا۔ اتنے خوبصورت تھے... علامہ کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات تو بہت ہیں، پرانی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو رونا بہت آتا ہے۔ علامہ سیماؔب حقّہ پیتے تھے۔ پان وسگریٹ دونوں کے عادی تھے لیکن شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر بھی حاضری دیتے تھے۔ لیکن ان مقامات پر ہونے والی خرافات کے خلاف تھے۔ یوں تو سبھی بچوں سے پیار کرتے تھے لیکن تمام پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں میں سے افتخار امام (مدیرِ شاعر و فرزند اعجاز صدیقی) سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اکثر سفر میں

اپنے پوتے کا چھوٹا سا تکیہ ساتھ لے کر چلتے۔علامہ سیماب
بوٹا قد تھے۔کرتا اور چوڑی موری کا پائجامہ پہنتے تھے۔جسم پر
شیروانی،سر پر ترکی ٹوپی پھندنے والی ہوتی تھی۔فربہ جسم واقع
ہوئے تھے''۔ (۹)

سیماب اکبرآبادی کی بڑی بیٹی جمیلہ خاتون کی تین بچیاں طاہر جمال، بدر کمال اور سلطانہ جمال یہ تینوں علامہ کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور ان کو بہت عزیز تھیں بلکہ اپنی بیٹھک سے اپنی چہیتی نواسیوں کو ہی آواز دیا کرتے تھے۔کوئی مہمان آنے والا ہو یا کوئی اور ضرورت ہوتو آواز لگاتے تھے۔طاہر جمال! بدر کمال! جب بچیاں آتیں تو اپنی فرمائش انھیں بتاتے کہ اپنی نانی سے کہنا کہ آج نانا کے پاس کچھ لوگ آرہے ہیں۔زائد کھانا چاہیے۔ویسے بھی علامہ کے ساتھ دسترخوان پر ایک سے زیادہ آدمی موجود ہوتے تھے۔خوش ذائقہ تھے اور یہی صفت علامہ کے بیٹوں، ان کی بہوؤں میں بھی موجود تھی۔ چونکہ آگرہ میں رہتے تھے اور یوپی طرز کے کھانے بالخصوص مغلائی ڈشز جن میں ڈھیروں روغن ہونا ضروری تھا۔اسی روایت کو میں نے اعجاز صدیقی کے گھرانے میں پایا۔میں پانچ بار اپنی ریسرچ کے سلسلے میں ضروری مآخذ کی فراہمی اور دیگر ضروری کتب ورسائل کو دیکھنے کے لیے بمبئی گیا تو میں نے اپنی ضیافت میں وہی لذیذ کھانے پائے جن کے بارے میں سنتا آیا تھا۔

'وحی منظوم' کی طبع اول کی ابتدا میں مظہر حسین صدیقی (فرزند سیماب) نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔اس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

''میرے ابا جی انتہائی بااصول آدمی تھے...ابا جی قلم کو اپنے ہاتھ
میں ایک امانت تصور کرتے تھے۔اپنے علم و اعتماد کو اللہ جل شانہ
کا عطیہ اور کرم خاص کہا کرتے تھے... وہ ہمیشہ الصلوٰۃ خیر من
النوم کی صدا سے قبل بیدا ہو جاتے، فجر کی نماز ادا کرتے پھر

قریب ہی کے ایک سبزہ زار میں چہل قدمی کے لیے چلے جاتے ، باغ سے واپس آ کر ضروریات سے فارغ ہوتے ، ناشتہ کرتے پھر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے ، ان معمولات سے فارغ ہو کر خاندانی مسائل یا گھریلو امور میں دلچسپی لیتے ، صلاح مشورے میں حصہ لیتے ۔ پوتیوں اور پوتوں سے حد درجہ محبت کرتے تھے ۔ سب کی فرمائش سنتے ، پیسے دیتے اور پھر 'قصر الادب' جو مکان سے زیادہ دور نہ تھا، تشریف لے جاتے ، گزشتہ روز کے موصولہ وہ خطوط ان کے مخصوص کمرے میں رکھ دیے جاتے تھے جن میں ان کے تلامذہ کا کلام اصلاح کی غرض سے ہوتا تھا۔ ایک بجے تک اباجی موصولہ کلام پر اصلاح مع توجہی فرماتے تھے پھر قصر الادب ہی میں کھانا کھاتے ، نماز ظہر ادا کر کے تھوڑی دیر آرام کرتے اور پھر کچھ دیر تک رسائل و اخبارات وغیرہ دیکھتے رہتے اس کے بعد شام تک تصنیف و تالیف اور تخلیقی کاموں میں مصروف رہتے ۔ چائے بہت کم پیتے تھے البتہ حقّہ یا سگریٹ کے کش جاری رہتے ۔ مغرب سے ذرا پہلے گھر آ جاتے اور مغرب کی نماز کے فوراً بعد گھر کے تمام افراد کے ساتھ رات کا کھانا کھا لیتے ، کھانے کے بعد تھوڑی دیر بچوں کے ساتھ ہنستے بولتے اور گئی رات تک پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ حقّے کے کشوں کے ساتھ جاری رہتا۔ مقامی مشاعروں میں اباجی بہت کم شریک ہوتے تھے۔ البتہ ہر ماہ آٹھ دس روز و شب بیرونی مشاعروں کی شرکت اور صدارت کی نذر ہو جاتے تھے۔ آگرہ سے چند روز کی غیر حاضری میں ایسے خطوط کا انبار لگ جاتا جن کا تعلق براہ راست اباجی سے ہوتا

تھا۔سفر سے واپسی کے بعد سب سے پہلے ان خطوط کے جواب
لکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔مقامی تلامذہ کے کلام پر اصلاح
دینے کے لیے بھی وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا کرتے تھے۔
دیکھنے والے تعجب کرتے تھے کہ سیمابؔ صاحب بواسیر کے
تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود سترہ اٹھارہ گھنٹے کس
طرح دماغی محنت کر لیتے ہیں''۔ (۱۰)

'ذکر سیماب' میں ضیا فتح آبادی نے سیماب کے ایک شاگرد نثار اٹاوی کا ایک اقتباس نقل
ہے جو 'نقوش' لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا تھا:

''مولانا اس وقت باوجود عمر کی پچپن منزلیں طے کرنے کے کافی
تنومند تھے۔قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی اسے درازی عطا
کر دیتی تھی۔سر کے بال سفید ہو چکے تھے اور انگریزی وضع پر
ترشے رہتے تھے۔مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمک دار
تھیں۔ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔مونچھوں کے بال بہت کم
اُگتے تھے، داڑھی صفا چٹ رہتی تھی۔آخر عمر میں ننھا سا خم
ہو گیا تھا مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل
سکتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی پُر تکلف لباس میں نہیں دیکھا۔
'کلیم عجم' میں ایام شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی
زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے مگر شاید جوانی کے ساتھ یہ
شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انھیں ہمیشہ شیروانی اور
چوڑے پائچے کے پاجامے میں ملبوس دیکھا۔گھر پر قمیض اور تہہ
بند یا پاجامے کے عادی تھے اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف
بنیان اور تہہ بند پر اکتفا کرتے تھے۔مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے

مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے۔ انھیں ترکی ٹوپی
بہت عزیز تھی۔ کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال
کرتے تھے۔ یہ سیہی کے کانٹوں جیسی گھنی بھورے بالوں والی
ٹوپی اُن کے رعب دار چہرے اور بھی باوقار بنا دیتی تھی''۔ (۱۱)

سید عزیز حسین بقائی (مدیر 'پیشوا') نے سیماب کی شخصیت پر ماہنامہ 'پرچم' کراچی کے تعزیت نمبر میں لکھا ہے:

'مجھے معلوم تھا کہ مولانا بغیر معاوضے کے نہیں لکھا کرتے۔ کیوں
کہ اس ناقدری کے دور میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا،
لیکن میں نے کبھی معاوضہ دیا ہی نہیں۔ اوّل تو میں مولانا کے
جواہر پاروں کا معاوضہ دے ہی نہیں سکتا تھا اور دوسرے مجھے
مولانا نے کبھی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا، کیوں کہ حضرت علامہ
میری مالی مشکلات سے بخوبی آگاہ تھے۔' (۱۲)

محشر بدایونی 'پرچم' کراچی کے تعزیت نمبر میں یوں رقمطراز ہیں:

''...جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ایک مشاعرہ تھا وہاں میں نے
اپنی ایک نظم 'تاج محل' پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ تمام حاضرینِ
بزم مجھے دل کھول کر داد دے رہے ہیں۔ مگر سیمابؔ صاحب
خاموش ہیں اور وجد کی کیفیت میں ہل رہے ہیں۔ ان کا وہ ہلنا
میرے لیے اس قدر ہمت افزا تھا کہ سامعین کی داد کا مجھ پر اتنا
اثر نہ تھا جتنا مولانا سیماب کی اس خاموش داد سے میں متاثر ہوا
تھا''۔ (۱۳)

'ذکرِ سیماب' میں ضیا فتح آبادی سیماب کی داد کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''سیماب کے تعلق سے ایک عام خیال کہ وہ سرِ مشاعرہ شعر کی داد

دینے میں بخیل تھے بحد کافی درست ہے۔انھوں نے ایک گفتگو
میں راقم السطور سے کہا تھا کہ اچھے شعر سننے میں کم کم آتے ہیں۔
تاہم سرِ مشاعرہ داد نہ دینے کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ مشاعروں کو
نہ داد گاہیں سمجھتے تھے، نہ بننا چاہتے تھے...دراصل اسے سیماب
کی فطری سنجیدگی کا کارنامہ کہنا چاہیے''۔ (۱۴)

متذکرہ رسالے میں مولانا ماہرالقادری مرحوم کی تحریر موجود ہے جو ان کے رسالے 'فاران' (اپریل ۱۹۵۱) میں شائع ہوئی۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''...ایک بار میں حضرت سیماب کے دولت کدہ پر ایک دن کے لیے
ٹھہرا تھا بڑی تواضع سے پیش آئے۔صبح کے وقت ان کا معمول تھا کہ
نماز پڑھ کر شہد اور انڈے کا ناشتہ کرتے اور تھوڑی دیر ٹہلنے کے لیے
نکل جاتے۔ پھر میں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ
'قصرالادب' میں تکیہ کے سہارے تخت پر جھکے ہوئے بیٹھے ہیں۔
شاگردوں کی غزلیں اور نظمیں پھیلی ہوئی ہیں اور اصلاح دیتے چلے
جاتے ہیں...اردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ادارۂ
تصنیف واصلاح قائم کیا جہاں اُجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں،
غزلیں اور سہرے لکھے جاتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک اشتہار
میں 'دیوان' کی اُجرت پانچ سو روپے تھی۔ حضرت سیماب کی
شاعرانہ قوتیں دوسروں پر کافی صرف ہوئیں۔کاش وہ تمام ان ہی
کے کام آتیں۔پُر گوئی اور زور گوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر
شعر لکھتے جاتے تھے۔وہ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیا کرتے
تھے۔ان کا دماغ کثرتِ شعر گوئی کے سبب شعر سازی کی سچ مچ ایک
مشین بن گیا تھا''۔ (۱۵)

درج بالا اقتباسات علامہ سیماب کی شخصیت کا ایک طرح سے قلمی کولاج ہے، بقول سیماب:

بھرے گی ان کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں

مرغوب غذائیں

سیماب اکبرآبادی بکری کا گوشت، کم شوربے کا قورمہ اور چپاتی پسند کرتے تھے۔ دن کے وقت دو طرح کی غذائیں، رات میں چنے کی دال کی قبولی کھچڑی پر شوربہ ڈال کر کھاتے تھے۔ میٹھا بھی بہت پسند تھا۔ گرمیوں میں دہی اور چھاچھ کا استعمال کرتے تھے۔ سردیوں میں صبح دودھ میں شہد ڈال کر پیتے تھے اور دو بسکٹ کھاتے تھے۔ اس کے بعد ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ پسندیدہ دالوں میں چنا، ارہر، مونگ وغیرہ شامل تھیں۔ دوپہر کے کھانے میں چند ایک مہمان ضرور ساتھ ہوتے تھے۔ پہلے سے اس کی کوئی اطلاع نہیں دیتے تھے کیونکہ ان دنوں ٹیلی فون کی سہولت ہندوستان میں نہیں تھی۔ جس دن کوئی ساتھ نہ ہوتا تو کہتے 'آج کھانے میں مزہ نہیں آ رہا ہے کیونکہ دسترخوان پر میرے ساتھ اور کوئی شامل نہیں'۔

ماحول

سیماب نے پیدائش کے وقت اپنے آس پاس ایسا ماحول پایا جس میں چاروں طرف آسودگی وخوش حالی تھی۔ نیک خاندان اور شفیق دادا اور دادی کو سایہ فگن پایا۔ ان کی ابتدائی زندگی پرسکون رہی لیکن بعد میں وقت نے ایسا انقلاب لایا جس سے یہ ساری خوشحالی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ عیش وعشرت کا دور ختم ہو گیا اور مسرتوں کی حقیقت فسانۂ غم وآلام میں بدل گئی۔ سیماب صرف سترہ برس کے تھے کہ والد بزرگوار کا سایۂ عاطفت ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس

کمسنی میں ہی شفقت پدری سے محروم ہونا ایک بڑا المیہ ہے۔مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی حوصلہ مندی سے ان تمام مشکلات کا سامنا کیا۔گھر کا سب سے بڑا فرزند ہونے کے ناطے انھیں اپنی ذمہ داریوں کا شدت سے احساس تھا۔یہ عظیم بوجھ ان کے سر پر آ پڑا تھا مگر انھوں نے ان مصائب کا سامنا کیا اور سب امور بحسن وخوبی انجام دیے۔

سیماب کے دو بھائی حاجی عبدالکریم اور صادق حسین پریس کمپوزیٹر تھے۔ایک گورنمنٹ پریس لشکر (گوالیار) اور دوسرا گورنمنٹ پریس (شملہ) میں۔علامہ کی دو بہنیں بھی تھیں جن کا نام بسم اللہ خاتون اور حفیظہ خاتون تھا۔

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

سیماب ایک جلیل القدر اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ان کی جائے پیدائش وہی اکبرآباد یعنی آگرہ ہے جس کی خاک سے نظیر، میر اور غالب جیسے شعرا پیدا ہوئے، جن کی شاعری نے اردو سخنوری میں نئی جان ڈال دی۔میر کو 'خدائے سخن' اور نظیر کو 'اردو کا شیکسپیئر' مانا گیا۔

آگرہ میں سیماب اکبرآبادی کا گھر بڑا تھا۔ان کا کمرہ الگ تھا، جس کے دو دروازے تھے، ایک باہر کا اور ایک گھر میں اندر کھلتا تھا۔ان کے پاس باہر سے جو لوگ آتے ان کے لیے ایک نوکر رہتا تھا۔بیٹھک میں خس کی چھتری لٹکا کے اس پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔اس کے علاوہ ان کے لیے ایک ٹانگا مخصوص تھا جس میں بیٹھ کر وہ دفتر جاتے یا مشاعرے میں جاتے۔خواتین کے لیے بھی ایک رکشا مخصوص تھا، جس پر چاروں طرف چادریں لگائی جاتی تھیں۔

سیماب گھر میں زیادہ بولتے نہیں تھے۔ان کے آجانے سے ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔نواسیاں (طاہر جمال، بدر جمال) اپنے نانا کی آمد پر کان رکھتی تھیں اور دوڑ دوڑ کر کام کرتی تھیں۔سیماب کی بڑی لڑکی کی شادی ہوگئی تھی۔ان سے تین لڑکیاں تھیں۔طاہر جمال، بدر جمال، سلطانہ۔ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔تینوں نواسیاں اپنے نانا نانی کے پاس آگرہ آ بسی تھیں اور تینوں ان کی چہیتی بن گئی تھیں، سب سے زیادہ طاہر جمال۔علامہ سیماب

نے اپنے تین لڑکوں کی شادی کردی تھی اور تمام بہوؤں اور نواسیوں کے درمیان ایک رابطہ بن گئے تھے۔ بیٹھک میں سے طاہر جمال کے ذریعے پورے گھر پر حکومت کرتے تھے۔ اب ان تینوں (طاہر جمال، بدر کمال، سلطانہ) کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے شوہر بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ سیماب سبھی بچوں کو اپنی تربیت خاص میں رکھتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کا ماحول مذہبی شائستگی سے سجا رہتا تھا۔ عموماً چاروں بیٹے اپنی والدہ سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے۔

سیماب کو سب سے زیادہ منجھلے بیٹے اعجاز حسین پر اعتماد تھا۔ ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ 'شاعر' کے دفتر میں جو ڈاک آتی وہ پہلے علامہ پڑھتے تھے۔ خطوط اور کتب ورسائل پر خاص نشانات اور ہدایات سرخ روشنائی سے لکھ کر اعجاز صاحب کی میز پر بھجوا دیتے تھے لیکن کوئی اشارہ نہیں دیتے تھے۔ دوپہر کے کھانے پر البتہ دریافت کر لیتے تھے۔

گھر میں نظم وضبط کا یہ عالم تھا کہ منظر صدیقی ہوں یا مظہر صدیقی سر پر ٹوپی لازمی تھی۔ ایک بار علامہ نے اپنے بڑے صاحبزادے کو آواز دی۔ اس وقت منظر صاحب اپنے دالان میں سگریٹ پی رہے تھے۔ ایک آواز پر، بیٹھک میں داخل ہو جانا ضروری تھا۔ منظر صاحب بنا ٹوپی کے سگریٹ پیتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ سیماب نے ان کو دیکھا اور چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے۔ فوراً بولے! مجھے منظر سے بات کرنی ہے، آپ سے نہیں۔ منظر صاحب سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ چنانچہ الٹے پیروں واپس آ گئے۔ منہ صاف کیا، سر پر ٹوپی رکھی اور بیٹھک میں داخل ہو کر سلام کی (سیماب کو گھر کے افراد اباجی کہتے تھے) منظر صدیقی بولے! جی اباجی آپ نے یاد کیا۔ سیمابؔ بولے! تم کہاں تھے؟ اتنی دیر کیوں لگائی؟ منظر نے کہا میں اپنی ٹوپی بوا کے قدموں میں رکھ کر بھول گیا تھا۔ سیمابؔ کی بیوی سکینہ بی کو سب لوگ بوا کہتے ہیں۔ بہت نیک، متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔

شاعری کی ابتدا

ایک تو سیماب اکبرآبادی کو شاعری ورثے میں ملی تھی، اور کچھ فطرت نے بھی بطور خاص ذوق شعری سے نوازا تھا۔ چنانچہ کم عمری ہی میں سیماب نے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں ہی سیماب کی غیر معمولی فطری موزونیت نے اپنے پر نکال لیے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شامل درس ہوتے وہ ان سب کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اپنے اساتذہ کو پیش کر دیتے اور مشفق اساتذہ خلوص کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس لیے زمانہ طالب علمی میں ہی شعر گوئی کو راہ ملی اور علامہ سیماب آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں انہوں ''کلیم عجم'' میں ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے۔

> ''مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے میں ایک روز بوستان کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔
>
> جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور
> پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور
>
> لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض اب یہ میری عادت جاریہ تھی کہ میں ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی، خاقانی وغیرہ کے اشعار قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب جز و نصاب تھا) ہمیشہ بصورت نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے''۔ (۱٦)

غرض سیماب اکبرآبادی کی تعلیم اور مشق سخن کا سلسلہ ایک ساتھ جاری رہا۔ حالانکہ ان کے والد ابتدا میں ان کی شاعری کے سخت خلاف تھے لیکن قدرت نے ایک شاعر کی حیثیت سے سیماب کو منتخب کرلیا تھا۔ اب وہ اپنے والد سے چھپ چھپا کر مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ جب کہیں مشاعرہ ہوتا تو وہ دعا کرتے تھے کہ خدا کرے ان کے والد کہیں وعظ کہنے چلے جائیں اور انہیں مشاعرے میں شرکت کا موقع مل جائے۔ اکثر یہ خواہش پوری بھی ہوجاتی تھی لیکن جب کبھی ایسا نہیں ہو پاتا تھا تو وہ بے چینی سے رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے۔ لیکن جب مولانا محمد حسین نے یہ محسوس کرلیا کہ ان کا شعری ذوق فطری ہے تو رفتہ رفتہ ان کا رویہ نرم ہوگیا اور پھر وہ سیماب کی شاعری کے روشن مستقبل کے لیے دعائیں کرنے لگے۔

سیماب اکبرآبادی نے جس وقت شاعری شروع کی وہ دور ایسا تھا جب عموماً اردو غزل وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ غزل کے اجزائے ترکیبی گل وبلبل، شمع و پروانہ، شراب وشباب اور شانہ وزلف وغیرہ تھے۔ اردو غزل قدیم فارسی غزل کی روایات وخصوصیات سے باہر نہیں نکل سکی تھی اور ان ہی روایتی موضوعات کو نئے زاویے دے کر، زبان کے کمالات دکھا کر غزل کہنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ تخیل پر تغزل کو فوقیت تھی اور شاعری کو تفریح وتعیش، بلکہ ''فحش نگاری'' سمجھا جاتا تھا یا پھر اس سے کچھ مختلف مذہب اور تصوف کے موضوعات کو برتا جانے لگا تھا۔ لیکن اس میں بھی عمومیت تھی۔ ایسے ماحول میں سیماب نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں انھوں نے بھی غزل کے مروجہ مزاج کو اپنانے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن وہ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی اس روایتی غزل گوئی سے بیزار تھے۔ وہ ان شعرا کو پڑھنا پسند کرتے تھے جنھوں نے غزل میں نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ خصوصاً مرزا غالب ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ اس وقت مشاعروں کی واہ واہ اور عام داد وتحسین شعرا کے لیے بڑی نعمت ہوا کرتی تھی۔ ایسے ماحول میں اگر ایک طالب علم نئی روش تلاش کرنے کوشش کرے اور فرسودہ ماحول ومزاج سے خود

کو بچانا چاہے تو وہ اس کی جدت پسند طبع ہی کہلائے گی۔ سیماب نے بھی اپنی جدت پسندی ہی کو اپنا رہنما کیا۔

جس دور میں سیماب اکبر آبادی نے شعر گوئی کا آغاز کیا اس وقت اردو شاعری میں اصلاح سخن کا عام رواج تھا۔ ہر شاعر کسی نہ کسی استاد کا شاگرد ہوتا تھا۔ چنانچہ علامہ سیماب نے بھی فصیح الملک داغ دہلوی کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا۔ حالانکہ اس سلسلے میں اختلافات ہیں کہ سیماب نے کب داغ کی شاگردی اختیار کی۔ آیا اجمیر میں زمانۂ طالب علمی میں کسی سے اصلاح لی تھی یا نہیں؟ بقول حامد اقبال صدیقی اجمیر میں سیماب شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن کسی کامل فن سے اصلاح سخن کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اگر چہ اجمیر اور آگرہ کے بعد انھوں نے شعرا سے مشورۂ سخن ضرور کیا لیکن باضابطہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ قاسم علی خاں قادری مارہروی لکھتے ہیں:

''سیماب کبھی کبھی خاک (اجمیری) کی دکان پرنل بازار میں جا کر بیٹھتے تھے۔ خاک کو ان کے ذوق شاعری سے شغف تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ان میں صلاحیت شاعرانہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک روز جب سیماب صاحب نے خاک صاحب کو اپنی ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا۔

حیرت میں ہے قمر ترا دیدار دیکھ کر
چکرا رہا ہے چرخ بھی رفتار دیکھ کر

تو حضرت خاک نے ان کی غزل لے کر اس پر یہ شعر لکھ دیا۔

سیماب شعر کہنے کا گر شوق ہے تمھیں
استاد بھی کرو کوئی اے یار دیکھ کر

(۱۷)

خاک اجمیری کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ سیماب ان کے (خاک اجمیری) کے شاگرد نہ تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ شعرا نے ابتدائی دنوں میں مختلف لوگوں سے مشورۂ سخن کیا اور پھر کسی ایک کو اپنا استاد تسلیم کر لیا جیسا کہ قائم چاند پوری مرزا سودا کے شاگرد ہونے سے پہلے شاہ ہدایت اور میر درد سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ نوح ناروی نے داغ دہلوی کی شاگردی سے پہلے میر نجف علی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے فیض اصلاح حاصل کیا لیکن ان بزرگ شعرا نے اپنے ان مصلحین کو اساتذہ کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ علامہ سیماب جو خود بزرگوں کا احترام کرنا جانتے تھے اور استاد کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے، انہوں نے بھی داغ دہلوی سے قبل کسی سے باقاعدہ اصلاح لینے کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لہذا خاک اجمیری، ازل عظیم آبادی اور افسوں شاہجہاں پوری سے علامہ سیماب کے مشورۂ سخن کرنے اور ان کی شاگردی اختیار کرنے کا خیال درست نہیں ہے۔

سیماب کے قیام اجمیر میں ان کی ملاقاتیں کئی اساتذۂ سخن سے تھیں۔ ان میں منشی نظیر حسن سخا دہلوی بھی تھے جو داغ کے شاگرد تھے۔ سخا سے شعر و سخن کے موضوع پر سیماب کی خاصی گفتگو رہتی۔ سخا یہ محسوس کر چکے تھے کہ اس نوجوان میں شاعری کی بے پناہ صلاحیت ہے لہذا وہ اکثر سیماب سے اصرار کرتے کہ یا تو وہ ان کے شاگرد ہو جائیں یا کوشش کر کے مرزا داغ کے تلامذہ میں شامل ہو جائیں۔ غالباً وہ سخا صاحب کو اپنا استاد بنانا نہیں چاہتے تھے یا پھر یہ کہ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوں۔ لہذا سخا صاحب کی پیش کش قبول نہیں ہوئی۔

داغ دہلوی سے سیماب اکبرآبادی کی ملاقات اور شاگردی اختیار کرنے کی بھی ایک روایت ہے۔ کانپور میں دوران ملازمت یعنی ۱۸۹۸ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ راز چاند پوری نے ''داستان چند'' میں اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

''اجمیر میں منشی نظر حسن خاں سخا دہلوی تلمیذ داغ دہلوی سیماب صاحب کے ہم محلّہ تھے اور سیماب صاحب کبھی کبھی حضرت سخا سے شعر وسخن کے باب میں گفتگو کیا کرتے تھے۔سخا صاحب ان کو برابر یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ یا تو ان کے شاگرد ہو جائیں یا کوشش کر کے مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہو جائیں۔ کانپور کے زمانۂ قیام (۹۸۔۱۸۹۷) میں حسن اتفاق سے ایک بار مرزا داغ کسی رئیس دکن کے ساتھ دہلی واپسی میں کانپور سے گزرے۔سخا صاحب مرزا داغ کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے سیماب صاحب کو اطلاع دی اور سیماب صاحب وقت مقررہ پر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔مرزا داغ نے ان کو سیلون میں بلایا اور بیٹھنے کی اجازت دی اور کہا کہ سخا صاحب نے مجھ سے آپ کی بہت سفارش کی ہے۔اور آپ کے دیرینہ ارمان تلمذ کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر سیماب کو حکم دیا کہ وہ کوئی غزل سنائیں۔انھوں نے اپنی تازہ غزل سنائی۔مرزا داغ ہنسے اور فرمایا...اچھا اصلاح کے لیے آپ غزلیں مجھے حیدرآباد بھیج سکتے ہیں۔'' (۱۸)

داغ کی شاگردی

علامہ سیماب داغ دہلوی کے شاگرد ہیں لیکن اس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے اور چند غلط فہمیوں کی بنیاد پر وہ سیماب کو داغ دہلوی کا شاگرد نہیں مانتے۔علامہ سیماب کی داغ دہلوی کی شاگردی سے انکار کرنے والوں میں سب سے اہم نام ابراحسنی گنوری اور مولانا حامد حسین قادری کا ہے۔ حالانکہ ابراحسنی گنوری اپنے بیان کی صداقت میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے ہیں۔وہ اپنی تصنیف ''اصلاح الاصلاح'' میں لکھتے ہیں:

''سیماب صاحب کی شاعرانہ شخصیت اور نفسیات کا تجزیہ کرنے

میں جانشینی داغ کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے مشہور کیا ہے کہ وہ داغ کے شاگرد ہیں، لیکن تخلیقات سے یہ چیز غلط ثابت ہوتی ہے۔ ابھی سیماب صاحب کو عالم طفلی میں دیکھنے والے بزرگ محمد اللہ بقید حیات ہیں۔ خصوصاً ان کے ہم مشق تو متعدد موجود ہیں ۔ جب ان سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ حضرت عالی اکبر آبادی کے شاگرد ہیں اور حضرت عالی کی زندگی تک وہ ان سے اصلاح لیتے رہے۔ سیماب صاحب کے والد ماجد اجمیر میں وعظ کہا کرتے تھے۔ سیماب صاحب بھی اس سلسلہ میں اجمیر رہتے تھے اور حضرت خاک اجمیری (بقید حیات ہیں اور وہاں کے متعدد استاد ہیں) سے اصلاح لیتے تھے۔ جب سیماب صاحب ریلوے میں ملازم ہوگئے اور ان کا تبادلہ کانپور ہو گیا تو انھوں نے بہ تقاضائے وقت حضرت ازل عظیم آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نہایت وفادار شاگرد کی طرح ان کی شاگردی پر فخر کرتے رہے۔ چنانچہ مرقع قیصری نام کا گلدستہ جس میں ایک مشاعرہ غالب کے اس مصرع پر چھپا ہے ؎

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

۱۹۰۴ میں شائع ہوا۔ اس میں سیماب صاحب کا ایک قطعۂ تاریخ بھی ہے، جس کی سرخی ہے قطعۂ تاریخ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی تلمیذ حضرت ازل عظیم آبادی۔ بایں ہمہ سیماب صاحب خود کو داغ کا شاگرد لکھتے ہیں اور سنہ شاگردی ۱۸۹۰ بتاتے ہیں۔ داغ کے محبوب اور واقف راز شاگردوں میں کوئی اس بات کا پتہ نہیں دیتا کہ انھوں نے سیماب صاحب کو خود داغ کا شاگرد دیکھا یا سنا۔ سفر و حضر میں مدتوں ساتھ رہنے

والے شاگرد حضرت احسن مرحوم اور حضرت نوح مدظلہ ہیں۔ان حضرات سے جب سیماب صاحب کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے اقرار نہ کیا اور مصلحت آمیز خاموشی سے کام لیا۔اگر چہ یہ دونوں حضرات اپنی تحریروں میں مصلحتاً اس امر کی تصدیق کرتے رہے کہ ہاں سیماب ،داغ کے شاگرد ہیں مگر غالباً یہ کام مروت کے تحت تھا۔حضرت بیخود دہلوی اور حضرت سائل کو جتنی قربت داغ سے حاصل ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔ میں نے حضرت بیخود سے سوال کیا کہ، کیا سیماب مرزا داغ کے شاگرد ہیں ۔انھوں نے صاف کہا کہ نہیں ۔ہم نے کبھی استاد کے پاس دیکھا، نہ کبھی استاد سے ان کا نام سنا۔میں نے کہا کہ پھر آپ حضرات نے اس بات کا اعلان کیوں نہیں کیا؟ فرمایا ہمیں کیا ضرورت ہے۔ایک شخص ہم سے رشتہ ملاتا ہے۔ہمیں اس کی تالیف قلب کے لیے ہاں میں ہاں ملا دینی چاہیے۔ایک مرتبہ میں نے حضرت سائل مرحوم سے بھی سوال کیا۔فرمانے لگے بیٹا شاگرد تو نہیں ہیں اور اگر ہوں تو ایسے خطی (خط کے ذریعہ جو لوگ شاگرد ہوتے ہیں) شاگردوں میں ہوں گے جیسے داغ کے ہزاروں شاگرد تھے اور جن کی غزلوں پر تمہارے استاد احسنؔ اور بھائی نوحؔ وغیرہ بحکم داغ اصلاح کر کے بھیج دیا کرتے تھے۔میں نے کہا حضرت آپ نے تو بڑے وثوق کے ساتھ اپنی تحریر میں انھیں شاگرد داغ تسلیم کیا ہے بلکہ ان کو داغ کے بعد جانشین کی سند بھی عطا فرمائی ہے آخر یہ کیا؟ ہنسے اور کہنے لگے ارے بھئی جب انھوں نے نام پیدا کر لیا ہے اور ہماری برادری میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمارا حرج بھی کیا ہے کہ ان کو اپنا

بھائی بتادیں اور بنالیں اس طرح حضرت جوش ملسیانی اور
حضرت ناطق گلاوٹھی سے جو مرزا داغ کے مخصوص تلامذہ ہیں
،میں نے استفار کیا تو ان حضرات نے بانگ دہل انکار قطعی
کیا۔'' (۱۹)

ابراحسنی گنوری کے مذکورہ بیان میں قطعی صداقت نہیں ہے۔ان کا یہ کہنا کہ سراج الدین سائل دہلوی اوراحسن مارہروی نے مصلحت کی بنیاد پر غلط بیانی سے کام کیا ہے،سراسر غیر ذمہ دارانہ اور غیر تحقیقی بیان ہے۔سراج الدین سائل دہلوی کے قول کی تصدیق اس خط سے بھی ہوتی ہے جوانھوں نے نوح ناروی کولکھا تھا۔اس میں یہ درج ہے:

''میں تم چار ہستیوں کو جتنا عزیز رکھتا ہوں اسے میرا دل ہی جانتا
ہے۔نمبروں کی ترتیب درجہ قائم کرتی ہے۔تم (نوح) بیخود ،
جوش ملسیانی،سیماب اکبرآبادی۔'' (۲۰)

سیماب اکبرآبادی اپنی کتاب کلیم عجم لکھتے ہیں کہ:

''میں ۱۸۹۸ میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد
ہوگیا''۔ (۲۱)

اس سلسلے میں (کلیم عجم) پردرج سیماب اکبرآبادی کا خود اپنا بیان درج ہے جو دلچسپ بھی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۹۸میں حیدرآباد سے برادر محترم ابوالمعظم نواب سراج
الدین احمد خاں سائل دہلوی کی ادارت میں رسالہ''معیارالانشاء
''شائع ہوتا تھا۔نواب فصیح الملک کے حکم سے میں اس کا خریدار
ہوا۔اور غزلیں بغرض اصلاح حیدرآباد بھیجنے لگا۔لیکن دوسری یا
تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ''ابھی آپ کو مشق
کی ضرورت ہے۔''اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل

کچھ عرصے کے لیے بند کردی، اور مشق سخن کی طرف متوجہ
ہوگیا۔اب میرا دستورالعمل یہ تھا کہ میں صبح سے شام تک بادامی
کاغذ کا ایک دستہ اشعار سے سیاہ کردیا کرتا تھا۔اور یہ دفترِ بے معنی
شام کو پھاڑ کر نالی میں بہا دیتا تھا۔کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی
طرح جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کانپور) میں ایک
مشاعرے کا اعلان ہوا۔''دم نکلتا ہے۔کم نکلتا ہے'' میں نے
ایک سیر غزل کہی اور استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ یہ
غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سرخ سیاہی سے لکھا
ہوا تھا۔''آفریں ہے۔ کیا خوب غزل کہی ہے''بس پھر تو
حوصلے بڑھ گئے۔'' (۲۲)

رشید احمد علوی نے رسالہ ''شاعر'' جنوری وفروری ۱۹۳۵ کے صفحہ نمبر:۱۷ پر ۱۸۹۸ کو ہی سیماب کا حضرت داغ سے تلمذ حاصل کرنے کا سال لکھا ہے۔

فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگردوں میں احسن مارہروی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بھی اپنے ایک مضمون ''مرزا داغ اور ان کے نورتن'' میں علامہ سیماب کو داغ کا ایک رتن بتایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''وہ اور مقالہ نگار ایک ہی استاد کے چشمۂ فیض سے سیراب
ہوئے ہیں ...۱۸۹۸میں آپ کو جہاں استاد سے بذریعہ خط و
کتابت شرف تلمذ حاصل ہوا۔آپ تمام تلامذہ فصیح الملک میں
ایسے فرد وحید ہیں کہ مدت مدید ہی سے شعر وسخن میں اپنا پورا وقت
صرف کرتے ہیں۔'' (۲۳)

ان تمام بیانات اور شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سیماب اکبرآبادی ۱۸۹۸ میں ہی داغ کے شاگرد ہو گئے تھے لیکن استاد سے اصلاح لینے کا سلسلہ کچھ دنوں بعد شروع ہوا۔

رسالہ ’’تاج‘‘(گیا)،خم خانۂ جاوید،حیات داغ اور رسالہ ’’شاعر‘‘ کے کارامروز نمبر میں علامہ سیماب پر شائع مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے داغ سے مستقل اصلاح لینے کا سلسلہ ۱۹۰۱یا۱۹۰۲میں شروع کیا۔

۱۹۲۳میں آگرہ میں مستقل قیام کے بعد سیماب اکبرآبادی نے اپنے آپ کو اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔آگرے میں ان کے گرد فیض سخن حاصل کرنے کے لیے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ جمع ہو گیا تھا۔خود ان کے ذہن میں بھی کئی رسائل اور تصنیفات کے منصوبے زیرِ غور تھے۔ چنانچہ استقلال حاصل ہونے کے بعد ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا،اور اس کے تحت سب سے پہلے ایک علمی اور اشاعتی ادارہ ’’قصرالادب‘‘ کی بنیاد ڈالی۔’’قصرالادب‘‘ کے دفتر میں ہی باقاعدہ تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے اور خود تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔آگرہ میں مستقل قیام پذیر ہو جانے کے بعد ان کے سامنے دو اہم امور تھے۔ پہلا پورے خاندان کی کفالت ،دوسرا اردو ادب کی دنیا میں بحیثیت شاعر اپنا سکہ رائج کرنا۔

’’قصرالادب‘‘ کے قیام سے یہ دونوں چیزیں حاصل ہونے لگیں لیکن آمدنی اتنی قلیل تھی کہ اس سے پورے خاندان کی کفالت اور تصنیفی اخراجات کا پورا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔اس پر فیاضی کا یہ عالم کہ ’’قصرالادب‘‘ میں اصلاح سخن کے لیے آنے والے شاگردوں کی ضیافت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔یہی نہیں اپنے بعض شاگردوں کے مستقبل اور معاش کے لیے بھی فکرمند رہتے تھے۔ادبی رسالہ ماہنامہ ’’پیمانہ‘‘ اسی لیے جاری کیا تھا کہ اپنے عزیز شاگرد صمد یار خاں ساغر نظامی علی گڑھی کو ذریعہ معاش فراہم کرا سکیں۔اسی لیے اپنے زیرِ سرپرستی اس رسالے کا مدیر صمد یار خاں ساغر نظامی علی گڑھی کو بنایا تھا۔

اس دور میں اردو میں جو رسالے شائع ہوتے تھے ان کے انداز میں اور ’’پیمانہ‘‘ کے انداز

میں بہت فرق تھا۔ یہ رسالہ ہر اعتبار سے بالکل نیا مزاج رکھتا تھا اور سیماب کے زبردست تخلیقی ذہن نے اس کے نظم و نثر کے انتخاب اور پیش کش کو ایک جدت عطا کر دی تھی۔ لہذا پہلے ہی شمارے سے رسالے کی دھوم مچ گئی اور بہت جلد وہ اردو کے اہم ترین ماہناموں میں شامل ہو گیا۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ اس دور میں کچھ رسائل قارئین کو متوجہ کرنے کے لیے معاصر رسائل پر شعرا اور ادبا کی تخلیقات اور کتابوں پر تنقید و تنقیص کے تیر چلاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے رسائل حدود ادب سے بھی گزر جاتے تھے اور طنزیہ، مزاحیہ انداز اختیار کرنے کے بجائے ان کا انداز عامیانہ ہو جاتا تھا۔ بہر کیف ان باتوں سے عام قاری بہت لطف اندوز ہوتے تھے لیکن سنجیدہ ادبی مذاق کے حامل لوگوں کو ان سے تکلیف پہنچتی تھی۔ ''اودھ پنچ''، لکھنؤ، بہار اور علی گڑھ نے ''پیمانہ'' پر تیر چلانے شروع کر دیے لیکن اس کی وجہ سے ''پیمانہ'' کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور بہت جلد ''پیمانہ'' جدید رجحانات کے حامل اہل قلم کا محبوب ترین رسالہ بن گیا تھا۔

''قصر الادب'' سے سیماب اکبر آبادی نے ایک پندرہ روزہ جریدہ ''ثریا'' بھی جاری کیا، جس کی تفصیل نہیں ملتی۔ غالباً یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ علامہ سیماب نے اسی دوران ایک اور ادارہ ''دارالتصنیف'' کے نام سے قائم کیا۔

۱۹۲۵ کے آخر میں سیماب اکبر آبادی اپنے عزیز شاگرد ساغر نظامی کے ساتھ ایک مشاعرے میں جموں گئے جہاں لاہور سے مدعو شعرا میں تاجور نجیب آبادی بھی شامل تھے۔ تاجور نجیب آبادی نے سیماب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ دراصل لاہور میں تاجور نجیب آبادی کی سربراہی میں ایک ادارہ ''اردو مرکز'' کے نام سے قائم تھا، جس کے زیر اہتمام اردو شعر و ادب سے انتخاب کر کے شاہکار تحریروں کو کتابی صورت دی جا رہی تھی تا کہ اسے نصاب تعلیم میں شامل کیا جا سکے۔ تاجور نے اس پروجیکٹ میں سیماب کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی اور مالی

منفعت کا یقین دلایا۔ دیگر شعرا نے بھی سیماب کو اپنے ادارے ''قصرالادب'' اور رسالہ ''پیمانہ'' کو لاہور منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ اتفاق سے اسی دوران لاہور کے مشہور پریس ''فیروز سنٹر'' کے مالک مولوی فیروزالدین بھی جموں میں قیام پذیر تھے اور ان کو بھی ایسے قادرالکلام شاعر کی تلاش تھی جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو، کیونکہ انھیں مولانا روم کی مشہور مثنوی ''مثنوی معنوی'' کا منظوم ترجمہ کروانا تھا۔ چنانچہ مولوی فیروزالدین کی نظر انتخاب علامہ سیماب پر پڑی کی۔ انھوں نے سیماب کو مناسب معاوضہ دینے کا وعدہ کیا لیکن یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ کام ان کی زیرنگرانی لاہور میں ہی کیا جائے گا۔ ذریعۂ معاش کی کشش نے علامہ سیماب کو آگرہ سے لاہور منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۶ میں سیماب اپنے پورے خاندان کے ہمراہ لاہور پہنچ گئے۔ لیکن لاہور کا موسم اور ادبی فضا دونوں ہی سیماب کو راس نہیں آئے۔ رسالہ ''پیمانہ'' کی اشاعت بھی پابندی سے نہیں ہوسکی اور سیماب معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ آخرکار چند ماہ میں ہی (غالباً ستمبر ۱۹۲۶) میں وہ لاہور کو خیرباد کہہ کر دوبارہ آگرہ چلے آئے۔

لاہور آنے جانے سے سیماب کی معاشی حالت نہایت ابتر ہوگئی۔ لیکن اس دوران میں قدرت نے ان سے ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دلوالیا، اور وہ تھا مولانا روم کی مثنوی کا منظوم ترجمہ'' الہام منظوم''۔ لاہور سے ناکام واپسی کے بعد سیماب کو دہلی میں ایک اخبار ''ریاست'' کی ادارت مل گئی۔ یہ اخبار سردار دیوان سنگھ مفتوں کا تھا۔ ڈیڑھ سو روپئے ماہنامہ تنخواہ مقرر تھی۔ سیماب کی ادارت میں ''ریاست'' کی دھوم مچ گئی اور مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ دیگر اخبارات کے مالک انھیں اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دینے لگے۔ لیکن اخباری صحافت علامہ سیماب کے مزاج کے موافق نہ تھی اس لیے انھوں نے ''ریاست'' کو بھی الوداع کہہ دیا۔

> ''اس دوران انھوں نے ''دارالتصنیف'' بھی دہلی ہی میں قائم کرلیا تھا۔خواجہ حسن نظامی نے انھیں اصلاحی نظمیں لکھنے کا کام دلوادیا تھا۔ انھیں روز انہ ایک نظم لکھنے کے بیس روپئے ملتے تھے۔'' (۲۴)

انہوں نے جنوری ۱۹۲۸ میں ''پیمانہ'' کا ایک شمارہ دہلی سے شائع کیا۔ قیام دہلی کے دوران سیماب کو مالی پریشانیاں تونہیں ہوئیں مگران کی طبعیت یہاں بھی مطمئن نہیں ہوئی اور انھیں دہلی کو خیر باد کہہ کر پھرآگرہ آنے پر مجبور ہونا پڑا۔جون ۱۹۲۸ میں سیماب اکبرآبادی مستقل طور پرآگرہ میں بس گئے تھےاوران کی مصروفیات بہت زیادہ ہوگئی تھیں۔شاگردوں کی بھیڑتھی۔روزانہ ڈھیروں غزلیں اور نظمیں بغرض اصلاح ڈاک سےآتی تھیں۔رسالہ''پیمانہ'' بھی دوبارہ جاری ہوگیا تھا اور''دارالتصنیف'' کے زیراہتمام کتابوں کی اشاعت کا آغاز بھی انہوں نے کردیا تھا۔''دارالتصنیف'' کےتعلق سے ایک تکلیف دہ حقیقت کا اظہار بھی یہاں ضروری ہے۔معاشی مسائل کوحل کرنے کے لیے سیماب نے معقول معاوضے پردوسروں کے نام سے کتابیں تصنیف کیں،اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو دوسروں کے نام منتقل کیا اورکئی لوگ ان کی اس عنایت سےادیب اورشاعربن گئے۔بقول ضیافتح آبادی:

> ''سیماب کے کچھ چہیتے شاگرد بھی تھےاورکہاجاتا ہے کہ سیماب کے عہد جوانی کا بیشتر کلام ان کے ایسے شاگردوں کے دواوین میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بقول کسے جوظلم اورناانصافی سیماب کے دادا،استادذوق نےخود پرکی تھی وہ سیماب نے بھی روارکھی۔اس غلطی کا نتیجہ ذوق نے بھی بھگتا اور سیماب کوبھی بھگتنا پڑا۔'' (۲۵)

اگرچہ ایسانہیں کہ علامہ سیماب صرف اجرت لےکرکتابیں ہی لکھتے رہے بلکہ وہ پابندی

کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ مشاعروں میں بھی جاتے تھے اور معاصرین سے ادبی معرکے بھی سر کرتے تھے۔

انہوں نے مکتبہ ''قصرالادب'' سے رسالہ ''پیمانہ'' کے بعد جنوری ۱۹۲۹ میں ہفت روزہ اخبار ''تاج'' جاری کیا۔ یہ اخبار سیماب کے سیاسی خیالات وافکار کا ترجمان تھا اور بہت جلد علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں مقبول ہوگیا تھا۔ غالباً ۱۹۳۰ میں اس اخبار کا ایک شمارہ تمام وکمال منظوم شائع ہوا یعنی ہر خبر ہر تبصرہ اور ہر اشتہار کو سیماب نے شعر کے پیکر میں ڈھال دیا تھا۔ یہ ان کی بے پناہ قوت شعر گوئی کا ایک زبردست ثبوت تھا اور اس کی اشاعت سے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔

فروری ۱۹۳۰ میں رسالہ ''شاعر'' کا اجرا ہوا۔ یہ رسالہ نہ صرف سیماب اکبرآبادی کے علمی اور ادبی افکار اور نظریات کا آئینہ تھا بلکہ دبستان سیماب اور اردو ادب اور زبان میں ہونے والے نئے انقلاب کا نقیب بھی۔ ۱۹۳۲ میں ''پیمانہ'' بند کر دیا گیا اور ۱۹۳۳ میں ''تاج'' کی اشاعت میں بھی تعطل آ گیا لیکن ''شاعر'' جاری رہا اور تاحال جاری ہے۔

رسالہ ''شاعر''

دراصل علامہ سیماب اکبرآبادی نے ''جمعیت الشعرائے ہند'' کی تشکیل کا نہ صرف بہت پہلے خواب دیکھا تھا بلکہ اس کے اغراض ومقاصد اور قوانین وضوابط بھی مرتب کر لیے تھے۔ لیکن ان کا یہ خواب ابھی تک خواب ہی تھا۔ ۱۹۲۹ میں انہیں پھر شعرائے ہند کی جماعت بندی کا احساس ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام شعرا کو متحد کرنے کے لیے ایک خالص ادبی اخبار شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اخبار کے اغراض ومقاصد ان کے پیش نظر یوں تھے:

> ''۱۔ ایک آل انڈیا لٹریری کانفرنس کا قیام اور اس کے متعلق انتظامی کوششیں، ۲۔ ہندوستان کے تمام شعرا کو ایک رشتۂ تنظیم

واخوت میں منسلک کرنا،۳۔شاعری کوموجودہ مبتذل اورانحطاط
پذیر حالات سے ابھارنا،۴۔موجودہ شاعروں کو اس قابل بنانا
کہ وہ ترقی ملک وقوم کا باعث ہوں، ۵۔شعرا کے حالات و
واقعات ہفتہ وار شائع کرنا،۶۔ایک ایسا ادارۂ اشاعت قائم کرنا
جو شعرا کے دیوان اور مجموعۂ کلام کی طباعت اور اشاعت
کر سکے،۷۔شعرا کو گمنامی اور بے قدری کی پستی سے معراج
شہرت پر لانا اور ہفتہ وار ان کی غزلیں ،نظمیں اور کلام شائع
کرنا۔'' (۲۶)

اغراض ومقاصد کا یہ اشتہار رسالہ ''تاج'' اور'' پیمانہ'' کے اواخر ۱۹۲۹ کے شماروں میں وہ شائع کرتے تھے۔شروع میں اس ادبی اخبار کو ہفت روزہ شائع کرنے کا منصوبہ تھا لیکن غالب کے یوم وفات ۱۵رفروری ۱۹۳۰ کو پندرہ روزہ اخبار''شاعر'' کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا۔اس کے نگراں خود علامہ سیماب اکبرآبادی اور مدیران کے بڑے بیٹے منظر حسین صدیقی تھے۔ سرورق پر ایک جانب غالب کی ایک تصویر تھی اور دوسری جانب ''جمعیت الشعرائے ہند'' کا واحد اخبار تحریر تھا،اوراس کے ساتھ ہی سیماب کی نظم کا یہ شعر بھی درج تھا۔

پیدا ہوا ہے فکر کی مشکل کشائی کے لیے
شاعر ہے آواز خدا ساری خدائی کے لیے

سیماب کی مصروفیات میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے''شاعر'' پندرہ روزہ نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔چنانچہ جون ۱۹۳۵ میں اسے ماہنامہ کردیا گیا اور یہ اخبار سے رسالے میں تبدیل ہوگیا۔شاعر کے مشمولات دیگر رسالوں کے مقابلے میں ہمیشہ سے مختلف رہے۔اس زمانے میں سیماب فن شاعری کے رموز و نکات تحریر کرتے تھے اور اصلاح سخن کی بہت سی باریکیاں طالب علموں کے لیے لکھتے تھے۔

رسالہ ''شاعر'' نے مناظمے اور مناثرے کو رواج دے کر ان شعرا میں بھی نظم و نثر لکھنے کا ذوق پیدا کر دیا جو اپنے آپ کو صرف غزل تک محدود رکھے ہوئے تھے۔ اس رسالے میں املا، انشا، تخئیل اور معانی و بیان کی ایسی تشریح ہوتی تھی کہ طالب علموں کے لیے مشکل فنی رموز کو بھی سمجھنا آسان لگتا تھا۔ علامہ سیماب نے فرسودہ لفظیات کو متروک قرار دیتے ہوئے نئی تراکیب اور لفظیات کو رواج دیا۔ مثلاً اردو میں لفظ ''رومان'' ان ہی کا رواج دیا ہوا ہے۔

''شاعر'' کے مستقل اور مقبول کالموں میں ''جرعات'' اور ''ہمارا پیام'' شامل تھے۔ ''جرعات'' صرف اداریہ ہی نہیں بلکہ ماہ بہ ماہ اردو ادب کی تاریخ اور مسائل و مباحث کی ایک داستان بھی ہے۔ ''ہمارا پیام'' میں حالات حاضرہ اور شخصیات پر سیماب کے قطعات اور رباعیات کا زبردست شہرہ تھا۔ اس کے علاوہ ''شاعر کی راتیں'' ایک دلچسپ سلسلہ تھا جس میں سیماب ان مشاعروں کے یادگار واقعات قلم بند کرتے تھے جن میں خود وہ شریک ہوئے۔ ''شاعر'' میں اساتذۂ سخن اور چند معاصر رسائل کے ساتھ ادبی معرکے قارئین کی دلچسپی کا ایک بڑا سبب رہے۔

> ''رسالہ ''شاعر'' اب مبتدیوں کے مذاق سے گزر کر منتہیوں کے مفاد کا باعث ہوتا جاتا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر صوبہ کے سرشتۂ تعلیم میں ''شاعر'' منظور کر لیا جائے۔ خود بھی کوشش کر رہا ہوں، آپ بھی توجہ فرمائیں۔''
>
> (۲۷)

فروری ۱۹۵۱ سے (علامہ سیماب کی وفات کے بعد) ''شاعر'' آگرہ سے ممبئی منتقل ہو گیا اور اعجاز صدیقی مرحوم اپنے خون سے اسے سینچتے رہے۔ یہ شجر سایہ دار پھلتا پھولتا رہا۔ ۹ فروری ۱۹۷۸ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ''شاعر'' جب آگرہ سے بمبئی منتقل ہوا تو اس کے مزاج میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس سفر میں انتظامی امور ان کے فرزند ناظر نعمان صدیقی کے

سپرد رہے اور تا حال ہیں۔ اعجاز صدیقی کے بعد ان کے بڑے فرزند تاجدار احتشام صدیقی مدیر اعلیٰ ہوئے، اور تیسرے فرزند افتخار امام صدیقی معاون مدیر۔ ۴ فروری ۱۹۸۱ کو تاجدار احتشام صدیقی رحلت فرما گئے تب سے تا دم تحریر افتخار امام صدیقی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں اور رسالہ شاعر پون صدی سے بھی زائد عرصے سے جاری ہے۔

آگرہ اسکول

سیماب اکبرآبادی نے 'قصرالادب' کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ 'آگرہ اسکول' کی اصطلاح استعمال کر کے اردو کے شعرا، ادبا اور قارئین کو چونکا دیا۔ دراصل انھوں نے خاں آرزو کے 'مراختہ' کو آگرہ اسکول کی بنا ثابت کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آرزو اور آبرو کے بعد میر، غالب، نظیر اور سیماب سبھی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ جب سیماب نے 'آگرہ اسکول' کا تصور پیش کیا تو لوگ یہی سمجھے کہ اس سے مراد آگرہ میں پیدا ہونے والے نامور شعرا ہیں لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی تحریروں اور خطبات کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 'آگرہ اسکول' سے مراد کوئی فرد یا خود تلامذۂ سیماب کی جماعت نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت و تشہیر کے لیے رسالہ 'شاعر' نے ستمبر ۱۹۳۷ میں 'آگرہ اسکول نمبر' شائع کیا۔ اردو شاعری کے دو اسکولوں یعنی دہلی اور لکھنؤ پر ہی عموماً گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن سیماب نے آگرہ اسکول کی اصطلاح استعمال کی۔ انھوں نے اپنے دسویں خطبۂ صدارت (دسمبر ۱۹۳۵) میں اسکول کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین خاموش ترقی کرتا رہا ہے۔ شعرائے متقدمین کو چھوڑ کر عہد متوسط کے شعرا نے مرزا غالب مرحوم سے ان کی زندگی تک افادہ کیا لیکن آخر یہ خارجی اثر آگرے سے کم ہوتا گیا اور طالبان فن کسی مقامی ماہر فن کے

علاوہ دوسروں کے ممنونِ فن نہیں ہوئے''۔

آگے مزید لکھتے ہیں:

''وہ سرزمین جس کی خاک پاک سے میر وغالب کے سراپا شعر مجسّمے بنے تھے ناممکن تھا کہ دورِ تعلیم واصلاح میں میر وغالب کی صدائے بازگشت سے نہ گونجتی، گونجی اور پوری قوت کے ساتھ گونجی ۱۹۱۲ سے علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کا رنگِ تغزل یکا یک ہندوستان میں چمک اٹھا تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقون میں دہلی ولکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہوگئے جوان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علم بردار ہوئے۔ یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگ تغزل کے امتزاج سے بقدرِ معتدل پیدا ہوا تھا۔ آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع وموید ہے اور یہی وہ اسلوب وروش ہے جسے ہم اردو شاعری کے لیے بطور معیار پیش کرسکتے ہیں''۔ (۲۸)

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آگرہ اسکول اولاً میر وغالب اور پھر غالب وداغ کے رنگِ سخن کے امتزاج سے پیدا ہونے والے شعری رویوں کا نام ہے،لیکن شاید یہ ایک ابتدائی فکر تھی، رفتہ رفتہ اس میں مزید وسعتیں تلاش کی گئیں۔ سیماب نے شعرائے اکبرآباد آرزو، آبرو، مظہر،نظیر، میر، غالب اور ان سبھی کے تلامذہ کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور یہ جائزہ بھی لیا ہوگا کہ ان شعرا کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے دیگر شعرا کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔ان شعرا کی زبان کی اپنی الگ کیا خصوصیات ہیں،متروکات اور عروضی ترجیحات کیا ہیں۔ طریقۂ اصلاح کیا رہا ہے۔معاشرتی اور سماجی نظریات کیا رہے۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا کہ علم سماجیات،تاریخ،زبان وبیان،علم عروض اور لسانیات کا ماہر ہی ایسے مطالعے اور اس کے

نتائج کا احاطہ کرسکتا ہے۔ پھر جس اعتماد کے ساتھ تن تنہا سیماب نے 'آگرہ اسکول' کے وجود کا اعلان کیا اور مدلل بحثیں کیں، یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اپنے مطالعے اور تجزیے کے نتیجے میں سیماب نے چند اصول وضوابط طے کیے اور ان اصول وضوابط کے فریم میں ٹھیک بیٹھنے والے شعرا یا اپنے تلامذہ کو ایک مالا میں پروکر آگرہ اسکول کا نام دے دیا۔ 'دستور الاصلاح' میں آگرہ اسکول کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آگرہ اسکول فی نفسہٖ کوئی ادارۂ خیال نہ تھا۔ اسی متعینہ اصلاح نے اس کا وجود متعین اور مسلّم کردیا۔ آگرہ یا اکبرآباد، دہلی اور لکھنؤ کے مابین ایک قدیم اسلامی درالسلطنت ہے جہاں بابر، ہمایوں، اکبر اعظم اور شاہ جہاں نے برسوں حکومت کی اور دنیا بھر کے ممتاز اربابِ کمال کو وہاں جمع ہونے کی دعوت دی۔ انتقالِ دارالحکومت کے بعد اکبرآباد کے مشہور علما اور شعرا دہلی اور لکھنؤ چلے گئے اور جس چیز نے یہاں نشو ونما پائی تھی اسے دہلی اور لکھنؤ میں عروج ملا۔

مرزا اسداللہ غالب آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں پروان چڑھے، یہیں تعلیم وتربیت پائی اور یہیں سے دہلی گئے۔

میر تقی میر بھی آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا اور سن بلوغ کے بعد یہیں سے دہلی اور پھر دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔

دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبرآباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی۔ وہ دیکھتا رہا کہ دہلی اور لکھنؤ میں لسانی اور علمی تحقیق کا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟ کبھی تو اس نے اس فیصلے کو تسلیم کرلیا جس پر دہلی اور لکھنؤ کا اتفاق تھا کبھی دونوں کے

اختلاف سے فائدہ اٹھا کر 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر عامل ہوگیا اور
کبھی بحیثیت ثالث خود اپنا نظریہ پیش کر کے اس پر قائم رہا۔ اس
طرح آگرہ کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا عطر یا نچوڑ
کہنا چاہیے اور آگرہ کی شاعری کو لکھن اور دہلی کی شاعری کا تجزیۂ
بہتر، اس کا ثبوت اکبر آباد کے قدیم مشاہیر شعرا کا کلام ہے جس
میں زبان ومحاورات، اسلوب بیان، غرض کہ ہر انداز متوسط اور
معتدل پایا جاتا ہے۔ آگرہ اسکول اسی لسانی وذہنی اعتدال کی
تعلیم وتبلیغ کا ایک ادارہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی آج دہلی
اور لکھنؤ کی طرح مشہور اور ان دونوں اسکولوں سے زیادہ مقبول
ہے''۔ (۲۹)

اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آگرہ اسکول دبستان سیماب کا ہی ایک روپ ہے پھر بھی اس اسکول کے جو خط وخال آگے اُبھر کر آئے وہ اتنے وقیع ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے بعد رام پور، عظیم آباد، دکن اور لاہور اسکولوں کی طرح آگرہ اسکول کو تسلیم نہ کیے جانے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ ہمارے ناقدان ادب نے تو کسی بڑے نام یا اس کے کام سے متاثر ہوکر ادارۂ خیال یا اسکول کا عام طور پر دعویٰ کیا، یہ ایک الگ بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ سیماب نے جس آگرہ اسکول کا تصور دیا وہ عہد بہ عہد رونما ہونے والے ادبی اور فکری تغیرات سے عالم وجود میں نہیں آیا یا پھر اسے محسوس ہی نہیں کیا گیا بلکہ خود انھیں اس کی باقاعدہ تشکیل کرنی پڑی۔ انھوں نے کئی نکات، اصول وضوابط اور نظریات قائم کیے جن پر آگرہ اسکول کی اساس ہے اور جو ماضی کے شعرائے اکبر آباد کے افکار واطوار کی روشنی ہی میں مرتب کیے گئے لیکن ان میں عصری مزاج، ماحول اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس طرح ایک جدید نظام بنانے کی شعوری کوشش کی گئی۔

اردو کے قدیم رجحانات اور رویوں سے انحراف بظاہر کوئی نئی چیز نہیں تھی کہ سیماب سے قبل الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور علامہ اقبال نے اس جانب توجہ فرمائی تھی لیکن ان میں اور سیماب یا آگرہ اسکول کے نظریات میں بہت فرق تھا۔ ان اکابرین نے مغربیت کی تیز آندھیوں سے متاثر ہو کر ادبی منظر نامے میں تبدیلیوں، نیز مغربی اذہان وافکار کو قبول کرتے ہوئے جدید مکتبِ خیال کی تشکیل کی کوشش کی جب کہ آگرہ اسکول نے ان متاثر کن مغربی اذہان وافکار کے چند محاسن کو پسند ضرور کیا لیکن ان سے مرعوب ہونے کے بجائے مشرقی علوم اور اذہان وافکار کی وکالت کی اور ہندوستانی اخلاقیات پر خاصا زور دیا۔ آگرہ اسکول کے نظریات میں وطن پرستی کے ساتھ ترقی کو اہمیت دی گئی اور مغربی ادب کے مقابلے میں ہندوستانی ادب اور خصوصاً اردو ادب کو قائم کرنے کے خواب دیکھے گئے۔

آگرہ اسکول کی چند دیگر خصوصیات اور امتیازات بھی ہیں جو بہت زیادہ تفصیل کے متقاضی ہیں لیکن یہاں بالاختصار ان کا صرف ذکر کر سکوں گا۔ آگرہ اسکول نے صرف شاعری پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ افسانہ، ڈراما، ناول، انشائیہ، تنقید، تحقیق، غرض سبھی اصناف ادب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ اہمیت دی اور ہیئت کے تجربوں کو ضروری قرار دیا۔ غزل کے اخلاق سوز اور فرسودہ موضوعات پر کراہیت اور بے زاری کا اظہار کیا۔ عروض کی غیر ضروری پابندیوں کی مخالفت کی۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کو تفریح گاہ کے بجائے تربیت گاہ بنانے پر زور دیا۔ فنِ شاعری کو عربی اور فارسی کے اصول وضوابط سے آزاد کر کے ہندوستانی ماحول ومزاج کے مطابق نئے سرے سے مرتب کر کے اسے خالص اردو عروض بنانے کی جانب توجہ دلائی۔ سبھی مذاہب کو اہمیت دی گئی اور مذاہب اور روحانیت کو صالح اخلاقیات کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ زبان میں نئی تراکیب اور اختراعات پیش کیں اور متروکات کی بھی ایک فہرست جاری کی۔ دیگر علوم مثلاً نفسیات، فلسفہ، منطق اور تاریخ کو اصناف ادب اور خصوصاً

شاعری میں جگہ دی اور تخلیق ادب میں موجودہ سیاسی وسماجی حالات وواقعات کو بھی اظہارِ ذات کے ساتھ ضروری گردانا اور مطالعے کو تخلیق سے زیادہ اہمیت دی۔

ان نظریات کی تفہیم وتوسیع کے لیے 'قصر الادب' کے رسائل واخبارات میں کئی مضامین شائع ہوئے اور سیماب نے آگرہ اسکول سے وابستہ افراد کی رہنمائی کے لیے کتابیں لکھیں بلکہ اپنے ادبی کاموں اور شاعری کو مکمل طور پر آگرہ اسکول کے امتیازات اور افکار کی روشنی میں ڈھالا۔

آخری ایام، علالت وانتقال

معاشی اور وسیع تخلیقی سرگرمیاں علامہ سیماب اکبرآبادی کی جسمانی صحت پر اثر انداز ہوئیں۔ان کی زندگی کے آخری دس برس ضعیفی کے باوجود گوناگوں مصروفیات سے عبارت ہیں۔بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت، مشاعروں میں شرکت، منظوم تراجم، تلامذہ کی اصلاحیں، رسائل کی اشاعت وغیرہ نے علامہ سیماب کو مختلف عوارض میں مبتلا کر دیا تھا۔حالانکہ تاج کمپنی کی دعوت پر علامہ نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ ۱۹۴۴ میں مکمل کرلیا تھا، تاہم اس غیر معمولی کارنامے کی تکمیل تک ادبی معرکوں اور ادبی مباحث کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اسے کلامِ پاک کا معجزہ کہیے کہ علامہ کی زندگی یکسر بدل گئی۔اب ادبی معرکوں اور مباحث کی جگہ تصنیف وتالیف اور ذاتی کتابوں کی اشاعت نے لے لی۔انھیں ساتھ ہی ساتھ اس بات کا شاید احساس بھی ہونے لگا کہ ان کی زندگی کے دن اب زیادہ نہیں۔اس کا اظہار ماہنامہ 'شاعر' کے شمارے اپریل ۱۹۴۴ بعنوان 'تفویض' کے اعلان سے ہوتا ہے:

> ''اب میں اپنی کہولت، اعصابی اور فطری اضمحلال سے معذور ہوکر مجبور ہوں کہ اصلاحِ کلام سے دست کش ہوجاؤں...اس لیے اس اعلان کے بعد میرے وہ تلامذہ جومحتاجِ اصلاح ہیں،

میرے پاس اپنا کلام اصلاح کے لیے نہ بھیجیں، بلکہ میرے ان
تلامذہ کے پاس بھیجیں جو فارغ الاصلاح ہیں''۔ (۳۰)

حالانکہ اس شمارے میں ایسے ۹۳ فارغ الاصلاح تلامذہ کی فہرست مع نام و پتہ شائع کردی تھی، پھر بھی نہ تو علامہ اس فیصلے پر قائم رہ سکے اور نہ ہی ان کے مخصوص شاگرد۔ یوں یہ سلسلۂ اصلاحِ سخن آخری دم تک جاری رہا۔

علامہ سیماب قرآن پاک کے منظوم ترجمے 'وحی منظوم' کی اشاعت کے لیے کافی مضطرب تھے۔ اُس دور میں مذہبی کتابوں کے لیے مشہور ادارے تاج کمپنی (پاکستان) سے ان کی مراسلت بھی تھی۔ اس کام کے لیے وہ دہلی سے ہوتے ہوئے براہِ راست لاہور چلے گئے۔ ناشرین سے گفتگو کے بعد ہفتے عشرے میں واپس لوٹنے کا ارادہ بھی تھا۔ ۱۶/اگست کو لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی کی شاخ تو لاہور میں ہے لیکن صدر دفتر کراچی میں ہے لہٰذا کراچی چلے گئے۔ وہاں ان کے تقریباً چالیس شاگرد موجود تھے۔ اس حوالے سے وہ ضیا فتح آبادی کو لکھتے ہیں:

''جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں وہ کام اب تک نہیں ہوا اور اسی کی تگ ودو میں لگا ہوا ہوں۔ لاہور میں تاج کمپنی کی صرف برانچ ہے، مرکزی دفتر کراچی میں ہے۔ اس لیے لاہور سے یہاں چلا آیا ہوں اور تاج کمپنی والوں سے برابر قرآن مجید کے ترجمہ کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں۔ چونکہ کام اہم اور بڑا ہے اس لیے وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ جب ملتا ہوں دو چار روز کے لیے ٹال دیتے ہیں اور میں نے سوچا ہے کہ ترجمہ کا آخری فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ آخر کب تک انتظار ہی انتظار میں اتنی قیمتی چیز کو معرضِ التوا میں پڑا رہنے دوں''۔ (۳۱)

قیام کراچی کے اور بھی اسباب تھے۔ حامد اقبال صدیقی اپنی کتاب ''سیماب اکبر آبادی'' میں لکھتے ہیں:

''اثنائے قیام لاہور میں یکا یک اطلاع ملی کہ مظہر حسین سلمہٗ (چھوٹے فرزند) مع اپنی والدہ اپنی بیوی اور بھانجی کے براہِ بمبئی کراچی پہنچ رہے ہیں۔ یہ اطلاع میرے لیے پریشان کن تھی اور میں آگرہ جانے کے بجائے کراچی آنے پر مجبور تھا۔ مظہر حسین مجھ سے پہلے کراچی پہنچ گئے اور مجھے کئی تار دیے کہ میں فوراً کراچی پہنچوں، پہنچا''۔ (۳۲)

اپنے وقت کی ایک عبقری شخصیت کی موجودگی کراچی کے اہل علم وادب کے لیے یقیناً مسرت کا باعث تھی۔ حکومت نے بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک مکان اور ایک دکان الاٹ کردی۔ علامہ کے چھوٹے صاحبزادے مظہر صدیقی مرحوم نے فوراً کتابوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ علامہ کے کام کرنے کی عادت یہاں بھی بدستور رہی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ کو اپنے فرزند مظہر مرحوم کی ادارت سے رسالہ 'پرچم' کا اجرا کیا۔ 'پرچم' کا خاص کالم 'علیہ ما علیہ' خاصا مقبول ہوا۔ اس میں اپنے معاصر علامہ نیاز فتح پوری کے ان اعتراضات کے جوابات ہوتے تھے جو 'نگار' میں شائع ہوتے تھے۔ علامہ کا یادگار رسالہ 'شاعر' اور مکتبہ 'قصر الادب' آگرہ میں تھے اور سیماب کراچی میں۔

اردو مصادر پر روزانہ ریڈیو پاکستان سے علامہ کی تقریر نشر ہوتی تھی جس کا معاوضہ ان کے لیے معاش کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ انھوں نے کراچی میں بھی اپنے اختراعی ذہن کی بدولت اولین ادارہ 'جامعہ ادبیہ' قائم کیا جس میں فن شاعری، نثر نگاری، صرف ونحو اور صحافت کی تربیت ہوتی تھی۔ وہاں بھی شعر گوئی اور اصلاح سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ عمر کے اختتامی دور میں ہونے کے باوجود علامہ نے اپنی سرگرمیوں سے ادبی فضا میں حرارت پیدا کی۔ 'انجمن ترویج اردو'

کا قیام عمل میں آیا اور اس کے تحت ہر ماہ ان کے مکان پر طرحی و فی البدیہہ مشاعروں اور ادبی جلسوں کا اہتمام ہوتا رہا۔ اتنی متحرک اور فعال زندگی کے باوجود علامہ اپنے آبائی وطن کی یاد اور محبت دل سے بھلا نہ پائے۔ چنانچہ ۳؍مئی ۱۹۴۹ کے خط میں ضیا فتح آبادی کو لکھتے ہیں:

''محترمی ڈاکٹر سیتارام بالقابہ ہائی کمشنر انڈیا سے یہاں ایک ادبی اجتماع میں ملاقات ہوئی، فرمایا، سیماب صاحب کیا اب آپ سے ہم بالکل محروم ہو جائیں گے؟ کتنا دل آویز دردانگیز استفسار تھا۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ دل بھر آیا۔ میں نے عرض کیا میں پہلے ہندوستانی ہوں اور اس کے بعد سب کچھ ہوں۔ بین الاقوامی شاعر ہوں۔ مجھے نہ ہندوستان سے بیر ہے نہ پاکستان سے۔ آب ودانہ یہاں لے آیا ہے۔ جب چاہوں گا پھر ہندوستان چلا جاؤں گا.... نہ میں ہندوستان کو بھول سکتا ہوں اور نہ ہندوستان مجھے''۔ (۳۳)

علامہ کی آگرہ سے کراچی منتقلی کے پس پشت جو تحریک تھی (یعنی 'لوح محفوظ' کی اشاعت تاج کمپنی سے) وہ تو کامیاب نہ رہی۔ البتہ تاج کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے سیرت النبیؐ تحریر کرنے کی فرمائش کر دی۔ ہر چند علامہ نے اصرار کر کے کہا بازار میں اس عظیم الشان موضوع پر کئی جامع اور مبسوط کتب موجود ہیں، جن علما نے انھیں تصنیف کیا ہے میں ہرگز ان کے برابر نہیں۔ مگر وہ نہ مانے بالآخر علامہ نے حامی بھر لی۔ اس سے قبل ان پر فالج کا بھی حملہ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود قرآن پاک کے منظوم ترجمہ 'وحی منظوم' کے بعد اللہ نے علامہ کو اس سعادت سے بھی سرفراز فرمایا اور دو ماہ میں جامع 'سیرت النبیؐ' تحریر ہوئی جسے تاج کمپنی نے کمال اہتمام سے شائع کر دیا۔ یہی علامہ کی آخری تصنیف تھی۔

علامہ سیماب نے اپنی زندگی کے آخری مشاعرہ منعقدہ ۳۰؍دسمبر ۱۹۴۰ میں شرکت کی۔

اس مشاعرہ کا اہتمام ’بزم سیماب کراچی‘ نے کیا تھا جس کی صدارت حضرت حفیظ ہوشیار پوری نے فرمائی تھی۔ اس دور میں آگرہ، دہلی، لاہور، کراچی اور دیگر کئی بڑے اہم شہروں میں ’بزمِ سیماب‘ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ مشاعرے کے اگلے ہی روز سیماب پر فالج کا دوبارہ حملہ ہوا، لیکن اس بار حملہ شدید تھا۔ الفاظ اٹک اٹک کر ادا ہورہے تھے۔ اس وقت علامہ سیماب اکبرآبادی کے دوصاحبزادگان سجادحسین صدیقی اور مظہرحسین صدیقی ان کے پاس تھے۔ بڑے دوفرزند، منظرصدیقی اوراعجاز صدیقی آگرہ میں ’قصرالادب‘ اور رسالہ ’شاعر‘ کی ادارت واشاعت میں مصروف تھے۔ علامہ فالج گرنے سے قبل ہی شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ زبان میں لکنت کے ساتھ ہاتھوں میں بھی قوت باقی نہ رہی اور سوادِ خط اس حد تک بگڑ گیا کہ اسے سمجھنا بھی محال تھا۔ اپنے وقت کے کئی نامور ڈاکٹروں اور معالجوں نے علامہ کا علاج کیا۔ ایلوپیتھی کے علاوہ حکیم عبدالحمید مرحوم اوران کے برادر حکیم محمد سعید مرحوم (ہمدرددواخانہ) نے یونانی علاج بھی آزمایا مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔ عام لوگوں کے علاوہ مشاہیر، ادبا وشعرا بھی علامہ کی عیادت کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے ان کے ہاں جاتے رہے۔ ان مشاہیر میں مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، ساغرنظامی، شکیل بدایونی، مولانا ماہر القادری، نہال سیوہاروی، رئیس احمد جعفری اور ضیا الدین برنی، راغب مرادآبادی، ذوالفقار علی بخاری وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی علالت میں بھی شعرگوئی کا عمل جاری تھا۔ لکنت کے ساتھ اپنے فرزند مظہرصدیقی مرحوم کو املا کرادیتے تھے۔ ان اشعار میں موت کے قدموں کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے۔ جیسے:

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

علالت کے تفصیلی حالات ماہنامہ ’پرچم‘ کے تعزیت نمبر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انھیں مظہرصدیقی مرحوم نے قلم بند کیا تھا۔ اس دوران علامہ کے منجھلے صاحبزادے اعجاز صدیقی مرحوم

بھی اپنے والد کے پاس کراچی چلے گئے تھے۔لیکن اپنی بے پناہ مصروفیت، رسالہ 'شاعر' کی اشاعت اور اپنے کاروافکار کے سبب کچھ دنوں میں ہی واپس آگرہ آنا پڑا۔ ملاقات پر اعجاز سے علامہ نے جو کچھ کہا ان جملوں سے ان کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اعجاز صدیقی مرحوم اپنے رسالہ 'شاعر' میں لکھتے ہیں:

''اعجاز حسین...مصائب سے گھبرانا نہیں...خوداعتمادی سے کام لینا...میرے مشن کو جاری رکھنا...میری تحریروں کو آگے بڑھانا... میرے تمام شاگردوں کو متحد کرنا... میری بقیہ کتابوں کو مرتب کر کے چھپوانا...تم...تم...تم ذمہ دار ہو...اللہ تمہاری مدد کرے... میں کراچی میں مرنا نہیں چاہتا، مجھے آگرہ لے چلو'۔ (۳۴)

لیکن بقول شاعر:

موت سے کس کو رُستگاری ہے ۔۔۔ آج وہ کل ہماری باری ہے

آخر ۳۱ر جنوری ۱۹۵۱ بروز بدھ صبح گیارہ بجے اردو کا ایک عظیم شاعر اور نثر نگار اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**۔ کراچی ہی میں ان کی تدفین ہوئی اور کتبے پر ان ہی کا یہ شعر کندہ کرایا گیا:

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی ۔۔۔ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

برصغیر ہندو پاک کے ریڈیو اسٹیشنوں سے یہ خبر نشر ہوئی کہ آج علامہ سیماب اکبرآبادی انتقال کر گئے۔ ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں دکھ کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں ملکوں کے اردو، انگریزی اخبارات میں تعزیتی خطوط اور مضامین شائع ہوئے۔یہ سارے خطوط بنام منظر صدیقی، اعجاز صدیقی اور مظہر صدیقی 'پرچم' کے تعزیتی ادبی ایڈیشن میں شائع ہو چکے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے اٹھ جاؤں گا میں ۔۔۔ دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

حواشی

(۱) کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصرالادب، آگرہ، ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۱

(۲) ذکر سیماب، ضیا فتح آبادی، بزم سیماب نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۱۶

(۳) سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹ء ص ۱۲

(۴) ایضاً: ص ۱۱

(۵) کلیم عجم (شعرالحیات) سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصرالادب، آگرہ، ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۱

(۶) ایضاً، ص ۱۶۱

(۷) رسالہ شاعر مضمون سیماب اکبرآبادی (مختصر سوانح) از اعجاز صدیقی، ۱۹۷۹ء، ص ۹

(۸) افتخار امام صدیقی سے انٹرویو، از مقیم احمد، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۷

(۹) افتخار امام صدیقی سے انٹرویو، مقیم احمد، ۲۶ دسمبر ۲۰۱۷

(۱۰) 'وحی منظوم' مترجم سیماب اکبرآبادی، مشمولہ مضمون از مظہر حسین صدیقی، سیماب اکاڈمی، پاکستان ۱۹۸۱ء، ص ۲

(۱۱) بحوالہ سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۱

(۱۲) ایضاً ص ۱۲۲

(۱۳) ایضاً، ص ۱۲۳

(۱۴) ذکر سیماب، ضیا فتح آبادی، بزم سیماب نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۳۵

(۱۵) بحوالہ سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۲

(۱۶) ایضاً، ص ۱۲

(۱۷) ایضاً، ص ۱۹، ۲۰

(۱۸) ذکر سیماب، ضیا فتح آبادی، بزم سیماب نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۲۰، ۲۱

(۱۹) اصلاح الاصلاح، ابر احسنی گنوری، مرتضیٰ برقی پریس، رامپور ۱۹۴۹، ص ۱۶ تا ۱۹

(۲۰) سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۲۵

(۲۱) کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۳۶ ص ۱۶۴

(۲۲) ایضاً، ص ۱۶۴

(۲۳) بحوالہ سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۲۴

(۲۴) شاعر (ماہنامہ) آگرہ، اعجاز حسین صدیقی، نومبر ۱۹۶۵

(۲۵) ذکر سیماب، ضیا فتح آبادی، بزم سیماب نئی دہلی ۱۹۸۴، ص ۵۷

(۲۶) سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۴۱

(۲۷) بحوالہ سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۴۳

(۲۸) کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، مطبوعہ رفاہ عام پریس، آگرہ، بار اول ۱۹۳۶، ص ۱۰۵

(۲۹) دستور الاصلاح: سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، بار اول ۱۹۴۰، ص ۱۰، ۱۱

(۳۰) رسالہ شاعر بعنوان تفویض از سیماب اکبرآبادی، اپریل، آگرہ، ۱۹۴۴

(۳۱) ذکر سیماب، ضیا فتح آبادی، بزم سیماب نئی دہلی ۱۹۸۴، ص ۶۶

(۳۲) سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۱۱۳، ۱۱۴

(۳۳) بحوالہ سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی ۲۰۰۹، ص ۱۱۴، ۱۱۵

(۳۴) رسالہ شاعر 'مضمون' پیارے اباجی' از اعجاز صدیقی، اپریل ۱۹۵۱، ص ۷، ۸

باب دوم

سیماب اکبرآبادی کی شاعری

غزل اردو ادب کی سب سے مقبول اور ہر دل عزیز صنف سخن ہے، اس کے باوجود اس صنف پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس کو بے وقت کی راگنی کہا اور غزل کی اصلاح کے لیے مشورے دیے۔ عظمت اللہ خاں نے غزل کی گردن بے تکلف اڑا دینے کی بات کہی اور کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔ لیکن غزل حالات کے ساتھ ساتھ بدلنے، خود کو ہر ضرورت اور زمانے کے مطابق ڈھالنے، ہر خیال اور جذبے کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کا ثبوت فراہم کرتی رہی۔ سیماب اکبرآبادی، داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور مولانا الطاف حسین حالی کے خیالات سے پوری طرح واقف اور بڑی حد تک متفق تھے۔ وہ بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ غزل میں ایسے موضوعات پیش کیے جائیں جن سے قوم میں بیداری پیدا ہو سکے۔ انھوں نے غزل کی گردن اڑا دینے کی بات تو نہیں کی لیکن وہ اس کے آہنگ میں ترمیم ضرور چاہتے تھے۔ انھوں نے غزل کے قدیم رنگ سخن کو بے فصل کا نغمہ قرار دیا:

سیماب غزل گوئی اب اس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اک نغمہ بے وقت کی شہنائی

سیماب اکبرآبادی نے غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق موضوعات کو داخل کیا اور اس صنف کو غیر ضروری پابندیوں سے آزاد کیا۔ سیماب نے ندرت خیال، جدت بیان اور شگفتہ طرز ادا سے اپنی شاعری کو نئی آب و تاب بخشی۔ ان کی شاعری داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ سیماب خود کہتے ہیں:

فکر کو سیماب آزادی کی دے کر وسعتیں
مرتبے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیے

سیماب اکبرآبادی نے بہت کم عمری میں شعرگوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب عموماً

اردو غزل وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ غزل کے اجزائے ترکیبی گل وبلبل، شمع و پروانہ، سرو وقمری، شراب وشباب اور شانہ وزلف وغیرہ تھے۔ اردو غزل قدیم فارسی غزل کی روایات وخصوصیات سے باہر نہیں نکل سکی تھی اور ان ہی روایتی موضوعات کو نئے زاویے دے کر زبان کے کمالات دکھا کر غزل کہنا ہی فن کمال سمجھا جاتا تھا۔ تخیل پر تغزل کو فوقیت تھی۔ مذہب اور تصوف کے موضوعات کو برتا جانے لگا تھا لیکن اس میں بھی عمومیت تھی۔ ایسے ہی ماحول میں سیماب اکبرآبادی نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں انھوں نے بھی غزل کے مروجہ مزاج کو اپنانے کی کوشش کی ہوگی، لیکن وہ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی اس روایتی غزل گوئی سے بے زار تھے۔ وہ ان شعرا کو پڑھنا پسند کرتے تھے جنھوں نے غزل میں نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کی، خصوصاً غالب ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ اس وقت شاعروں کی واہ واہ اور عام داد وتحسین شعرا کے لیے بڑی نعمت ہوا کرتی تھی۔ ایسے ماحول میں اگر ایک طالب علم نئی روش تلاش کرنے کی کوشش کرے اور فرسودہ ماحول ومزاج سے خود کو بچانا چاہے تو وہ اس کی جدت پسند طبع ہی کہلائے گی۔ سیماب نے بھی اپنی جدت پسندی ہی کو اپنا رہنما کیا۔

سولہ سال سے بیس سال کے درمیان انھوں نے ویسی ہی غزلیں کہیں جیسا اس عہد کا مزاج تھا۔ داغ دہلوی کی تربیت کا اثر بھی ان پر واضح طور پر ہوا۔ وہ تمام قدیم موضوعات اس دور میں ان کی غزلوں میں موجود تھے جو عام شاعری کا مطمح نظر تھے یعنی معاملہ بندی، ہجر ووصال، گل وبلبل، شمع و پروانہ اور قفس وآشیانہ وغیرہ، متانت اور سلیقہ، صاف زبان، سادہ اور بے تکلف طرز تغزل سے داغ دہلوی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دور بہت طویل نہیں تھا۔ مطالعہ، شاعروں کی شرکت، ملازمت اور ذمہ داریوں کے احساس نے جلد ہی سیماب کے شعری رویوں میں تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اب ان کی غزلوں میں واردات واحساسات، الفاظ کا شکوہ اور بصیرت میں وسعت پیدا ہوگئی۔ زبان وبیان کی حلاوت، محاورات کا صحیح محل، جدید

تراکیب اور جذبات کی گہرائی ان کی ریاضت کو ثابت کرتی ہے بلکہ ان کی شاعری پر بعض جگہ غالب کی تقلید کا گمان ہوتا ہے اور وہ اپنے استاد داغ دہلوی کے قدیم رنگ سخن سے بہت مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب سیماب اکبرآبادی کا شمار ہندوستان کے اہم استاد شعرا میں ہونے لگا تھا اور سیکڑوں ہندی شعرا ان کے زیر ترتیب شعری سفر کی ابتدا کر چکے تھے۔ اب ان کے مزاج نے اس فرسودہ شعری نظام میں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

(الف) بحیثیت غزل گو

کلیم عجم (۱۹۳۶)

سیماب اکبرآبادی نے 'کیمیائے سخن' کے نام سے اپنے ابتدائی دور کی غزلوں کا دیوان مرتب کر لیا تھا، لیکن شاید وہ 'کیمیائے سخن' کی غزلوں سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے 'کیمیائے سخن' کو شائع نہیں کرایا اور نئے دور کی غزلوں کا ایک ضخیم دیوان 'کلیم عجم' کے نام سے ۱۹۳۶ میں شائع کرایا۔ البتہ 'کلیم عجم' میں 'صہبائے کہن' کے ذیلی عنوان سے 'کیمیائے سخن' کا کچھ کلام منتخب کر کے شامل ضرور کیا تا کہ پرانے شعری مزاج کا اندازہ لگایا جا سکے۔ سیماب کی 'کیمیائے سخن' کی غزلوں سے بے اطمینانی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 'کلیم عجم' کی اشاعت کے بعد انھوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ ان کا جو کلام 'کلیم عجم' میں شامل نہیں، اسے ان کے نام سے منسوب نہ کیا جائے، نہ کہیں شائع کیا جائے اور نہ ہی گلوکار اسے گائیں۔

'کلیم عجم' کی اشاعت نے اس دور کے ادبی منظرنامے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب سیماب کی شہرت پورے عروج پر تھی لیکن ساتھ ہی ان کے معاصرین میں بھی کئی اہم اور

با کمال شعرا کا بھی شہرہ تھا اور اتنے بڑے بڑے ناموں کے بیچ اپنی انفرادیت منوانا آسان نہیں تھا۔ مغربی افکار پورے معاشرے پر اثر انداز تھے۔ شعر و ادب بھلا ان سے کیسے بچ سکتا تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی، ہندوستان کی قدیم روایات سے بیزاری کا کھل کر اظہار ہونے لگا تھا، آزادی کے متوالے بھی اپنی کوششوں کو تیز کر چکے تھے اور ملک ایک عظیم انقلاب کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ سیماب اکبر آبادی بھی ان فن کاروں میں تھے جو سیاسی، سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انقلاب کے حامی تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ مشرقی روایات کے حامی تھے اور مغربی نظریۂ حیات اور فلسفے کو پوری طرح اپنانے کے مخالف۔ انھیں اندازہ تھا کہ اردو غزل فرسودگی اور لفاظی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، لہٰذا انھوں نے غزل کے ماحول و مزاج کو تبدیل کرنے کے لیے نئی لفظیات، نئے استعارات، نئی تراکیب اور نئے فکری رویوں کو اشعار میں پرونے کی کوشش کی اور بازاری شاعری سے ہٹ کر شعر مہذب کی راہ نکالی۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ انھوں نے غزل کی قدیم روایات سے یکسر انحراف کیا بلکہ ان روایات کے محاسن کی پاس داری اور حفاظت بھی کی اور ان سب نے مل کر ایک نئے لب و لہجے کا روپ اختیار کر لیا جو 'کلیم عجم' کی شکل میں سامنے آیا اور یہی لب و لہجہ سیماب اکبر آبادی کو اس عہد کے غزل گو شعرا میں ممتاز مقام عطا کر گیا۔

''کلیم عجم'' کے ابتدائی صفحات میں ''میرے شعری معتقدات'' کے تحت خود سیماب نے اپنی شاعری کے بارے میں واضح اشارہ کیا ہے:

> ''...میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں ایسی شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض

اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاصل حسن
اور مرکز محبت ہو۔ جس طرح علم شاعری کے لیے ضروری اور
لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم وملزوم سمجھتا
ہوں اور خیالات میں تصنع یا بناوٹ کا حامی نہیں۔ میں خیالات کو
صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی واردات قلب
کی ترجمانی میرا مسلک بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصناف سخن پر
فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار
خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا
ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید
ہوں، ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ
اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔'' (۱)

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد ہم آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن وعشق کے شاعر تھے، تبھی تو سیماب کی غزلوں کے اہم موضوعات میں حسن وعشق کا موضوع خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ سیماب جب اپنی غزلوں میں عشق ومحبت کی باتیں کرتے ہیں تو سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات پر مبنی تاثرات کا طوفان اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہر صاحب نظر اس پر وجد کرتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ محبت ہی سے ہے ضد سب کو
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

☆

مزاجِ حسن میں تبدیلیاں پیدا نہیں ہوتیں
محبت گا رہی ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

☆

آنکھوں کو اپنی چوم لوں امکان ہو اگر
ان میں مزہ بھرا ہے تو ترے انتظار کا

☆

اسی سے روشنی پھیلی بساطِ بزم امکاں پر
محبت اک بڑا احساس ہے تاریخ انساں پر

☆

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب اکبرآبادی کی عشقیہ شاعری کا رنگ، روایت سے قدرے مختلف ہے۔ان کے یہاں عشق کا لفظ نئے معنی پیدا کرتا ہے۔وہ جب اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی روایتی یعنی محبوب سے عشق نہیں بلکہ مقصد سے عشق ہے۔اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خود مجھ کو انتظار کی لذت میں کھو دیا
اب خود تڑپ رہے ہیں مرے انتظار میں

☆

بھڑک کر حسن خاکستر بنا دے ساری دنیا کو
جو بھولے سے بھی کہہ دوں میں، مجھے کس سے محبت ہے

☆

محسوس کر رہا ہوں انھیں دل میں دیکھ کر
جیسے ہے کائنات مرے اختیار میں

'کلیم عجم' کی پہلی غزل ۱۲۲ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

عروس فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیر نقاب تیرا

یہ مطلع جہاں حمد یہ ہے، وہیں اس کے استعاروں میں شباب، جمال اور نقاب کے استعمال سے اللہ کے تین اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ازل سے بھی پہلے اور ابد کے بعد بھی اللہ کی وحدانیت اور اس کی نورانیت کا قائم رہنا، شباب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ عروس فطرت سے اس کائنات کا تغیر و تبدل ظاہر ہوتا ہے۔ لطیف پردے یعنی چشم ظاہر سے نظر آنے والے نازک و جمیل پردے جن کے پیچھے وہ ازلی و ابدی نور چھپا ہوا ہے اور نقاب بہ معنی اس کا مستور ہونا ہے کہ وہ بظاہر پردے میں ہے تاہم وہ عیاں بھی ہے اور دیکھنے اور سننے والا یعنی سمیع و بصیر بھی ہے۔

مذکورہ غزل کا مقطع بھی بڑا معنی خیز اور اجتہادِ سیماب کا غماز ہے:

ہے روحِ سیماب ساز تیرا، تو سوز بن کر نہاں ہے اس میں
تڑپ رگ جاں میں ہے یہ کس کی؟ اگر نہیں اضطراب تیرا

مقطع میں ساز، سوز، رگ جاں اور اضطراب جیسے استعارے تصوف کی وہ علامتیں ہیں جن سے جذب و کشف کے مدارج طے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ربط ظاہر ہوتا ہے۔

بقول سید عبداللہ:

''ابتدائی غزلوں میں روایتی رنگ موجود ہے لیکن وہاں بھی تجربے اور مشاہدے نے درد کی کسک پیدا کر دی ہے۔'' (۲)

سیماب نے کلاسیکی شعرا کے علاوہ فارسی زبان کے مشاہیر شعرا کا بھی عمیق مطالعہ کیا، لیکن ان کے خیالات کو اپنی شاعری نہیں بنایا۔ البتہ فارسی تراکیب اور استعاروں، رمز و کنایہ، تشبیہات وغیرہ کا ادراک رکھتے ہوئے اپنی لفظیات میں شعری تخلیقات پیش کی ہیں اور یہی ان کی غزلیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

'کلیم عجم' کی ہر غزل تنقیدی تجزیہ چاہتی ہے بلکہ مکمل دیوان (الف تا ی) ایک مبسوط

مقالے کا متقاضی ہے کہ سیماب کی غزلیہ شاعری میں جہاں غزل، عصری حیثیت، نت نئی شعری تراکیب دیکھنے کوملتی ہیں، وہیں عرفان و آگہی اور عشق حقیقی بھی موجود ہے اور ان تمام محاسنِ سخن نے علامہ کی غزلوں کو نہایت ہی اعلیٰ وارفع مقام عطا کیا ہے۔ حالانکہ وہ نظم کے بلند قد وقامت والے شاعر ہیں، تاہم انھوں نے اپنی غزل کو نظم کے پرتو سے بچائے رکھا۔لیکن نظمیہ شاعری میں کہیں کہیں غزل کا لہجہ واسلوب در آیا ہے اور وہ بھی عصری حیثیت سے مملو ہے:

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

علامہ سیماب کا ایک مشہور اور ضرب المثل شعر ملاحظہ کیجیے:

یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

اوپر کے اول الذکر شعر میں ۱۹۰۰ میں ہندوستانی سیاست کا خلفشار، جنگ آزادی کے لیے جدوجہد اور انگیریزوں کا جبر وتشدد غالب ہے۔ دوسرے شعر میں زندگی کی تلخ حقیقت اور ایک فلسفۂ حیات کی عکاسی کی گئی ہے کہ چشم ظاہر سے جو نظر آتا ہے وہ دراصل ہوتا نہیں۔ اس طرح انسان اکثر دھوکہ کھاتا ہے۔ یہ شعر اسی حقیقت سے خبر دار کرتا ہے اور اس حقیقت کو احوال دنیا میں کسی بھی حال پر چسپاں کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ سیاسی حالات ہی کیوں نہ ہوں۔

سیماب اکبر آبادی کا عشقیہ کلام جسم ہی پر نہیں بلکہ براہ راست روح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ان کے غزلیہ کلام میں بیشتر مقامات ایسے ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سیماب حسن وعشق و محبت کے صحیح راز دار ہیں۔ سیماب کی غزل میں حسن وعشق کی پاکیزگی اور فکر وخیال کی ندرت ونفاست کا موثر اظہار ہوتا ہے۔ان کے عشق میں ایک نیا پن، دل کشی، بلندی اور حوصلہ مندی ملتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

☆

رسم ان سے محبت کی ادا بھی نہیں ہوتی
اور اب تو سلیقے سے جفا بھی نہیں ہوتی

☆

یہ کس نے شاخِ گل لاکر قریب آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

☆

پاؤں پھر راہ محبت میں تھکے جاتے ہیں
پھر تمنائے درِ یار رہی جاتی ہے

ان کی محبت کی اس منزل کا ایک راستہ اور بھی ہے جہاں پر عاشق و معشوق کے درمیان کی دوریاں ختم ہو جاتی ہیں اور عبد اور معبود ایک دوسرے سے اتنے قریب تر ہو جاتے ہیں کہ دونوں کی ذات کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا:

ہے حسن اک جھلک مرے عشق تمام کی
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جا رہا ہوں میں

☆

حریم حسن، فردوس محبت، کعبۂ فطرت
خدا جانے وہ کیا کیا ہے جسے میں دل سمجھتا ہوں

☆

یوں تو فتادگی ہے مذاقِ سر نیاز
سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پر ادا ہوا

☆

مری ہستی مری ہستی نہیں ہے
تمھیں تم ہو تو ذکر ماسوا کیا ہے

حسن وعشق کی پاکیزگی اورفکروخیال کی ندرت کا اظہاراس سے زیادہ ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ان اشعار میں جذبے کی صداقت کے ساتھ روحانی کیفیات کا ترفع اوروجد کی ایک کائنات پوشیدہ نظرآتی ہے۔

سیماب اکبرآبادی گرچہ کوئی صوفی شاعرنہیں ہیں لیکن ان کی غزلوں میں تصوف سے معمور خیالات بھی جابجا ملتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ غزلوں میں پیش کردہ تمام افکار ایسے آئے ہیں جو سیماب کی افتادطبع کے عین مطابق ہیں۔دراصل تصوف کا موضوع بذات خود بہت وسیع ہے۔متصوفانہ افکار کے زیراثر بعض دوسرے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جیسے کائنات، خالق کائنات اور ان دونوں کا باہمی رشتہ، وحدت الوجوداوروحدت الشہود، ہمہ اوست اور ہمہ ازاوست، جبروقدر، دنیا کی بےثباتی، فناوبقا، رضا وقناعت وغیرہ۔اس ضمن میں سیماب نے اپنے ایک خطبہ میں درست لکھا ہے:

> ''متصوفانہ شاعری میں ہماری عام اورمجازی مصلحات شاعری کا درجہ روحانیت سے متوازن کردیا گیا ہے۔شراب وساقی کا ذکر اس میں بھی ہے۔ہجروصل کے جذبات اس میں بھی ہیں،کعبہ و دیر کا نام اس میں بھی لیا جاتا ہے۔قفس وآشیاں اس میں بھی داخل ہیں۔لیکن شراب سے مرادشرابِ ذوق وشوق،ساقی سے مرا پیرومرشد، ہجر سے قرب الٰہی کا بُعد اور وصل سے تقرب ونزدیکی کنایہ کی جاتی ہے۔'' (۳)

سیماب اکبرآبادی نہ کوئی صوفی تھے اور نہ ہی فلسفی لیکن غزل کے اس مخصوص مزاج سے بخوبی واقف ہیں کہ صوفیانہ افکاراس صنف کا جزولاینفک رہے ہیں۔اس لیے وہ کائنات میں جو

کچھ دیکھتے ہیں اس کا فنکارانہ اظہار کر دیتے ہیں۔ سیماب کے مسائل تصوف بھی وہی ہیں جن کا اظہار ہمارے ماضی کے شعرا کثرت سے کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ہر شے میں خدا کا عکس و جلوہ موجود ہے۔ وہ دیر و حرم کی کوئی تفریق نہیں کرتے۔ قناعت کے سامنے بادشاہت کا تصور بھی ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا کو بے ثبات تصور کرتے ہیں وغیرہ۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ فرض کیوں نہ قدم پر ترے ادا کرتے
نماز عشق تھی، سجدے زمیں پہ کیا کرتے

☆

حریم عرش، محراب حرم، طاق صنم خانہ
اگر تم ہو نگاہوں میں تو سب کچھ ہے نگاہوں میں

☆

شمع ہو گرمیٔ محفل ہو کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اسے اک رات کا مہماں دیکھا

☆

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

☆

عمر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گذر گئی باقی خیال میں

ان اشعار میں تصوف و سالک سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس موضوع اور اس علم سے متعلق سیماب کے گہرے مطالعے اور شغف و استغراق کی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ وفورِ شوق سے سرشار ہو کر عبادت میں اس طرح ڈوب جانا، صوفیانہ فکر کا وظیفہ ہے۔ عاشق کی معراج تو اسی وقت ممکن ہے جب معشوق کی نظر میں وہ محبوب بن جائے۔ سیماب نے حسن

وعشق کی کیفیات اور وحدت الوجود کی گہرائیوں کو جس خوبصورت اور مترنم انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ ملاحظہ ہو:

عروس فطرت میری نگاہوں میں چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیر نقاب تیرا

☆

زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہے تو
وحدت کی خفتہ کاریوں کو ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

☆

غم عذاب وثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عذاب تیرا

سیماب کا آخری شعر نص قرآنی کے ضمن میں پیش نظر ہے، جو **تعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیءٍ قدیر** کی حقیقت کا ترجمان ہے۔

تصوف میں عاشق ومعشوق، ذرہ وصحرا، قطرہ ودریا اور جز وکل کی مناسبتوں اور خامیوں کا بیان فنکارانہ انداز میں کیا جائے تو ایک طرف سالک پر جذب واستغراق کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور بیان کرنے والے کی عارفانہ عظمت کے تمام گوشے منور ہوجاتے ہیں تو دوسری طرف تربیت یافتہ قاری روحانی ترفع اور وجد کی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے۔ سیماب نے اپنے چھپے ہوئے خزانے، حسن ازل کے مشہور ہونے اور پھر آشکار ہونے پر سالک کی حیرت واستعجاب کا اظہار بڑے نازک طریقے سے کیا ہے:

قطرہ دریا ہے اگر شامل دریا ہوجائے
ذرہ اس بھید کو پاجائے تو صحرا ہوجائے

☆

یہاں ہر جزو میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

☆

مری کیا انتہا ہو، جب نہیں ہے ابتدا کوئی
میں تھا موجود ارادوں میں کسی کے جب نہ تھا کوئی

☆

کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو
تری تلاش میں گمراہ اک زمانہ ملا

☆

برگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ
ہر ذرے کے حجاب میں اک آئینہ ملا

سیماب اکبرآبادی کے صوفیانہ اور فلسفیانہ افکار میں تازگی ہے۔ان کے خیال میں ابہام اور اشکال نہیں ہے اور وہ اپنے تصورات و نظریات کا اظہار بہت واضح طور پر کرتے ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں میں اکثر جگہ صوفیانہ اور رومانی خیالات ہم آہنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے لیے ان کی ایک غزل پیش ہے جس میں رومان و تصوف کا امتزاج صاف طور پر نظر آتا ہے:

چشم ظاہر سے ترا میں نے نظارہ نہ کیا
غیرتِ رشک نے یہ شرک گوارہ نہ کیا
مجھے محروم غم عشق دوبارہ نہ کیا
آپ نے خوب کیا، درد کا چارا نہ کیا
خلوتِ دل نے کیا شمع تمنا کو پسند
انجمن بن کے تجھے انجمن آرا نہ کیا

تو نے دیکھا نہ ہمیں نیم نگاہی سے کبھی
ہم نے پھر بھی تری محفل سے کنارا نہ کیا
ادب آموز تھی پاکیزگی نیت عشق
بے وضو میں نے کبھی ذکر تمھارا نہ کیا
شوق تھا وقت سحر گشت جبیں بوسی کا
تیرہ بختی نے مجھے صبح کا تارا نہ کیا
غیر مشروط معافی مجھے دے دی سیمابؔ
اس نے منظور گناہوں کا کفارہ نہ کیا

سیماب اکبرآبادی جب عشقیہ شاعری اور رومانی تصورات کی پیش کش پر آتے ہیں تو اس میں بھی کمال ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل میں سطحی عشق پیش نہیں کرتے تاہم ان کی غزلیں اعلیٰ رومانی تصورات سے معمور ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں حسن و عشق کا وہ ارضی تصور پنہاں ہے جسے سیماب کی طبیعت کا اہم میلان کہا جا سکتا:

تسکین محبت کے یہ دو ہی طریقے تھے
یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا

☆

عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے
جستجو تیری بڑی بھیڑ میں لے آئی ہے

☆

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(کلیم عاجز)

مرکز پہ اپنے دھوپ سمٹتی ہے جس طرح
یوں رفتہ رفتہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں
محسوس کر رہا ہوں انھیں دل میں دیکھ کر
جیسے ہے کائنات مرے اختیار میں
(سدرۃ المنتہیٰ)

جب کوئی مہر و وفا کا تجھ کو دیتا ہے فریب
دیکھ کر ماضی کی جانب مسکرا دیتا ہوں میں

☆

نگاہِ ابر میں پھول اور کانٹے سب برابر ہیں
محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست دشمن کو

☆

اس کے دل میں جذب کر کے اپنے دل کی دھڑکنیں
حسن کو احساس کے جذبے عطا کرتا ہوں میں
(لوحِ محفوظ)

درج بالا اشعار رومان انگیز تصورات کے آئینہ ہیں۔ سیماب کے ان اشعار میں ایسی ساحرانہ کیفیت موجود ہے جو قاری کو دیر تک مسحور کیے رہتی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے شاعری کی شرطوں میں تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ پر زور دیا تھا۔ جب ہم سیماب اکبرآبادی کے مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو مذکورہ تینوں شرائط بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خاص طور سے مطالعہ کائنات اور وسعت مشاہدہ کے تو ثبوت قدم قدم پر ملتے ہیں۔ سیماب کی غزلوں میں مشاہدات کی وہ دنیا آباد ہے جو کسی شاعر کی کامیابی کا سبب بنتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے حقیقت کی چمن کو جستجو میری طرح
رنگ و بوبھی ہے اسیر رنگ و بو میری طرح
تو بھی ہوسکتا ہے جان رنگ و بو کی میری طرح
پہلے پیدا کر چمن میںآبرو میری طرح
(کلیم عجم)

نہ چھیڑ اے تنگی صحن چمن، پھر لوٹ جاؤں گا
تصور کی نگاہوں میں ابھی صحرا سلامت ہے

☆

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کرے، آرہا ہوں میں
(سدرۃ المنتہٰی)

وہ عرش سے دیتے ہیں اب دعوتِ نظارہ
اے ذوقِ نظر وقت معراج نظر آیا

☆

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ رگ جاں میں رہ گئے
(لوح محفوظ)

سیماب کی غزلوں میں ایسے اشعار کی بھی خاصی تعداد ہے، جو جرأت شوق کے والہانہ اظہار کے سبب حوصلہ مندی کی علامت بن گئے ہیں اور ان سے شاعر کی رفعت وبلندی کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً:

کامیابی کی کوئی تدبیر جب کرتاہوں میں
یہ سمجھ لیتاہوں سر پر آسماں کوئی نہیں

چھوتی نہیں مجھے پر جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اڑا جا رہا ہوں میں

☆

مذکورہ بالا اشعار بلند حوصلہ اور عزم مصمم کی بھر پور شعری کیفیت سے مملو نظر آتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ انسان صرف مجبور نہیں بلکہ قطرہ بھی اپنے اندر دریا کی وسعت رکھتا ہے۔ آخری شعر سیماب کے آہنی ارادے اور پختہ عزائم کی دلیل ہے۔ ہاتھ میں اگر زور انقلاب ہے تو ذروں کو آفتاب سے ٹکرانے سے کوئی نہیں روک سکتا، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سیماب کی فطرت میں ذروں کو آفتاب سے ٹکرا جانے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔

سیماب مذہبی اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے پیرو تھے۔ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ کی عقیدت ومحبت تھی۔ قرآن کریم، احادیث، سیرت رسولؐ اور تاریخ اسلام کا ان کا زبردست مطالعہ تھا۔ ان کی غزلوں میں مذہب اسلام، توحید الٰہی، ہستی باری، سیرت النبیؐ اور باہمی رواداری وغیرہ موضوعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف مآخذ اور اثرات کا شعری اظہار بھی سیماب کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ اللہ ہر چیز کا مالک ہے، اس کے نور کا ظہور ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے، اسی کے رحم وکرم سے دنیا آباد ہے۔ اس موضوع پر سیماب کے یہاں عمدہ اشعار موجود ہیں، ملاحظہ ہوں:

عروس فطرت، مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمالِ زیرِ نقاب تیرا
مری رسائی سے دور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ طور پہ جا کے میں نے اک دن، الٹ دیا تھا نقاب تیرا
اگرچہ صبر آزما بہت ہے، تیری خموشی و پردہ داری
مگر ہے دامن کش عقیدت، سکوت تیرا، حجاب تیرا

جلال وجبروت نے لگا دی ہیں اپنی مہریں لب وزباں پر
ہے کوہ و صحرا کی ہیبتوں میں اشارۂ انقلاب تیرا

سیماب کے ان اشعار میں جو مذہبی پہلو نمایاں ہے وہ مذہبی مآخذ واثرات کی آئینہ داری ہے۔شاعر کا جذبۂ عقیدت خدا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے:

حرم اور دیر کے کتبے وہ دیکھے جس کو فرصت ہے
یہاں حد نظر تک صرف عنوانِ محبت ہے

مقصود بس ذات خدا ہے۔دیر وحرم تو بس ذریعہ ہیں اس تک رسائی کا، پھر شاعر آگے یہ کہتا ہے کہ:

دیتا ہوں داد فطرت حق آشنا کو میں
ہنگامۂ خودی میں نہ بھولا خدا کو میں

جنبش جو دوں نگاہِ حقیقت کشا کو میں
رکھ دوں الٹ کے پردۂ ارض و سما کو میں

سیماب نے جس وقت شعر وشاعری کا آغاز کیا، اس وقت اردو شاعری میں داغ وامیر کا غلغلہ تھا۔ اگرچہ سیماب خانوادۂ داغ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انھوں نے ان کے مزاج واسلوب کو بدلنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس سے الگ ہو کر میر وغالب کے ملے جلے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی اور غزل سے ابتذال ورکاکت کو دور کیا۔ میر وغالب کے پیرو ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں ان اساتذہ کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ مثلاً ان کی غزلوں میں غالب کے اثرات کی کچھ جھلکیاں اس طرح دیکھی جاسکتی ہیں:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

فطرت سے چوک ہوگئی میرے خیال میں
ہلکا سا رنگ عشق بھی ہوتا جمال میں
صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قید محال میں
دنیا کرے تلاش نیا کوئی جامِ جم
اس کی جگہ نہیں ہے مرے جامِ سفال میں

غالب کی غزل 'سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئی' کی زمین میں بھی سیماب نے غزل کہی جس کے دو اشعار ملاحظہ ہو:

کثرتِ تعمیر عالم وجہ بربادی ہوئی
بڑھ گئیں آبادیاں اتنی کہ ویراں ہوگئیں
میں نے جن اینٹوں پر آزادی کی رکھی تھی اساس
میری قسمت سے وہی بنیاد زنداں ہوگئیں

حکیم مومن خاں کے رنگ میں سیماب کی غزل ملاحظہ ہو:

نہ ہو گر آشنا نہیں ہوتا
بت کسی کا خدا نہیں ہوتا
تمھیں اس وقت یاد آتے ہو
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
کچھ محبت ہی سے ہے ضد سب کو
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سیماب کی غزلوں میں حالی کے رنگ کے اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائے گی
گر یوں ہی انسان پیوند زمین سوتا رہا

عمر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی باقی خیال میں

☆

دفعتاً ساز دو عالم بے صدا ہوجائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

سیماب داغ دہلوی شاگرد تھے اس لیے فطری طور پر ان کے یہاں داغ کا بھی اثر موجود ہے۔داغ کے رنگ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اس طرح مجھے ستا رہے ہو
جیسے کہ مرا خدا نہیں ہے

☆

ہر چیز پر بہار ہر اک شے میں حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

☆

وہ شامِ فرقت، آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں
آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی ، ہائے محبت ہائے جوانی
ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں دل کا فسانہ جاگ کے سننا
اپنی کہانی اپنی زبانی، ہائے محبت ہائے جوانی

☆

مٹادو خاک کردو، پھونک دو ،کر دو فنا لیکن
ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے

یہاں اس بات کا اظہار نامناسب نہیں کہ سیماب، داغ کے شاگرد ضرور تھے لیکن ان

کے مقلد نہیں تھے۔ اسی لیے سیماب کا یہ مستقل رنگ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی طبیعتوں کے میلان میں بہت فرق تھا۔ داغ کی شخصیت میں شوخی، رنگینی، بے باکی، جرأت رندانہ اور حسن وشباب کی بے محاباترجمانی ہے۔ ان کے یہاں سنجیدگی، ٹھہراؤ اور غور وفکر کا وہ عنصر موجود ہے، جو اس زمانے کے شعری تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل میں معاون ہوا۔ انھوں نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا تو غزل جدیدیت کی طرف کروٹ بدل رہی تھی اور حسرت، فانی، اصغر، جگر کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ اس لیے سیماب کی شاعری نہ جدید رنگ سے بیر رکھتی ہے نہ قدیم کو یکسر مسترد کرتی ہے۔ وہ دونوں کی اعلیٰ اقدار کی حامل ہے۔ چنانچہ فانی کے رنگ کے اشعار سیماب کے یہاں اکثر نظر آجاتے ہیں:

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہان میں
پچھلا پہر ہے میری شب انتظار کا
دینا مجھے مزید نوید حیات تم
جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لیے ہوئے

اقبال کے رنگ میں سیماب کی متعدد غزلیں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو غزلوں کے نمونے پیش ہیں۔ اقبال کی غزل 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں' کی زمین میں سیماب کی یہ غزل ملاحظہ ہو:

غم عشق سے سرگراں اور بھی ہیں
جہاں ہم ہیں شاید وہاں اور بھی ہیں
کچھ آج اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا
میں سمجھا میرے راز داں اور بھی ہیں
بہت راز دنیا سے میں کہہ چکا ہوں
کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں

میں اپنے نشیمن کی کیا خیر مانگوں
مرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں
اثر سوزِ پروانہ سے لینے والے
یہاں چند آتش بجاں اور بھی ہیں
نہیں میں نوا سنج سیماؔب تنہا
بھرا باغ ہے، نغمہ خواں اور بھی ہیں

اقبال کی دوسری زمین میں سیماب کی درج ذیل غزل بھی ہے:

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

جگر کا رنگ سیماب کی غزلوں میں دیکھئے:

مری رسائی سے دور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ سیماب نے مومن، داغ، اقبال، فانی، جگر وغیرہ شعرا کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ کہ 'کلیم عجم' پر جو تبصرے، آرا اور خطوط ''شاعر'' اور دیگر ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے، بالخصوص سیماب اکادمی (کراچی) نے جو 'کلیم عجم' کا پاکستانی ایڈیشن شائع کیا تھا، اس میں مشاہیر کے تنقیدی مقالے بھی شامل کیے تھے۔ ذیل میں اس سلسلے کے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

بقول جلیل قدوائی مرحوم:

''بات یہ ہے کہ معنی و موضوع کی ندرت اور زبان کی ندرت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ایک اعلیٰ تخلیقی عمل ہے۔ اس ندرت سے لطف اندوز ہونا بجائے خود ایک فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنا طالب علمانہ نیازمندی، غلو اور کثرت وتواتر مطالعہ کے

بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ اردو شعر و ادب کے طالب علموں کو مولانا
سیماب کے کام کا پوری توجہ، دلچسپی و ہمدردی سے نیز بالاستیعاب
سیماب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے وہ ان کے بحرِ سخن
سے بیش تر اور بیش قیمت موتی برآمد کرنے میں کامیاب ہونے پر
اپنی آنکھوں میں چمک اور روح میں دمک محسوس کریں گے اور شعر
کی خوبی کے بارے میں ان کا معیار ہی بدل جائے گا''۔(۴)

نو صفحات سے زائد اس گراں قدر مقالے میں جلیل قدوائی مرحوم نے بہت سارے حوالوں اور 'کلیم عجم' کی متعدد غزلوں سے منتخب اشعار پیش کیے ہیں۔ 'کلیم عجم' جس میں تین ادوار کی غزلیں شامل ہیں یعنی ۱۸۹۸ تا ۱۹۰۸، اس میں ابتدائی دور کی ۴۵ غزلیں دی گئی ہیں۔ دوسرا دور جو کہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۱ کو محیط ہے، اس میں ۴۹ غزلیں ہیں۔ تیسرے دور کی ۱۵۰ غزلیں دی گئی ہیں۔ تقریباً ڈھائی سو غزلوں کے اس غزانے کو کلاسیکی اردو غزل کا اعلیٰ ترین معیار کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی ایڈیشن جو کہ آگرہ سے شائع ہوا تھا، اس میں آخر میں جرعات کے تحت ۱۱۳۹ اشعار دیے گئے ہیں۔ ان میں کہیں چار شعر ہیں تو کہیں تین، دو اور ایک۔ حالانکہ ایک زود گو شاعر کے لیے مکمل غزل کہہ لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن علامہ نے اپنی زود گوئی پر خیالات کی یلغار کا ایک زبردست ارادتی بند باندھ دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ علامہ نے ان پر مکمل غزلیں کہیں بھی یا نہیں۔ 'سدرۃ المنتہیٰ' اور 'لوح محفوظ' میں تو نہیں ہیں۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے زاویۂ نظر سے علامہ کی شاعری کو پرکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو غزل کی اس تطہیر میں سیماب نے جو کردار ادا کیا، وہ قابل
قدر ہے۔ انھوں نے حالی کی طرح عاشقانہ شاعری سے ناصحانہ
شاعری کی طرف جست نہیں لگائی۔ اردو کی عشقیہ شاعری کو خس و
خاشاک سے پاک کر دینا کافی سمجھا۔ سیماب نہ تو میر کی طرح

کوئی بڑے عاشق تھے نہ وہ بڑی عشقیہ شاعری کا حق ادا کر سکے۔
اس کے باوجود ان کے متعدد اشعار عشقیہ شاعری سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ناقابلِ فراموش ہیں''۔ (۵)

نظیر صدیقی اپنے مقالے کا اختتام ان خیالات پر کرتے ہیں:

''سیماب غزل گو اور نظم نگار دونوں حیثیتوں سے اہمیت رکھتے
ہیں۔اس بنا پر مجھے یقین ہے کہ 'کلیم عجم' کا تیسرا ایڈیشن بھی دلچسپی
کی نظر سے پڑھا ئے گا''۔ (۶)

یہ چند تبصرے علامہ کی مکمل غزلیہ شاعری کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ میری طالب علمانہ رائے ہے کہ علامہ سیماب ایسا نابغہ روزگار شاعر شاید ہی اب نظر آئے۔ حالانکہ ترقی پسند شعرا نے فیض، ومجاز دیے تھے، جدیدیت نے ناصر کاظمی اور شکیب جلالی جیسے بے مثال شاعر دیے، لیکن اس کے بعد اردو غزل فراق پر آ کر جیسے رک گئی۔ حالانکہ حسن نعیم، شاذ تمکنت، زیب غوری وغیرہم کے یہاں زندہ غزل کے امکانات تھے لیکن بھلا دیے جانے والے وقت کے سخت گیر رویوں نے متذکرہ شعرا کو بتدریج بھلا دیا ہے۔ تاہم ماضی کے شعرا میں نظیر، میر، غالب سے اقبال وسیماب تک، نہ بھلائے جانے والے شعرا میں سیماب کا شمار بھی ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا:

میں ہوں اک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

'کلیم عجم' کے صفحہ نمبر ۳۲۱ پر جو تضمین ہے، وہ سیماب نے خود اپنی ایک غزل پر لکھی ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

غم، قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا! پُتلہ ہوا عذاب کا انسان کیا ہوا

اور اس پر جو تضمین لکھی ہے، اس کا پہلا بند یہ ہے:

کیف وسکون بزمِ ازل سے جدا ہوا دنیا میں آگے موردِ رنج و بلا ہوا
احساسِ حسن وعشق سے درد آشنا ہوا افسردۂ سرابِ وفا و جفا ہوا

ہنگامۂ حیات سے محوِ بکا ہوا　　آزردۂ کشاکشِ بیم و رجا ہوا

ان آفتوں کے بعد خرابِ فنا ہوا　　غم، قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا

پتلہ عذاب کا ہوا انساں تو کیا ہوا!

بتیس اشعار کی پوری تضمین میں ہر چار اشعار کے بعد اسی طرح ایک ایک مصرع لکھا گیا ہے۔ وہ مصرعے حسب ذیل ہیں:

ع　تم نے جو دل میں آگ لگا دی تو کیا ہوا

ع　شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

ع　یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا؟

ع　کہنا یہ تھا کہ حقِ محبت ادا ہوا؟

ع　جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

ع　اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا

ع　سیمابؔ کچھ خبر نہیں کیا فیصلہ ہوا؟

(کلیم عجم)

اس کے بعد تین مثلث دیے گئے ہیں۔ پہلا مثلث ۳۳ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے تین مصرعے اس طرح ہیں:

گوہرِ اشک کو خوں نالۂ حرماں دیکھا

دلِ خوں گشتہ کو سیلاب بداماں دیکھا

ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

(کلیم عجم)

دوسرے مثلث میں ۴۵ مصرعے ہیں۔ تیسرا مثلث ۴۲ مصرعوں کو محیط ہے۔ اس کا پہلا بند ہے:

عیاں عالم کی حالت ہو رہی ہے
نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے
مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے
(کلیم عجم)

یہاں ایک بات واضح کروں کہ علامہ کا تخلیقی ذہن طرح طرح کی ہیئتوں اور ارکان کی کمی بیشی پر بے پناہ قدرت رکھتا تھا۔لہٰذا مثلث کی ابتدا بھی علامہ ہی کے تخلیقی ذہن کی اُپج ہے۔اس تجربے کو بعد میں حمایت علی شاعر، قمر اقبال مرحوم اور جاوید ناصر مرحوم نے ثلاثی کا عنوان دیا۔اسی طرح کے تین مصرعے ہم وزن ہوکر تروینی بنے۔ یہ تجربہ مشہور شاعر اور افسانہ نگار گلزار نے کیا تھا جو ماہنامہ 'شاعر' میں شائع ہوا تھا اور گلزار کے شعری مجموعے 'پشمینہ کی ایک شام' میں شامل ہے۔اسی طرح ہائیکو، ماہیے کا بھی جنم ہوا۔

سدرۃ المنتہیٰ (۱۹۴۷)

سیماب اکبرآبادی کا دوسرا شعری مجموعہ 'سدرۃ المنتہیٰ' ہے، جو جولائی ۱۹۴۷ میں مکتبہ قصر الادب، آگرہ سے شائع ہوا۔اس میں ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۲ یعنی سات سال پر محیط کلام شامل ہے۔ یہ دور ہندوستان میں قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا، جب ملک انگریزوں کے خلاف متحد ہوکر مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں کمربستہ تھا۔سیاسی رہنمایان کانگریس اور مسلم لیگ باہم مل کر ملک کی آزادی کے لیے عوامی ذہن کو بیدار کررہے تھے۔ایسے پرآشوب ماحول میں سیماب نے اپنی شاعری سے عشق ومحبت کے نغمے نہیں سنائے بلکہ اپنی نظموں سے جوش وولولہ بھی پیدا کیا۔ 'کار امروز' اور 'شعر انقلاب' کے عنوانات ہی سے شاعر کے باطن اور ان کے فکری طوفان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ 'کلیم عجم' کی طرح 'سدرۃ المنتہیٰ' میں بھی کل ہند مشاعروں میں علامہ نے جو طرحی غزلیں پڑھی تھیں، ان کا انتخاب دیا گیا ہے۔

'سدرۃ المنتہیٰ' میں پہلی طرحی غزل مشاعرہ فتح پورسیکری کی ہے۔اس کا مطلع ہے:

موحّد ہوں، میں کیوں محوِ جمالِ ماسوا ہوتا
نظر مل بھی گئی ہوتی تو مشرک ہوگیا ہوتا

یہ مطلع تصوف کا بہت باریک نکتہ لیے ہوئے ہے کہ عاشق کی نگاہوں میں جس جمال یار کا جلوہ موجود ہے، وہ کسی اور کو اگر دیکھے تو وہ مشرک ہوگا۔اس باریک سے پردے کو ملحوظ رکھنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ایسی باتوں میں غلو کا احتمال ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں شامل غزلوں سے قبل علامہ سیماب نے 'میر انصب العین' کے عنوان سے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک نظم دی ہے۔انھوں نے اس نظم میں اپنے ادبی موقف اور اپنے شعری سروکار کا تخلیقی اظہار یوں کیا ہے:

غفلت میں سونے والوں کی نیندیں میں اڑانے آیا ہوں
دنیا کو جگا کر چھوڑوں گا، دنیا کو جگانے آیا ہوں
جو ناقص ہے وہ دستورِ تدبیر مٹانے آیا ہوں
انسان کے شایاں آئینِ تقدیر بنانے آیا ہوں
تخلیق کی یہ نوع کبریٰ نامحرم ہے اک مدت سے
انسان کو بھی میں فطرت کا ہمراز بنانے آیا ہوں

(سدرۃ المنتہیٰ، ص۹)

اس نظم کا پہلا ہی شعر اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ سیماب نے اپنی تخلیقی رفتار (جسے زودگی کا نام دیا گیا) سے واقعی نیندیں اڑائی ہوں گی۔ایسے زودگو کے اپنے مسائل میں تکرار لفظی، فکر وخیال اور تکرار معانی کے ساتھ طے شدہ بحر ووزن کی یکسانیت کا درآنا ناگزیر ہوتا ہے۔میر تقی میر استثنائے متقدمین میں سے ہیں۔غالب کم گو تھے، ذوق ومومن کا بھی یہی حال تھا۔داغ کے ہاں زودگوئی ہے لیکن تکرار خال خال ہے۔علامہ اقبال کی شعری کائنات بھی

انفرادیت لیے ہوئے ہے اور فارسی میں ان کا جو شعری سرمایہ ہے، اس میں کہیں بھی تکرار نہیں سوائے اس کے کہ اقبال نے تلمیحات، تشبیہات سے اپنی آفاقی شاعری کو نہایت کامیابی سے روشن کیا ہے اور اپنے معاصرین اور مابعد شعر بالخصوص ترقی پسند شعرا کے لیے مشعل شاعری بن گئے تھے۔

سیماب کی زود گوئی اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ بلکہ بے پناہ تھی کہ غزلوں کے تین دواوین کے علاوہ نظموں کے آٹھ مجموعے، قرآن مجید کا منظوم ترجمہ 'وحی منظوم'، مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ، منظوم سوانح، احادیث نبویؐ کا منظوم ترجمہ وغیرہ یعنی کوئی زود گو ایسی مثال قائم نہیں کر سکا اور اگر ماضی کی کوئی مثال ہوگی بھی تو وہ اوراق پارینہ کے تحت طاق نسیاں ہو چکی ہے۔ سیماب نے منظوم تراجم کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، یہ بذات خود ایسا مشکل اور طویل کام ہے جو صرف ایک ایسا شاعر ہی انجام دے سکتا ہے جو بے پناہ اور بھرپور خداداد صلاحیتوں سے مزین و مشرف ہو ورنہ یہ ہر کسی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہ شاندار کارنامے واقعی عدیم المثال اور لائق تحسین ہیں۔

سیماب کا اسلامی مزاج چونکہ تصوف پسند تھا لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری میں اسلامی تلمیحات و استعارات کا بھرپور تخلیقی استعمال کیا ہے۔ ان کے دواوین خصوصاً 'کلیم عجم' میں عشق مجازی' کے ساتھ عشق حقیقی کے شعری اظہار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے وحدانیت اور اسلامی تصوف کے ساتھ بھگتی رس کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا۔ شری کرشن پران کی نظمیں 'کرشن گیتا' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ کرشن گیتا میں انھوں نے کرشن مہاراج سے اپنی عقیدتوں کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔

'سدرۃ المنتہیٰ' کے عنوان سے مجموعے کی پہلی غزل دی گئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ بیس اشعار پر مشتمل یہ غزل مکمل طور پر سیمابی ذہن کی ساخت پرداخت ہے:

موحّد ہوں، میں کیوں محوِ جمال ماسوا ہوتا نظر مل بھی گئی ہوتی تو مشرک ہوگیا ہوتا
اگر حدِ خودی و بے خودی سے ماورا ہوتا تو یہ انسان پھر انسان کیوں ہوتا، خدا ہوتا
میں رفعت کی ہزاروں منزلیں طے کر چکا ہوتا اگر میری خوشی پر زندگی کا فیصلہ ہوتا
جو ذوقِ عشق دنیا میں نہ ہمت آزما ہوتا یہ سارا کاروانِ زندگی غافل پڑا ہوتا
اگر فطرت کو احساسِ مساواتِ وفا ہوتا تو اب تک حسن کے پہلو میں بھی دل بن چکا ہوتا
وفا ہوتی نہ جرم آئینِ الفت میں، تو کیا ہوتا گنہگارِ وفا پھر بھی گنہگارِ وفا ہوتا
جو بجلی جذب کر لینے کا اس کا حوصلہ ہوتا تو دل پر خندہ زن کیوں آج پتھر طور کا ہوتا
خموشی پر مری دنیا میں شورش ہے قیامت کی خدا ناخواستہ لب کھل گئے ہوتے تو کیا ہوتا
شعارِ حسن پابندی، مزاجِ عشق آزادی جو خود اپنا ہی بندہ ہے وہ کیا میرا خدا ہوتا
خدا نے خیر کی، تھی راہِ عشق ایسی ہی پیچیدہ کہ میرے ساتھ میرا رہنما بھی کھو گیا ہوتا
لحد میں چین سے اے اضطرابِ شوق سونے دے شب ہستی بری کیا تھی جو مجھ کو جاگنا ہوتا
اڑا دیں میں نے آخر دھجیاں دامانِ ہستی کی گریباں ہی کے دو تاروں سے کیا زور آزما ہوتا
کہاں یہ دہر کہنہ اور کہاں ذوقِ جواں میرا کوئی دنیا نئی ہوتی، کوئی عالم نیا ہوتا
کیا اک سجدہ میں نے حسن کو تو ہوگیا کافر اگر سر کاٹ کا قدموں پہ رکھ دیتا تو کیا ہوتا؟
مہ کامل میں شعریت ہے لیکن نطق سے خالی نظر بھی میری پڑ جاتی تو شاعر بن گیا ہوتا
ہوں وہ پا مردِ آزادی، اگر ملتی رہائی بھی تو میں زنجیرِ زنداں کو رہا کر کے رہا ہوتا
مجھے مرنا نہیں آتا، مجھے سیمابؔ کہتے ہیں جو برزخ بھی بدل جاتا تو میرا کیمیا ہوتا

یہاں مکمل غزل کا نقل کرنا دراصل سیماب اکبرآبادی کی کیفیات کو من وعن پیش کرنا ہے، جو 'کلیم عجم' سے 'لوحِ محفوظ' تک کی شاعری کا خاصہ ہے۔

سیماب کے ہاں شراب پر شاعری برائے نام بھی نہیں، وہ تو اس کے سخت مخالف تھے۔ معرکۂ سیماب و جوش، ماضی کے ادبی رسائل کا خاص موضوع رہے ہیں، لیکن 'شراب معرفت' علامہ کے ہاں شاعری کا موضوع بنی ہے اور ہزار رنگ میں خلق ہوئی ہے:

تعجب ہے جو دنیا اب بھی میخانہ نہ بن جائے
شرابِ عشق ہے پیمانہ در پیمانہ برسوں سے

شراب و شباب، جام و پیمانہ سیماب کی غزلوں میں نہیں ہیں البتہ عشق حقیقی کی شعری مثالیں تینوں مجموعوں میں کسی طرح کم نہیں۔

بات کر رہا ہوں 'سدرۃ المنتہیٰ' کی غزلوں میں اسلامی تصوف کی اور اس میں در آنے والے مسائل کی کہ اسلامی فلسفہ، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مابین بہت باریک باریک مباحث کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ مسلک اسلامی وہی تھا جو کہ شریعت میں آپ ؐ کا تھا:

فطرت نے اپنا جب سے کیا راز داں مجھے — تاروں کا نقطہ نقطہ ہے اک داستاں مجھے
اے کار ساز یہ تری ویراں نوازیاں — شکلِ قفس میں بخش دیا آشیاں مجھے
جلوے ترے نشاط نگاہ و خیال ہیں — جنت وہیں ہے تو نظر آئے جہاں مجھے
چونکے نہ شور حشر سے دیوانگانِ عشق — کہتا نہ تھا کہ دیجئے اذانِ اذاں مجھے
دونوں جہاں کے ظرف میں گنجائشیں نہیں — قسمت مٹائے بھی تو مٹائے کہاں مجھے؟
(سدرۃ المنتہیٰ)

تیرہ اشعار کی یہ مکمل غزل علامہ سیماب کا تصوف سے گہرا لگاؤ، اللہ کی وحدانیت، اس کی ذات یکتائی اور ان ہی کیفیات سے مملو ہے۔ اگر اس غزل کے تناظر میں 'سدرۃ المنتہیٰ' کی تمام غزلیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ علامہ کا مطالعۂ اسلامی تصوف کتنا باریک بیں اور فکر و تدبر کا حامل ہے۔ ویسے بھی وہ اپنی شاعری میں کسی فلسفی سے کم نظر نہیں آتے۔ زندگی کو انھوں نے اپنے طور پر دیکھا اور سمجھا تھا۔ معاشی مسائل کی تگ ودو، ایک بڑے کنبے کا بوجھ، ادھوری تعلیم، کل ہند مشاعروں کی صدارت، تصنیف و تالیف کے شب و روز کے علاوہ اپنے لیے اور تلامذہ کے لیے بھی فکر مند تھے:

ہوگیا رازِ غم ہستی کا عرفاں ہوگیا — میں نے تدبیر سکوں جب کی پریشاں ہوگیا
جب ستارے چھپ گئے اور چاند پنہاں ہوگیا — وہ میرے دل کے اندھیروں سے نمایاں ہوگیا

عمر کتنی مختصر تھی میرے دودِ آہ کی — دل سے اٹھا، منہ سے نکلا اور پریشاں ہوگیا
ظرف صحرا کو ہے ضد جوشِ جنوں سے ان دنوں — جانے کیا ہو گا جو ہر ذرہ بیاباں ہو گیا
کس قدر صبرآزما تھا شعلۂ آوازِ حسن — کود ہی موسیٰ کو پکارا، خود ہی پنہاں ہو گیا

اکیس اشعار کی یہ مکمل غزل غیر معمولی قوتِ متخیّلہ کا فن پارہ ہے۔ زبان و بیان، بحر و وزن، شعری تراکیب، تلمیحات، استعارے، تشبیہات نے غزل کو بلندی خیال اور ارتقائی شکل دے کر مرصع کاری کی مثال قائم کردی۔ علامہ نے فلسفے کو شاعری نہیں بنایا بلکہ غزلوں میں اپنا فلسفہ پیش کیا ہے۔

علامہ سیماب کی شاعری میں قرآن وسنت اور احادیث نبویؐ کی تعلیمات کا گہرا پرتو نظر آتا ہے۔ مناجات، شکایات، عرضداشت کا اظہار بھی کلام میں جابجا نظر آتا ہے:

تصور اور تری بندگی، بہت خوش ہوں — نہ سر جھکانے کی زحمت نہ سر اٹھانے کی
(سدرۃ المنتہیٰ)

کشمکش حیات و موت گنجِ مزار میں نہیں — روح مری بہ ایں ہمہ اب بھی قرار میں نہیں
(سدرۃ المنتہیٰ)

فطرت کی قوتوں کو آواز دے رہی ہیں — سہمے ہوئے دلوں کی خاموش التجائیں
(سدرۃ المنتہیٰ)

'سدرۃ المنتہیٰ' جیسے شعری مجموعے، علامہ سیماب کے دور شاعری میں بہت کم شائع ہوئے تھے۔ حالانکہ جہاں استاد داغ کے تلامذہ کی خاصی بڑی تعداد غزل گوئی میں اپنے تخلیقی کمالات دکھا رہی تھی، ان میں علامہ اقبال جدید نظم و جدید غزل کے امام تھے۔ علامہ سیماب نے بھی اپنی تخلیقی شاہراہ خود ہی تعمیر کی تھی۔ شعرائے متقدمین میں میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن جیسے اساتذۂ غزل نے بحر و وزن اور فکر رسا کی انتہاؤں کو اپنی غزل میں سمو دیا تھا کہ آج بھی ان باکمال شعرا کے برمحل اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور باذوق قاری کا روزمرہ بنے ہوئے ہیں، بالخصوص غالب اور اقبال کے ضرب المثل اشعار اور مصرعے۔ جیسے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
(غالب)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک　　　کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہوتے تک
(غالب)

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی　　　بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں
(اقبال)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہوں　　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
(اقبال)

'سدرۃ المنتہیٰ' کی تمام غزلیں اور بعض عمدہ اشعار اور مصرعے سیماب کی جدت پسندی پر دال ہیں، ملاحظہ کیجیے:

جو ہم نظام نمو خانۂ وفا کرتے　　　تو آنسوؤں سے محبت کے دل بنا کرتے
یہ فرض کیوں نہ قدم پر ترے ادا کرتے؟　　　نماز عشق تھی، سجدے زمیں پہ کیا کرتے

ہر ایک سانس تھی رومانِ نو کی اک تمہید　　　کہاں سے اپنے فسانے کی ابتدا کرتے
جھکا کے سر بہ ادائے نیاز بیٹھ گئے　　　غرورِ حسن کو بے اعتبار کیا کرتے

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سیماب نے اپنی لفظیات کی جو فرہنگ غزل و نظم اور نثر میں خلق کی تھی ان میں ایک لفظ 'رومان' بھی ہے، جو بعد میں رواج پا کر، رومانی ہوگیا۔ شاعر رومان اختر شیرانی کی شہرت آج بھی ہے کہ نظم گو رومانی شعرا نے اختر شیرانی کا خاصا اثر قبول کیا تھا۔ وہ چاہے جاں نثار اختر ہوں یا سردار جعفری، کیفی اعظمی، سلام مچھلی شہری وغیرہ۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے منشور کے ساتھ 'رومان' کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی تھی:

تو آنسوؤں سے محبت کے دل بنا کرتے
(سدرۃ المنتہیٰ)

یہ غیر معمولی مصرع، پوری اردو شاعری میں خاصا منفرد معلوم ہوتا ہے۔

دو عمدہ اشعار اور ملاحظہ کیجیے:

ترے سوا نظر و دل میں کوئی تھا ہی نہیں — مجال کیا تھی کہ ہم فکرِ ماسوا کرتے
کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟
(سدرۃ المنتہیٰ)

آخرالذکر شعر ناقدان غزل نے بہترین قرار دیا کہ پہلی بار کسی شاعر نے وفا اور بے وفائی کی طرف واضح اشارہ کیا ہے اور یہ کہ حسن ہی وفا کرے یہ ضروری نہیں۔ اوّل الذکر شعر تصوف اور دنیاوی، ہر دو اعتبار سے بے مثال ہے۔

چودہ اشعار کی یہ معرکہ آرا غزل علامہ سیماب کے تخلیقی سروکار کی غماز ہے۔ ہر شعر عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے جہاں 'خودی' کا استعارہ بکثرت استعمال کیا، ان کی غزل اور نظم ہر دو اصناف میں یہ لفظ ہر طرح سے تخلیق ہوا ہے حتیٰ کہ اقبال کی پوری شاعری کا کلیدی لفظ ہی 'خودی' ہے۔ بعینہٖ علامہ سیماب نے حدی' کا شعری لفظ اختراع کیا تھا اور وہ بار بار اس لفظ کو 'حدی خواں' کے طور پر لکھتے رہے ہیں:

پیامِ خواب ہے آواز یارانِ خوش الحاں کی — مغنی کی نہیں مجھ کو ضرورت ہے حدی خواں کی
انگڑائیاں لینے ہی کو ہیں قافلے والے — آواز دیے جائے حدی خواں کوئی دن اور
(سدرۃ المنتہیٰ)

اللہ تعالیٰ ہر ذی روح کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے، اس ایک اسلامی نظریے نے قرآن وسنت میں اللہ اور بندے کے درمیان اٹوٹ ربط کا جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ بے شک متقی اور پرہیزگار انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ ان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کا ادراک ان بندوں کو حاصل ہوتا ہے جو کہ خدا کے مقرب اور خوشنودی کرنے والے ہوتے ہیں۔ انھیں احساس ہوتا رہتا ہے کہ اللہ ہمہ وقت دیکھنے اور سننے والا، پاک، بے عیب اور بے مثال قدرت والا معبود ہے۔ علامہ سیماب کی غزلیہ شاعری میں ربوبیت وخلاقیت اللہ رب

العزت کی ہی شان ہے۔ جیسے کہ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ’کل یوم ہو فی شان‘ یعنی اللہ تعالیٰ ہر روز کام میں لگا رہتا ہے اور ان کاموں میں اس کی خلاقیت، ربوبیت دونوں نمایاں ہیں۔ علامہ سیماب کا ذہن رسا حقائق ابدی کا عکاس تھا اور اللہ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا، اسے انھوں نے طرح طرح سے اپنی شاعری میں برتا ہے:

یہ بزمِ طور ایمن، یہ اندھیرا اور تنہائی اٹھا کر شمع رکھ دیتا کوئی میرے شبستاں کی
(سدرۃ المنتہیٰ)

میں ہوں کلیم ہند ہمالہ ہے میرا طور ہے انتظارِ دعوتِ جلوہ گری مجھے
(سدرۃ المنتہیٰ)

کون آ کر طور پر یہ جلوہ افشاں ہوگیا میرے بت خانے کا ہر پتھر فروزاں ہوگیا
(سدرۃ المنتہیٰ)

میں وادیوں مین طور کی سیمابؔ مدتوں پھرتا رہا ہوں ذوقِ تماشا لیے ہوئے
(سدرۃ المنتہیٰ)

مندرجہ بالا سطور میں رگِ جاں کا جو ذکر کیا گیا ہے ایک طرح سے اگر دیکھا جائے تو اس سے معرفت کی اصطلاح بنتی ہے۔ علامہ نے اس لفظ کو پھر اس طرح سے باندھا ہے:

یہ خوشی اس کی، جو ملنا اسے منظور نہیں رگِ جاں دور ہے انسان سے وہ دور نہیں
(سدرۃ المنتہیٰ)

پھر صور ہی ہوگا مرا اک آخری نغمہ ٹوٹا نہ اک سازِ رگِ جاں کوئی دن اور
(سدرۃ المنتہیٰ)

سیماب کے ہم وطن اور ان کے پیش رو اساتذہ میں نظیر، میر اور غالب عالمی شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ سیماب میں نظیر اکبرآبادی کی سی منظر نگاری، میر کی سی نازک مزاجی اور غالب کا سا شعری فن موجود ہے اور ان تینوں کے امتزاج کا نام ہی سیماب اکبرآبادی ہے۔ ’سدرۃ المنتہیٰ‘ میں جہاں میر اور غالب کے شعری پرتو موجود ہیں وہیں ان کی نظمیہ شاعری میں انیس و دبیر، نظیر اور چکبست کا سایہ ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود علامہ کی اپنی امتیازی اختراعات بھی

ہیں جو صرف سیماب اکبرآبادی کے ہی محاسن سخن کا خاصہ ہے۔

'سدرۃ المنتہیٰ' غزلوں کا ایک ایسا جہان ہے، جس کی سیاحت قاری کو زماں ومکاں سے پرے ایک ایسے تخلیقی جزیرے کی سیر کراتی ہے جہاں وہ خود کو تنہا اس کا باشندہ تصور کرنے لگتا ہے۔ تمام غزلیں اس کے دل کی دھڑکن اوران میں پیش کیے گئے زرّیں خیالات اس کے اپنے لگتے ہیں۔ وہ قارئین جو کہ دنیاوی عشق کے اسیر ہوکر مادی حصول کے لیے سرگرداں ہوتے ہیں، وہ ان غزلوں کے مطالعے سے اس کے غواص بن کر عشق حقیقی یعنی غزلوں کی معرفت میں خالقِ کائنات سے جا ملتے ہیں۔ تب ان پرایک خوشگوار کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اپنے رب کا نظارہ اپنی روح میں کرنے لگتے ہیں۔ پھر یہ فانی دنیا ان کے لیے غیر ضروری ہوجاتی ہے۔ ان کا دل زمین سے اچاٹ ہوجاتا ہے۔ وہ صرف ذکرِ الٰہی کو اپنا وظیفہ بنالیتے ہیں:

یہ رشوت اس کو دے جو زندگی کو زندگی سمجھے　　ہم اے دنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھے

جو اپنی زندگی کو اک مسلسل بندگی سمجھے　　وہ اپنی زندگی میں بندگی کیوں لازمی سمجھے

(سدرۃ المنتہیٰ)

اس غزل کے مطلع میں لفظ 'رشوت' طنز ومزاح کے شاعر، اکبراللہ آبادی، دلاور فگار کی شاعری میں آسکتا ہے، لیکن غزل کے ایک باکمال استاد شاعر نے اسے غزل میں برت کر کچھ سے کچھ بنادیا ہے۔ سیماب چونکہ اجتہادی مزاج کے شاعر تھے لہٰذا وہ اپنے معاصرین کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی تخلیقی شاہراہ تعمیر کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ 'کلیم عجم' سے 'لوح محفوظ' تک کی غزلوں میں شعری تراکیب، نت نئے ترکیبی استعارے، تشبیہات، تلمیحات، تاریخ، مآخذ اور وہ شعری آفاق جنھیں ہم سیماب کی شاعری کا طرۂ امتیاز کہہ سکتے ہیں، موجود ہیں۔

اب اس دیوان کے اس حصے کا تعارف ضروری سمجھتا ہوں جس میں علامہ نے اختراعی شعری رویوں سے اپنے معاصرین کو متوجہ کیا تھا۔ دیوان کے آخری حصے کے صفحہ نمبر ۱۹۳ پر ایک تضمین دی گئی ہے جس کا ذیلی عنوان ہے 'بصورتِ تربیع' اس کے ابتدائی دو بند ملاحظہ کیجیے:

کیا نیا کوئی اثر کم نگہی کا دیکھا　　یا دلِ خوں شدہٗ یاس جھلکتا دیکھا

نہیں معلوم نگاہوں میں مری کیا دیکھا　　آج پھر اس نے بہ اندازِ گوارا دیکھا

اسے بیگانۂ خال و خدِ معنی دیکھا　　اس نے باطن کا نہ اک روز نظارا دیکھا

ماسوا کا تو بڑے شوق سے جلوا دیکھا　　آئینے نے کبھی اپنا بھی تماشا دیکھا؟

تیس اشعار پر مشتمل یہ تضمین ایک انوکھا تجربہ ہے کہ علامہ سیماب نے اپنی ہی ایک غزل کی تضمین لکھ دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی ذہن کس قدر تازہ دم رہتا تھا کہ کہیں بھی تکرارِ لفظی یا خیالات کا اعادہ نہیں ملتا۔ جب کہ کسی زود گو شاعر کے ہاں خود کو دہرانے کا عمل ابتدائی مدارج سے ہی ابھرنے لگتا ہے اور اگر وہ کم گو ہو تو پھر اس کی شاعری میں سرقہ در آتا ہے۔ لیکن علامہ سیماب کی شاعری میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

صفحہ نمبر ۱۹۴ پر ایک غزل بعنوان 'غزل بہ اسلوب نظم' دی گئی ہے۔ کلاسیکی شعرا کے دواوین میں تو ایسا کوئی تجربہ میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ غزل کے تین بند بمع عنوان کے لکھے گئے۔ نوٹ ملاحظہ ہو:

''جس کے اشعار اپنی انفرادی حیثیت میں اشعارِ غزل کی طرح ایک مکمل مفہوم کے حامل ہیں اور بحیثیتِ مجموعی ایک نظمِ مسلسل کی نہ ٹوٹنے والی کڑیاں بھی ہیں''۔(۷)

محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم　　سبکسارِ رنج وفا ہو گئے ہم

مسرت کشِ ابتدا ہو گئے ہم　　بالآخر مآل آشنا ہو گئے ہم

بڑی کشمکش سے رہا ہو گئے ہم

محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

اگر فائزِ مدعا ہو گئے ہم　　خودی نے یہ سمجھا خدا ہو گئے ہم

جو مایوسِ مہر و وفا ہو گئے　　تو اپنے لیے خود بلا ہو گئے ہم

تلوّن سے جب بے مزا ہو گئے ہم

محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

ایک اور تضمین ص۱۹۴ پر دی گئی ہے۔ تیرہ بندوں پر مشتمل اس نظم کا پہلا اور آخری بند دیکھئے:

بے فصل اٹھ رہی ہیں ظلمت فزا گھٹائیں　　دنیا پہ چھا رہی ہیں صبر آزما بلائیں
کانوں میں آ رہی ہیں کچھ دور سے صدائیں　　یہ گونجتی گرجتی شور آفریں فضائیں
تُو سن سکے تو اپنے نغمے تجھے سنائیں

آخری بند:

یہ برہمیِ پیہم، یہ کاہشِ مسلسل　　ہے غارتِ خودی کی اک کوششِ مسلسل
لیکن نہیں ہے مہمل آویزشِ مسلسل　　سیمابؔ اس لیے ہے یہ شورشِ مسلسل
بھولے ہوئے دلوں کو شاید وہ یاد آئیں

آخر میں جرعے کے عنوان سے صفحہ نمبر ۲۰۰ تا ۲۰۷ نامکمل غزلیں اور متفرق اشعار دیے گئے ہیں۔ یہاں ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جرعے والے باب میں پانچ یا چھ یا سات اشعار کی غزلوں کو نامکمل جرعے سمجھ کر شامل دیوان کیا گیا ہے، جب کہ آج کا شاعر یا کلاسیکی شعرا انھیں مکمل غزلوں کے باب میں شامل کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ جرعے کا جو عنوان انھوں نے دیا ہے یہ بھی ان کی اپنی ایک نئی اصطلاح ہے جو انھیں دیگر شعرا سے منفرد بناتی ہے۔

متفرق اشعار کو دیوان کے آخری صفحے پر درج کیا گیا ہے۔ دو، تین اشعار پیش کر رہا ہوں:

صرف ابتدائے عشق میں کچھ دن سکوں رہا　　پھر تو تمام عمر بلا کا جنوں رہا
(سدرۃ المنتہٰی)

مرا دل تیری ہی جانب جھکے تو کیا علاج اس کا　　مساجد کا مسلّم قبلہ رُو، قبلہ نما ہونا
(سدرۃ المنتہٰی)

کیا گردشِ فلک کبھی واپس نہ لائے گی　　سیمابؔ وہ زمانے جو آ کر چلے گئے

'سدرۃ المنتہٰی' سچی اور قلبی شاعری کا لامحدود فلک ہے۔ علامہ کے اس دیوان اور ماقبل اور

مابعد کے دواوین پر لکھنے کے لیے دفتر درکار ہے کہ ایسا غیر معمولی شاعر جس کا ہر شعر دل پہ نقش ہو جاتا ہے اور سماعتوں میں گونجتا رہتا ہے۔

لوح محفوظ (۱۹۸۳)

'لوح محفوظ' میں ۱۹۳۴ تا ۱۹۵۰ تک کی غزلیں شامل ہیں۔ لیکن میری تحقیق کے مطابق 'کلیم عجم' اور 'سدرۃ المنتہیٰ' کی طرح ان غزلوں کے سوانحی کوائف نہیں دیے گئے ہیں کہ یہ تمام غزلیں کب اور کس شہر کے طرحی مشاعروں میں سنائی گئی تھیں۔ پہلے حصے میں پچیس غزلیں ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے:

کسی نے بھی حفاظت سے نہ رکھا، میرے چلمن کو

خزاں ہشیار ہی کرتی رہی یارانِ گلشن کو

اٹھارہ اشعار کی اس غزل کا مقطع ہے:

نہیں ایسا معما کوئی جس کا حل نہیں ممکن سنبھلنا چاہیے سیمابؔ میرے دل کی الجھن کو

(لوح محفوظ)

اسی باب میں ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

اگر نہ میرے سر اور تیرے آستاں سے چلا بتا کہ سجدوں کا دستور پھر کہاں سے چلا

(لوح محفوظ)

سولہ اشعار کی اس غزل کا ہر شعر منتخب اور بحث انگیز ہے کہ ۱۹۳۵ کی وہ غزل جو علامہ کے یہاں تخلیق ہو رہی تھی، اس کا رواج بعد میں ۱۹۳۶ اور ۱۹۳۷ میں ترقی پسند شاعری میں پروان چڑھا۔ یہاں یہ بات کہنا لازم ہے کہ سیماب کے دل بیدار اور ذہنِ رسا نے پہلے ہی جس بات کا ادراک کر لیا تھا بعد میں حالات وواقعات سے وہ درست ثابت ہوئی۔ غزلوں کے علاوہ سیماب کی نظمیہ شاعری بجا طور پر ترقی پسند تحریک کا منشور معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ۱۹۳۰ اور

۱۹۳۷ کے درمیان ملک میں کوئی سیاسی استحکام نہیں تھا۔ انگریزوں کا ظلم وجبر اور عوام میں بے چینی کا خلفشار بہت زیادہ تھا۔ اس دور کے منظر نامے علامہ کی نظمیہ شاعری میں بہ حسن وخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

'سے چلا' والی ردیف کی غزل کا ایک اور شعر دیکھئے:

فنا کے ہاتھ سے جاں آدمی بچا نہ سکا　　غریب بچ کے بہت مرگِ ناگہاں سے چلا
(لوحِ محفوظ)

'لوح محفوظ' کی غزلوں میں علامہ سیماب کا فن، زبان وبیان، اسلوب وآہنگ، شعری تراکیب، استعارہ سازی اور تشبیہات سب کچھ ایک غیر معمولی شاعر کے ادبی وشعری قد کو بلند کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ تمام غزلوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ حالانکہ تحریک نے ۱۹۳۶ اور اس کے بعد شعرا کو متاثر کیا تھا اور اسی کے زیر اثر اردو کی اعلیٰ نظمیہ شاعری تخلیق کی گئی تھی۔ وہ چاہے فیض احمد فیض ہوں یا مخدوم محی الدین، سردار جعفری، معین احسن جذبی، اسرارالحق مجاز، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، وامق جون پوری وغیرہ۔ لیکن اس تحریک سے قبل علامہ اقبال اور علامہ سیماب کی نظم وغزل میں وہ ساری لفظیات اور شعری تراکیب موجود ہیں، جنھیں بعد میں ترقی پسند شعرا نے اپنی شاعری کا خاصہ بنایا۔ اقبال وسیماب کے یہاں ان کے عصر کا تخلیقی ذہن کارفرما تھا۔

فقط احساسِ آزادی سے آزادی عبارت ہے　　وہی دیوار گھر کی ہے، وہی دیوار زنداں کی
(صدرۃ المنتہیٰ)

'لوح محفوظ' میں اس قبیل کے متعدد شعر ترقی پسند شاعری کی یاددلاتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا کی علامتوں میں زنداں، مقتل، قفس، آشیاں، لہو، قاتل، ستم گر، صلیب، مشعل جیسے استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ یہی استعارے سیماب نے اپنی غزلوں میں بہت پہلے برت لیے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ترقی پسند نقادوں نے سیماب کی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی۔

بہت پہلے سیماب نے یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی:

میں اس دنیا میں اے سیمابؔ اک رازِ حقیقت تھا
سمجھنے کی طرح اہلِ جہاں مجھ کو کہاں سمجھے
(کلیم عجم،ص۲۸۲)

'لوح محفوظ' کی غزلیں سیماب کی غزلیہ شاعری کا نقطہ عروج ہیں کہ پہلے دیوان سے اس دیوان تک ایک ایسا غزلیہ جہان آباد ہے کہ ہر غزل، اس کا ہر شعر، ہر مصرع اپنی جگہ اس قدر مستحکم ہے کہ اس میں تصرف یا تبدیلی کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا:

سجدے کروں سوال کروں التجا کروں — یوں دیں تو کائنات مرے کام کی نہیں
وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت — مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں

علامہ نے تاحیات اپنی خودداری کو قائم رکھا، تاہم اس میں کوئی خود پسندی یا کسی طرح کا غرور شامل نہیں تھا:

بے طلب ان سے کچھ نہیں ملتا — اور میں خوگرِ سوال نہیں
(لوحِ محفوظ)

علامہ سیماب طبعیتاً غیور اور خوددار شاعر تھے اور انھوں نے خود پرستی، خود طلبی اور خود روی کو گناہ تصور کیا ہے۔ کہتے ہیں:

خود نمائی، خود پرستی، خودروی، خود طلبی — یہ گنہ کس نے شریکِ آدمیت کر دیے
(لوحِ محفوظ)

مصرعۂ اولیٰ میں کسی آدمی کے اندر اگر یہ سارے برے اوصاف جمع ہوں تو وہ انھیں گناہ سمجھتے تھے۔ 'لوح محفوظ' کی غزلیں تجربے، مشاہدے اور غزل کا اعلیٰ وارفع مقام متعین کرتی ہیں۔ انھوں نے تخلیقی سطح پر مثالیں قائم کی تھیں کہ غزل اس کو کہتے ہیں:

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کل کائنات پر — سمٹے تو اس قدر کہ رگِ جاں میں آگئے

'لوحِ محفوظ' کی تمام غزلیہ شاعری حقائق، فلسفۂ حیات اور نکتہ دانی سے بھر پور ہے:

میں خود گل چیں تھا، خود ہی باغباں تھا خود گل افشاں تھا

کوئی آئینۂ ماضی میں دیکھے میرے گلشن کو

نگاہِ ابر میں پھول اور کانٹے سب برابر ہیں

محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست دشمن کو

اسی مجموعے کی ایک غزل کے اشعار ان لمحوں کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ ہندوستانی عوام اپنی آزادی کے لیے انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ اس وقت سیماب نے اپنی شاعری کی لے میں احتجاج کے سر لگا کر نظموں کے علاوہ اپنی غزلوں میں بھی ایک وطن پرست انسان ہونے کا ثبوت دیا:

یہ رسم انقلابِ وقت تکلیفِ نظر کیوں ہو

قفس میں شام ہوجائے تو ہوجائے سحر کیوں ہو

اسیری اور ایسی بے بسی اللہ رے مجبوری

کسی نے یہ نہ پوچھا آج تم بے بال و پر کیوں ہو

(لوح محفوظ، ص ۱۴۱)

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ علامہ نے اپنے معاصرین کی غزلیہ شاعری سے الگ اپنا جادۂ غزل تراشا تھا۔ وہ غزل میں ہر رنگ کے خیالات کو نظم کرنے پر اصرار کرتے ہیں:

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں　　ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

(کلیم عجم)

کلاسیکی شاعری کے تناظر میں قدیم و جدید کا امتزاج سیماب کی غزل بنا تھا۔ وہ تغزل کو شعر کی روح بتاتے ہیں اور لفظوں کے انتخاب کو بھی خاص اہمیت دیتے ہیں۔

'لوح محفوظ' کے یہ دو تصوف آمیز اشعار دیکھئے:

ناز ادھر، نیاز ادھر کتنا غلط نظام ہے　　حسن نہیں غنیم ہے، عشق نہیں غلام ہے

شمع پہ جل بجھا پتنگ، ہوگیا نذرِ برقِ طور　　حوصلۂ کلیم میں مجھ کو ذرا کلام ہے

(لوح محفوظ)

یہ اشعار تصوف کے باریک پردوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔ اللہ اوراس کے بندے کے درمیان ناز و نیاز کے باریک پردے پڑے ہوئے ہیں کہ بندہ سراپا نیاز مند ہے اور اللہ کو بندے کی یہ ادا پسند ہے۔کلیم، شمع و پروانہ یہ وہ استعارے ہیں جن سے اللہ اوراس کے مقرب بندے کے درمیان رشتوں کا اشارہ ملتا ہے۔

اس دیوان کی ایک اور غزل کا مطلع فانی دنیا کی صبح خیزی اور کائنات کے ذرّے ذرّے سے اللہ کی حمد وثنا کے مناظر کی طرف کیا خوب اشارہ کرتا ہے:

اٹھتا ہوں جب چمن میں، نمازِ سحر کو میں
سجدے میں دیکھتا ہوں، ہر اک برگ و بر کو میں
(لوح محفوظ،ص۵۰)

سیماب کی ہرغزل میں زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ وہ موضوعات کا تنوع، اظہار خیال پر قدرت، بحر و وزن میں جدت اور بلند و بالا معنی کے ایسے موتی پروتے ہیں کہ عقل سلیم اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

’لوح محفوظ‘ کی ایک اور غزل جو صفحہ ۳۷ پر دی گئی ہے، ۱۵اشعار پر مشتمل اس غزل کا ہر شعر عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا تخلیقی سفر ظاہر کرتا ہے۔اسی غزل کا ایک خاص شعر ہے:

اپنے دل کی محفل ویراں سجانے کے لیے اک نئی تصویر لے آئے ہیں ہر محفل سے ہم

علامہ کی غزلوں میں جہاں حسن و عشق کی معاملہ بندی نہایت ہی پا کیزہ لب و لہجے میں رقم ہوئی ہے، وہیں تصوف کے اسرار و رموز کی موشگافیاں بھی ہیں۔ ذہن رسا کے شعری کمالات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چونکہ سیماب وارثی تھے اور مولانا روم، حافظ، سعدی، عرفی، صائب، بیدل کے علاوہ غالب، اقبال اور مابعد شعرا کے فارسی کلام کا غائر مطالعہ کیا تھا اور خود بھی فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے لیکن خال خال نظموں کے مجموعوں میں یہاں وہاں فارسی کلام موجود ہے۔البتہ ’مثنوی معنوی‘ کا منظوم اردو ترجمہ علامہ کا غیر معمولی ادبی کارنامہ ہے۔

سیماب کے معاصرین میں کئی نامور شعرا کا طوطی بول رہا تھا اوران میں سے کئی ایک تو استاد کے منصب پر بھی فائز تھے۔غزل کا معیار بہت بلند تھا،مجال تھی کہ کسی شاعر کے ہاں کوئی فنی جھول نظر آ جائے۔ طرحی مشاعروں کا رواج، اصلاحوں پر اصلاح (دستورالاصلاح، علامہ سیمابؔ کا گراں قدر ادبی کارنامہ) ادبی معرکہ آرائیاں،مختلف ادبی حلقے،تلامذہ کی چہل پہل یعنی ایک ایسا زرّیں دور کہ غیر منقسم ہندوستان میں جو ادبی رونقیں تھیں تقسیم کے بعد چند برسوں تک جاری رہیں۔اس کے بعد تو جمہوریت،کمیونزم اور سیکولرزم کے اثرات کے تحت ادب بھی تقسیم ہو گیا۔اساتذہ کی ایک فوجِ ظفر موج تھی، جو یکے بعد دیگرے لقمۂ اجل بنتی چلی گئی۔ ۱۹۵۰ کے آتے آتے مشاہیر شعرا میں سے بیشتر جاں بحق ہو گئے تھے۔

کلاسیکی شعرا نے غزل کو جن بلندیوں تک پہنچایا تھا اسے برقرار رکھنے میں علامہ سیماب کے معاصرین نے اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ایسے بھی نام نہاد شعرا موجود تھے جو گل و بلبل، شمع و پروانہ وغیرہ کے اظہار والی شاعری سے چپکے ہوئے تھے۔حالی اور آزاد نے اسی لیے غزل کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔اکبرالٰہ آبادی نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے ملک کے ذوق شعری میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوششیں کی تھیں۔چکبست، جوش اور ایسے ہی کئی نظم گوشعرا نے غزل کے بجائے نظم کو ترجیح دی تھی۔علامہ نے بھی غزل پر نظم کو ترجیح دی، یہی وجہ ہے کہ ایک زود گو شاعر کے صرف تین دیوان شائع ہوئے لیکن قدیم ادبی رسائل میں ان کا شائع شدہ وافر کلام ابھی مدوّن ہونا باقی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اوّلین مجموعۂ غزلیات 'کلیم عجم' نے اپنی اشاعت کے بعد غیر منقسم ہندوستان کے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔اس مجموعے پر تبصرے بھی لکھے گئے اور تنقیدیں بھی ہوئیں۔علامہ کے مخالفین نے جم کر حملے کیے ان میں نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، حامد حسن قادری شامل تھے۔سیماب نے اپنی غزلیہ شاعری کے ذریعے اپنے معاصرین سے الگ اپنا جادۂ شعر اختیار کیا تھا۔ ذیل میں دو غزلوں کے کچھ اشعار بطور مثال پیش کرتا

ہوں۔ملاحظہ کیجیے:

محبت عقل کے بس کی نہیں، راہِ جنوں پر چل　　　کہ رہرو، سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو
(لوحِ محفوظ)

اس شعر میں محبت کی کامرانی کے لیے عقل و مصلحت کو نہیں بلکہ جنوں کو کامرانی کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ وہی جنوں جو عقل کا رہزن ہوتا ہے مگر رہزن کو ہی رہرو سے زیادہ موقع ومحل کی آگاہی ہوتی ہے جس سے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ یہ رسمی شاعری سے ہٹ کر دلچسپ بات کہی گئی ہے۔

دوسرا شعر دیکھئے:

اے تن آسانی ہمارا دامنِ ہمت نہ کھینچ　　　مشکلوں کی حد تک آئے ہیں، بڑی مشکل سے ہم
(لوح محفوظ

اس شعر میں لفظ مشکل، دو طرح سے باندھا گیا ہے اور شعر کی زمین سے آسمان بنایا گیا ہے۔ ایک استاد شاعر سے ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی غزل کے ہر شعر میں کیا کیا فنی کمالات پیش کرسکتا ہے۔

یہ ہوا معلوم، تھے صدیوں سے محوِ بے خودی　　　دفعتاً چونکے جو آوازِ شکستِ دل سے ہم
(لوح محفوظ)

اردو شاعری میں 'دل' کثرت استعمال کے سبب ایک پامال لفظ ہے۔ اس پر بے شمار استادانہ اشعار اساتذہ کے دواوین و شعری مجموعوں میں مل جائیں گے لیکن علامہ کے ہاں دل جہاں معرفت الٰہی کا مسکن ہے، وہیں عشق والوں کے لیے رہنما اور عقل والوں کے لیے ان کا دشمن۔ دل میں اس کی دھڑکنیں زندگی ہیں اور ان کا رُک جانا موت:

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے　　　دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

علامہ سیماب نے دل کے مختلف مدارج بیان کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

دل کشا، دل آزما، دل سوز، دل جو، دل نواز　　　دل ہے عالم ساز، جو چاہیں بنالیں دل سے ہم
دیکھئے اس خانہ ویرانی کا کیا انجام ہو　　　اپنی دنیا لے کے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم

(لوحِ محفوظ)

لفظ 'دل' سے علامہ نے اپنے خیالات کو ہر رنگ میں باندھا ہے اور لاجواب اشعار اردو غزل کو دیے ہیں۔ یہ تین اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہائے وہ وعدہ کہ دنیا سے، لگائیں گے نہ دل — وائے مجبوری کہ اب دنیا سے فرصت ہی نہیں

(لوحِ محفوظ)

ڈھونڈا گیا تو کچھ بھی نہ نکلا سوائے غم — عاشق کا دل تھا، کیسۂ بازی گراں نہ تھا

(ایضاً)

اب حقیقت کھل گئی تو اس سے دل بے زار ہے — رنگِ ہستی تھا بہت دلچسپ جب تک راز تھا

سیماب کی غزلیں انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ سیماب چونکہ میر اور غالب کے ہم وطن تھے لہٰذا اردو غزل کے دو زندہ جاوید شعرا کا مزاج ان کے سامنے تھا۔ میر کی سی نازکی اور انانیت، غالب کا سا شعری فلسفہ اور اپنے معاصرین میں منفرد ہو جانے والی شعری کاوشیں، ان تین اوصاف نے سیماب کی غزل کو سیمابی بنا دیا تھا:

شامل وضع تھی خودداریٔ فطرت سیمابؔ — ہم جسے بھول گئے، پھر نہ اسے یاد کیا

(لوحِ محفوظ)

'کلیم عجم' اور 'سدرۃ المنتہیٰ' کی طرح 'لوحِ محفوظ' کی غزلوں کا بھی انتخاب ضروری ہے۔ اس مجموعے کی شعری کائنات کے تسلسل میں کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

جی چاہتا ہے عمرِ محبت نہ ختم ہو — مر جایئے کسی کی تمنا لیے ہوئے

(لوحِ محفوظ

دے کر فروغ قوتِ فکر و نظر کو میں — پھیلا رہا ہوں زندگیٔ مختصر کو میں

(لوحِ محفوظ)

یہ میرا تصورِ مستقل ہے مثالِ سایہ قدم قدم
میں اسی کے ساتھ ہوں دم بہ دم وہ کہیں رہے وہ کہیں سہی

(لوحِ محفوظ)

تجاہل کب تلک، آخر مجھے پہچان جائیں گے — کمالِ جہل ہی سے ابتدا ہوتی ہے عرفاں کی

(لوحِ محفوظ)

فکرِ دنیا کاوشِ عقبیٰ، غمِ عشق و وفا جتنے غم تھے سب خدا نے مجھ کو قسمت کر دیے

(لوحِ محفوظ)

تمھیں کو مانگتا ہوں تم سے، وہ ضدی بھکاری ہوں
مرے دستِ دعا میں خود ہی آجاؤ اثر ہو کر

(لوحِ محفوظ)

میں کیا کہہ کر پکاروں کس طرح آواز دوں اس کو تصور میں یہ کس کا جلوۂ بے نام آتا ہے

(لوحِ محفوظ)

فکر کو سیمابؔ آزادی کی دے کر وسعتیں مرتبے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیے

(لوحِ محفوظ)

علامہ سیماب کی غزلوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ گہری معنویت سے شعر کو کثیر الجہات معنی سے مملو کر دیتے ہیں۔ایک مثالی شعر دیکھئے:

وہ کرے یاد انھیں جس نے بھلایا ہو کبھی میں نے ان کو نہ بھلایا نہ کبھی یاد کیا

(لوحِ محفوظ)

اسی مفہوم کا ایک اور شعر فراق کا ملاحظہ ہو:

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

یہاں میں نبیرۂ سیماب افتخار امام صدیقی کا ایک مشہور شعر درج ذیل ہے:

ایک مدت ہوئی، خود کو نہیں سوچا میں نے کوئی لمحہ تیری یادوں کے سوا بھی گزرے

اردو کلاسیکی شاعری میں 'یاد' کے موضوع پر بے شمار اشعار مل جائیں گے۔ غالب کا یہ شعر دیکھئے:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ علامہ سیماب نے اپنی نظمیہ شاعری کے علاوہ غزلوں میں بھی جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ اکیسویں صدی میں سچ ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ ایک

غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے:

روان ہیں خون کے دریا مساجد سے شوالوں تک
فضول اب ظرف شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
(لوح محفوظ)

مجموعی طور پر 'لوح محفوظ'، 'کلیم عجم' اور 'سدرۃ المنتہیٰ' میں شامل غزلوں کے بتدریج شعری سفر کا آخری پڑاؤ ہے۔ اس میں وہ غزل بھی شامل ہے، جو سیماب نے بستر علالت پر کہی تھی جب انھیں فالج کا دورہ پڑا تھا، اُن دنوں وہ کراچی میں مقیم تھے۔ یہ ۲۳؍نومبر ۱۹۵۰ کی بات ہے۔ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے؛

رنگیں ترا عذار ہے میری نظر سے دور گلشن مع بہار ہے، میری نظر سے دور
(لوح محفوظ)

سیمابؔ جیسے باغ سے ہو دور فصل گل یوں چہرۂ نگار ہے، میری نظر سے دور
(ایضاً)

سیماب کی غزلوں نے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۰۰ سے ۱۹۵۰ تک ہندوپاک کے مقتدر ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ علاوہ ازیں ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی ان کا کلام بہ زبان 'شاعر' نشر ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں ریڈیو والے ایک رسالہ 'آواز' شائع کرتے تھے۔ یہ رسالہ علامہ سیماب کی سرورق تصویر کے ساتھ ان کے نشریوں کی تفصیلات بھی شائع کرتا تھا۔ گلوکار، بطور خاص ان کا کلام گاتے تھے۔ بالخصوص کندن لال سہگل نے علامہ کی آٹھ غزلیں نہایت ہی پرسوز آواز میں گائی تھیں بلکہ سیماب و سہگل کے درمیان دوستانہ مراسم بھی تھے۔ اس کے علاوہ ہندوپاک کے دیگر غزل گلوکار یعنی جگجیت سنگھ، مہدی حسن، منی بیگم وغیرہ نے بھی ان کی غزلیں گائی ہیں جو کہ کیسٹوں

میں موجود ہیں۔

میں اب یہاں 'لوحِ محفوظ' کے بارے میں مشہور نقادانِ سخن کی آرا نقل کرتا ہوں۔ سید عبداللہ لکھتے ہے:

''شاعر اپنی دور بین نظروں سے آنے والے زمانے کے متعلق
پیش گوئی کر رہا ہے، مغرب زدہ معاشرہ اپنی جڑیں پکڑ رہا ہے
اور اس نے چونکہ روایت اور اپنی مذہبی اقتدار سے اپنا رشتہ قائم
رکھا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ قوم اور ملت کو جدیدیت سے
قریب لا رہا ہے اور خود بھی جدید ذہن سے کام لے رہا ہے۔
روایت سے رشتہ توڑنا اسے پسند نہیں مگر روایت کے استحکام ہی
کی خاطر ایک نئے اندازِ احساس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور
قوم کو نئی راہوں اور نئی منزلوں کے نشانات دکھا کر ان کے مفاسد
سے بچنے اور ان کے محاسن سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتا ہے
اور وہ یوں ہے کہ:

ضرورت سوزِ نو کی ہے مرے ذوقِ تپیدن کو
ذرا پھر طور سے آواز دینا برقِ ایمن کو

(۸)

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

سید عبداللہ نے 'لوحِ محفوظ' کی متعدد غزلوں سے مثالیں پیش کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

میں کسی سے دنیا میں آشنا نہیں سیمابؔ خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے

(ص ۱۷)

'لوحِ محفوظ' کی ایک غزل میں سیماب ایک ذہنی انقلاب سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہ تعلیم کا دور ہے اور اس سے عجیب وغریب اثرات مرتب ہو رہے ہیں لیکن شاعر نے کہیں بھی

ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ مایوسی کو گناہ عظیم تصور کرتے ہیں ان کا حوصلہ دیکھئے:

میں زنداں میں ہوں منظر ہے تصور میں گلستاں کا
کوئی ہے روکنے والا، مری فکرِ خراماں کا
نکل ہی آئے گا اک دن سراغِ راہِ آزادی
کہیں تو ختم ہوگا سلسلہ دیوار زنداں کا

سید عبداللہ کا پانچ صفحات پر مشتمل مکمل مضمون علامہ سیماب کی ان تمام غزلوں کا عمیق مطالعہ ہے جو 'لوحِ محفوظ' میں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ترقی پسندوں کی پسندیدہ لفظیات وشعری تراکیب کا جس قدر تخلیقی اظہار علامہ نے کیا ہے، وہ ترقی پسندوں کا منشور معلوم ہوتا ہے جب کہ ۱۹۴۳ تا ۱۹۵۰ یعنی انتقال سے قبل کی غزلوں کا اسلوب و آہنگ اور جدوجہد آزادی ہند کا دردمندانہ اظہار ہے۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ۱۹۳۶ سے ہوئی تھی، لیکن ترقی پسند نقادوں نے سیماب کی شاعری کو نظرانداز کردیا۔

مشہور نقاد، ادیب اور محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی 'لوح محفوظ' کی غزلوں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

'سیماب صاحب کے اس مجموعے کے یہ چند اشعار دیکھئے، آپ ہی کا درد پتہ دیتے ہیں:

یہ رسمی انقلابِ وقت تکلیفِ نظر کیوں ہو
قفس میں شام ہوجائے تو ہوجائے سحر کیوں ہو
گریبانِ گل و دامانِ لالہ بھی ہے گلشن میں
مجھ ہی پر التفاتِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو

اسیری اورایسی بے بسی اللہ رے مجبوری
کسی نے یہ نہ پوچھا آج تم بے بال و پر کی ہو

ابواللیث صدیقی آگے لکھتے ہیں:

''یہ چند اشعار میں نے صرف اس مجموعے کی ورق گردانی سے اخذ کر لیے ہیں۔ ورنہ ایسی بہت سی مثالیں اس میں موجود ہیں۔ ان میں ایک طرف عصر حاضر کا شعور ہے اور ایک طرف وہ احساس جو ان حالات و واقعات کو جذبے کی صورت دیتا اور الفاظ کی تشکیل کرتا ہے۔ سیماب صاحب کو ان دونوں پہلوؤں پر قدرت حاصل ہے''۔

اس کے بعد وہ یوں رقمطراز ہیں:

''اس مختصر تعارف کو میں نے سیماب صاحب کی اس غزل پر ختم کرتا ہوں اور آپ کو اس مجموعے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں''۔ (۹)

جو غزل صدیقی صاحب نے بطور مثال پیش کی ہے، اس کا مطلع ہے:

وطن کے بعد اربابِ وطن کی آزمائش ہے　　چمن سے دور یارانِ چمن کی آزمائش ہے

اسی غزل کا مقطع دیکھئے:

بڑا فکر آزما یہ دور ہے سیمابؔ کیا کہیے　　ہر اک میدان میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
(لوحِ محفوظ)

'لوحِ محفوظ' میں علامہ کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر نقل کرتے ہوئے اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ 'لوحِ محفوظ' کی غزلیں کلاسیکی اردو غزل کا انتہائی کامیاب اور مثالی سرمایہ ہیں:

سیماب جلوہ تابِ زبان و ادب ہوں میں　　اردو کا ارتقا مرے رنگِ سخن میں ہے
(لوحِ محفوظ)

(ب) بحیثیت نظم نگار

یوں تو سیماب اکبرآبادی کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی، لیکن ان کے زمانے میں غزل کی شکست وریخت کے لیے ایک محاذ تیار ہو چکا تھا۔شعرا کی اکثریت نظم کی طرف راغب ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی ۔سیماب نے شاعری کو محض فن ہی سمجھ کر اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ شعور کی بالیدگی اور فہم وادراک کی پختگی نے ان پر منکشف کر دیا تھا کہ اس سے ایسا کام لینا ہے جو قوم کے تابناک مستقبل کا ضامن بن سکے۔اسی لیے انھوں نے عوام کا رجحان دیکھ کر نظمیہ پیرایہ اختیار کیا تاکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسانیت کی خدمت کر سکیں۔انھوں نے غزلوں میں بڑی وسعت پیدا کی اور ہر قسم کے حقائق ومعارف،حیات وممات،سیاست وتمدن،معاشرت و تہذیب و دیگر مسائل کو ظرف غزل میں سمویا۔پھر بھی نوجوان طبقے کے رجحان نے نظم کی وسعت کا مطالبہ کیا اور زمانے کے نبض شناس ہونے کی وجہ سے سیماب نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی پیرایہ اظہار بنایا۔وہ اپنی کتاب ''خطبات کلیم عجم'' میں لکھتے ہیں:

''نظم غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنف کلام ہے۔'' (۱۱)

علاوہ ازیں ایک روایتی غلط فہمی یہ بھی چلی آتی تھی کی غزل صرف عشق وعاشقی کے لئے ہی محدود ہے۔اس لیے نظم میں وسعت چاہنے والا طبقہ غزل سے ان ہی باتوں کو وابستہ کر چکا تھا۔اور اگر یہ طبقہ غزل گوئی کی طرف مائل بھی ہوتا تو تقلیدی اور غیر فطری مسائل ہی کو غزل میں جگہ دے دیتا اور بے وقت کی راگنی الاپے جاتا۔ویسے سیماب تغزل سے بالکل ہی منحرف نہیں ، بلکہ تھوڑی سی تجدید کے ساتھ اس کے پابند بھی ہیں اس لئے وہ اپنی کتاب ''خطبات کلیم عجم'' میں لکھتے ہیں:

''اگر تقلید کرنی ہے تو عرب اور یوروپ کی کیجئے جہاں شاعری کا
موضوع کم از کم غیر فطری تو نہیں اور جہاں مناظر فطرت کی تصویر

کشی اور حقیقی جذبات کی ترجمانی کا نام شاعری ہے''۔(۱۲)

وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اردو شاعری میں کوئی ایسا مجدد اور مجتہد پیدا ہو جو اردو شاعری کو کم از کم موضوعی اور اساسی تقلید سے آزاد کر دے۔ تا کی تقلید کی ظلمتیں چھٹ جائیں اور تجدید کی روشنی سے مطلع منور ہو جائے، جب وہ دوسرے شعرا کے لئے اس قسم کی رائے رکھتے تھے تو ظاہر ہے کہ انھوں نے خود بھی اس پر عمل کیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کو رسمی و تقلیدی عناصر سے آزاد کرانے کا وسیلہ نظم کو پایا۔ ان کے نزدیک شاعر کا مقصد بہت بلند ہے۔ وہ انقلاب کا داعی اور بیداری کا پیغامبر ہے۔ اسی لئے انھوں نے فرضی محبوب کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کی داستان ہجر و وصال کو بیان کرنا ایک حقیقی شاعر کے شایان شان نہ سمجھا۔ بلکہ زمانے کے بے شمار توجہ طلب مسائل اور موضوعات پر قلم اٹھا کر شاعری کو زندگی کی مشعل بنا دیا۔ انھوں نے اپنے ''خطبات کلیم عجم'' میں بھی شعرا کو پیغام دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بحیثیت شاعر قوموں کو ابھارنے، ملک کو بیدار کرنے اور جمود و
> خمود کے پردے کو چاک کرنے میں اپنی الہامی قوتوں کو بروئے
> کار لائیں۔'' (۱۳)

سیماب کو اس کا بات کا احساس تھا کہ بحیثیت شاعر وہ سماج کا ایک اہم اور عزیز رکن ہے۔ اس لئے اپنی شاعری کو غزل گوئی تک محدود نہ رکھتے ہوئے انھوں نے نظم گوئی کی طرف پیش قدمی کی۔ سیماب جانتے تھے کہ اس وقت قوم کو سلانے کی نہیں بلکہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور جمود و خمود کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔ ان کے نظمیہ پیرایا اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ غزل کو اس قسم کے پیغامات کا حامل بنا کر اس کی نزاکت اور لطافت، نفاست و شیرینی کو بھاری بھرکم الفاظ اور گرجدار لہجہ سے مجروح کیا جائے۔ انھوں نے ابتداً اپنے زمانے کے اہم واقعات، سیاسی رجحانات اور سیاسی میلانات کو نظم میں پیش کیا اور جنگ بلکان، جنگ طرابلس، فلسطین، بغاوت افغانستان، جنگ عظیم کے نقوش وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر نظمیں

لکھیں۔

اردو میں نظمیہ شاعری کی ابتدا حالی، آزاد اور شبلی سے ہوئی۔ سیماب کے زمانے تک اس کی مقبولیت اور ہردلعزیزی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اکثر مشاعروں میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظموں کو بھی جگہ ملتی رہی۔ رسائل میں غزلوں کے پہلو بہ پہلو نظمیں بھی شائع ہوتیں۔ آخر کار نظم ایک ایسا آلہ بن گئی جس سے سیاسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر انقلابی نعرے لگائے جا سکتے تھے۔ معاشرت کی اصلاح کے لئے آواز بلند کی جا سکتی تھی، دلوں میں حصول آزادی کی تمنا جگائی جا سکتی تھی اور حب الوطنی کا صور پھونکا جا سکتا تھا۔ سیماب نے اس کی اہمیت اور افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا، اسمیں حب الوطنی کے ترانے گائے، سیاسی مسلک کو واضح کیا، معاشرت کی اصلاح کی، قوم میں روح ترقی پھونکی، انسان اور انسانیت کی ارفع واعلی منزلوں کی بشارت دی۔

سیماب نظم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں:

> ''میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہو، اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے غزل جس صنف کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعرا متغزلین اس صنف کو بہ تمام وکمال پامال اور ختم کر چکے۔ منتہی شعرا کے لیے غزل میں اجتہاد وایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے، مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنف سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے اس لئے زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہونی چاہئے۔'' (۱۴)

سیماب غزل اور نظم دونوں پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ فن کی دل آویزی غزلیہ اور نظمیہ دونوں پیکروں میں نمایاں ہوتی ہے۔ جہاں انہیں غزل کے لئے ان کے ولی،

میر، غالب، مومن اور داغ جیسے اساتذۂ فن سے قیمتی ورثہ ملا وہیں نظم نگاری کے لئے سودا، میر حسن، انیس و دبیر، حالی، آزاد، شبلی اور نظیر اکبر آبادی کے یہاں سے ارتقائے نظم کا ایک احساس ملا۔ چنانچہ نظم نگاری میں انھوں نے اپنی اجتہادی قوتوں سے کام لیکر جدت و انفرادیت پیدا کی ،شعریت وفن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دور کے زندہ احساسات کو نظموں میں سمویا ،زندگی و ماحول کو فکر وفلسفہ کا وہ رنگ دیا کہ اردو حلقہ چونک اٹھے۔ ایک نمایاں بات یہ ہے کی سیماب نے اپنے ہم عصر بڑے نظم نگاروں کی طرح اپنی نظموں کو محض اسلامی فکر وفلسفے، محض وطنی اور سیاسی یا محض انقلاب کے نعروں تک محدود نہ رکھا، بلکہ انھیں موضوعاتی اور تکنیکی تنوع بھی بخشا۔

سیماب ایک فطری شاعر تھے، تخیل و وجدان ان کے رہنما تھے۔ فن شعر، عروض، بیان وبدیع پر انھیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ وہ جس بات کو جس ہیئت میں جتنے مؤثر انداز میں کہنا چاہتے، کہہ دیتے، چنانچہ ہیئت اور صنف کا انتخاب سیماب کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسی لیے غزل، نظم اور رباعی وغیرہ کے توسط سے انھوں نے اپنے جذبات وخیالات کو بآسانی پیش کیا ہے اور حسب ضرورت اوزان وبحور میں بھی وہ جزوی تبدیلی کر لیتے تھے۔ شعر کی بلندی، طرزِ بیان کی پختگی اور غیر معمولی اثر انگیزی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے اپنے خطبات ''کلیم عجم'' میں بھی اپنے فکر وفن پر بہت واضح طور پر روشنی ڈالی ہے جس کی مثالیں آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

سیماب اپنے عہد تک کی شاعری پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ نئی شاعری حقیقت پسندانہ ہوتا کہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور سماج میں تعمیری انقلاب کا سبب بن سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''حقیقی شاعری وہی شاعری ہے جو ہماری روح کو جھنجھوڑ دے،

ہمارے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کردے اور ہمارے دماغ
کو اپنے اثرات سے متکیف کر کے ہمیں سرخوشی و بے خودی کا
اہل بنا دے''۔ (۱۵)

اپنے دوسرے خطبے میں محض تصوراتی شاعری کے مقابلے میں شاعری کے زمینی اور حقیقت پسندانہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''اب فرضی عشق ومحبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا، اب مجازی
جذبات وصل وفراق کی نقالی کا موقع نہیں ہے۔ حقیقی موضوعات
اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف
متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہیں ملنی چاہیے''۔ (۱۶)

سیماب کے یہ افکار بہت بلند اور ولولہ انگیز تھے۔ اسی لیے انھوں نے شاعری کو نت نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ انھوں نے بہت لکھا، ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے متعدد مجموعے ان کے شاعرانہ کمال کی عمدہ مثال ہیں۔

نیستاں (۱۹۲۵)

سیماب کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''نیستاں'' ہے۔ اس کی اشاعت ادارۂ قصر الادب، آگرہ سے نومبر ۱۹۲۵ میں ہوئی۔ اس مجموعہ میں ۵۸ نظمیں شامل ہیں، جن کو (۱) حجازیات (۲) اسرار (۳) محمل (۴) جنت کے خطوط کے زیر عنوان تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ پورا مجموعہ سیماب کی مذہبی سرشاری کا مظہر اور شدت جذبات سے معمور ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے محبت، رسول کریمؐ سے عشق، خلفائے راشدین، اصحاب، اہل بیت اور دیگر صحابہ کرام سے عقیدت ومحبت ہر ہر گوشے سے جھلکتی ہے۔

سیماب عربی اور فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ بہت سے فارسی شعرا کا کلام تو انھیں مستحضر تھا اور خود بھی فارسی میں بہت اچھے شعر اور تضمینیں کہتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور ان

کے پاس الفاظ کا خزانہ بھی وسیع تھا۔ الفاظ کے استعمال پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اسی طرح نئی نئی تراکیب کی اختراع پر بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہو یا رسول اکرمؐ کی شان اقدس میں گلہائے عقیدت نچھاور کرنے کا موقع، وہ مسلسل ومتواتر صفات اور مترادفات پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''ترانۂ وحدت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ شمس و قمر یہ ارض و سما، سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر رنگ میں ہے تیرا جلوہ، سبحان اللہ سبحان اللہ
جلوے تیرے گلشن گلشن، سطوت تیری صحرا صحرا
رحمت تیری دریا دریا، سبحان اللہ سبحان اللہ
معمور ترے ہی نور سے ہے پرنور ترے ہی نور سے ہے
کونہ کونہ چپہ چپہ، سبحان اللہ سبحان اللہ
وہ نشہ خمار الفت کا، وہ جام مئے انسیت کا
وہ کیف شرابِ محبت کا، سبحان اللہ سبحان اللہ

سیماب جس طرح خدا کی حمد وثنا سے سرشار نظر آتے ہیں، اسی طرح جب رسول خداؐ کی نعت پاک لکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو عشق رسول میں سرشاری واستغراق کی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ ''خورشید رسالت'' کے عنوان سے پیش کردہ نظم میں مسلسل صفحات میں، پے در پے تراکیب لاتے ہیں اور فارسی واردو کے جن شعرا نے نعتیہ قصائد لکھے ہیں ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ''خورشید رسالت'' سے صرف دو بند یہاں پیش ہیں:

آئے جناب مصطفیٰ، ان پہ درود و سلام   آیۂ رحمت خدا، ان پہ درود و سلام
خاتم جملہ انبیا، ان پہ درود و سلام   ان پہ صلوٰۃِ دائمہ، ان پہ درود و سلام
صلِ علیٰ محمدؐ صلِ علیٰ محمدؐ

قطرہ ہے بحر کائنات اس کے یم وجود کا　　ذرہ ہے بزم دو جہاں، آبروئے شہود کا
مژدۂ بخشش گناہ، فیض ہے اس کے جود کا　　اُمتیانِ مصطفیٰ وقت ہے یہ درود کا
صلِ علیٰ محمدٍ، صلِ علیٰ محمدٍ

سیماب کے یہ اشعار عشق رسولؐ کے جذبہ سے سرشار ہیں اور ان کے پڑھنے سے قاری پر ایک وجدانی وانبساطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

''نیستاں'' میں حجازیات کے تحت جو نظمیں شامل ہیں ان میں ترانۂ وحدت، خورشید رسالت، مکہ کی ایک صبح، اے وہ کہ تو سب کچھ ہے، عرض بیداری، استغاثہ (دربار رسولؐ میں)، گھٹا مدینے سے، گنبدِ رسول سے، پھولوں کی چادر، طواف کعبہ اور اے قافلے والو، سے شاعر کی کیفیات، روح کی پاکیزگی، جذبات کی بلندی اور بیان کی بے ساختگی قدم قدم پر عیاں ہے۔ ایک مومن کے اندر رسول اکرمؐ، اہل بیت کرام اور صحابہ کرام سے جس قدر محبت ہونی چاہیے، سیماب کی مذکورہ نظمیں اس کی بہترین مظہر ہیں۔ سیماب نے الفاظ کے انتخاب میں بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان کی تراکیب اور بندش الفاظ، شستگی اور شائستگی سے معمور ہیں۔ سیماب کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ ان مقدس خیالات کی ادائیگی کے لیے الفاظ بھی پاکیزہ اور مقدس ہونے چاہئیں، اس لیے حجازیات کی تمام نظموں میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے اور ہر نظم پاکیزگی میں طاق ہے۔ نظم ''مکہ کی ایک صبح'' میں ان کی فصاحت و بلاغت کی عمدہ مثالیں موجود ہیں:

ناگہاں پیدا ہوئے عالم میں آثار سحر　　مشرقِ طلعت پر گھر کر آئے انوارِ سحر
مطلع ظلمت پہ چھایا رنگِ بیدار سحر　　آمدِ خورشید کی لایا خبر تارِ سحر
ایک چشم منتظر تھا، صبح کا تارا نہ تھا

مشرق طائف کی فطرت میں جو آیا انقلاب　　جلوہ گر سورج ہوا اک اور قبلِ آفتاب
بے عدیل و بے مثال و بے نظیر و لاجواب　　مجتبیٰ، بدرالدجیٰ، شمس الضحیٰ گردوں جناب
آفتاب اس کے رخ پرنور کا پروانہ تھا

پھر تو مکہ کیا، زمانے میں اجالا ہوگیا ‏ رات کا منہ نور کی کثرت سے کالا ہوگیا
مطلع عالم کا چہرہ حسن والا ہوگیا ‏ لیجیے شمس الضحیٰ کا بول بالا ہوگیا
اس کی ضوئے حسن سے آباد ہر ویرانہ تھا

ابتدائی دور کی نظموں میں سیماب کا مذہب سے لگاؤ ایک پختہ عقیدت مند کی طرح زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور انھیں اس بات کا یقین کامل ہے کہ سرکار دو عالم شافع محشر ہیں اور روز محشر ان کی شفاعت کریں گے۔ یہی یقین اور محبت کا اثر ان کی نظم ''پھولوں کی چادر میں'' میں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے مزار رسول کے لیے پھولوں کی جس چادر کی تمنا کی تھی وہ ان کی عقیدت ومحبت واحترام کی شاہد ہے:

چادرِ گلگوں چڑھا کر مرقدِ سرکار پر ‏ میں ترا افسانہ لاؤں گا لب اظہار پر
تیرے پھولوں سے جو پیدا ہوگی بوئے بیکسی ‏ حال ہوگا تیرا ظاہر سیّد ابرار پر
ان کے اوراق پریشاں سے ٹپک نکلے گی یاس ‏ رنگ چھا جائے گا قبر احمد مختار پر
دیکھ کر یہ حال یہ رنگ اور یہ کیفیتیں ‏ پڑ ہی جائیں گی نگاہیں چادرِ گلنار پر
چشم خواب آگیں مگر، باصد حجاب آید بروں
نرگس مخمور شاید از نقاب آید بروں

''پھولوں کی چادر مزار رسول کے لیے'' میں انھوں نے پہلے اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھر رسول اکرمؐ کے فیض وشفقت کا بیان کیا ہے۔ ہر مومن کی طرح سیماب کا بھی جذبۂ ایمانی تازہ اور پختہ ہے۔ چونکہ وہ بھی طواف کعبہ کا اشتیاق رکھتے ہیں اور مدینہ منورہ کی زیارت کے متمنی ہیں اس لیے طوافِ کعبہ، اے قافلہ والو، ہوازن اور جنت البقیع وغیرہ نظموں میں وہ عشق رسول میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کیفیت سے قاری کو بھی ایمان وایقان کی روشنی ملتی ہے۔ مزید برآں اسی جوش قلب کے ساتھ ساتھ شاعرانہ لطافت ومہارت نے نظم میں زبردست دلکشی پیدا کردی ہے۔

سیماب نے اس دور میں ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات اور صحابہ کرام کے اعلیٰ کارناموں پر مشتمل ہیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا مقصد اُن بزرگوں کی عظمت کا احساس دلانا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان سے محبت کے جذبات پیدا ہوں اور ان کے اندر اسوۂ حسنہ کو پروان چڑھایا جاسکے۔ اس زمرہ میں ان کی نظمیں اسوۂ رسول، اصلاح الاعمال، خدیجۃ الکبریٰ، ایثار بتول، استغناز ہرااور بلال وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

ان نظموں میں سیماب نے اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کے اخلاق حسنہ حلم ومروت، ایثار وقربانی کے مثالی نمونے پیش کرکے ان اوصاف کو اپنی زندگیوں میں ڈھالنے کی تلقین کی ہے، تاکہ ان کی تالیف قلوب ہوسکے۔ نظم اسوۂ رسول میں اس دور کی حق گوئی اور پاک بازی کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ حق وانصاف کی ایک عمدہ مثال وہاں بھی نظر آتی ہے جب مسلمان مالِ غنیمت کے حصے کی تقسیم کے سلسلے میں اختلاف اور غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن حضور اکرمؐ نے جب انصاف کیا تو تمام اختلاف ختم ہوکر ان میں اتحاد واتفاق ہوگیا۔ یہ سب واقعات سیماب کے عشق رسول واہل بیت وصحابہ کرام سے محبت اوراس میں سرشاری کے واضح ثبوت ہیں۔ اس نظم سے یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

حضور کہتے تھے جو بات اس جماعت سے — صدا نکلتی تھی آمنّا اور صدقنّا
وہ لوگ کہنے لگے ہاں خدا اور اس کا رسول — ہے سب سے بڑھ کے ہمارے لیے مضرما
یہ سن کے آپ نے ان سے بزور فرمایا — یہ بات تم نہ کہو، بلکہ یوں کہو بابا
کہ اے محمد اسی وقت ہم نے کی تصدیق — تجھے جو لوگوں نے دنیا میں آکے جھٹلایا
کہ اے محمد اسی دم پناہ دی تجھ کو — جو تجھ کو چھوڑ کے لوگوں نے بغض تجھ سے کیا
مگر ذرا یہ بتائیں تو معشر انصار — کہ کیا پسند نہیں ان کو فیصلہ ایسا
کہ لوگ بکریاں، اونٹ اور سیم و زر لے جائیں — وہ اپنے گھر میں محمد کو لے کے جائیں بھلا
یہ سن کر چیخ اٹھے جتنے جمع تھے انصار — کہا کہ ہم کو تو درکار ہے رسولِ خدا
بہت سے روئے کچھ ایسے کہ تر ہوئی داڑھی — تڑپ تڑپ کے بہت سے ہوئے نثار و فدا

کسی کو جذب تھا اور مست ہو رہا تھا کوئی
زبانِ حال سے کوئی یہ نظم پڑھتا تھا

اسی طرح کے اشارے ان کی دوسری نظم ''اصلاح الاعمال'' میں بھی کیے گئے ہیں، جس سے نظم میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔

سیماب کی نظم ''روداد بیداد'' اور ''فریاد'' اقبال کے ''شکوہ'' اور حالی کی ''مدوجزر اسلام'' کے رنگ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں سیماب نے اقبال کی طرح خدا سے بے باکی کے برخلاف بارگاہ ایزدی میں نہایت ہی ادب واحترام کے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور انھیں اس سے نکالنے کی التجا کی ہے۔ نظم بیداد کی ابتدا انھوں نے بہت عجز وانکسار سے کی ہے اور اسی طرح کے اظہار مندی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

> ''نظم بیداد کی ابتدا ہی میں خدا کی بارگاہ سے کوثر میں نہائی ہوئی، لطیف، پاکیزہ، دردہائے مضامین اور انوار کے موتی رولنے والی زبان کی تمنا کی ہے۔ بارگاہ لم یزل میں ان کے التماس کو شرفِ باریابی ملا اور ان کی غنچہ دہنی گل صد برگ بن کر شعلہ فشاں ہوگئی ہے۔''(۱۷)

''روداد بیداد'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ضبط کو ہے یہ گلہ دیکھ کے خاموش مجھے   لبِ ساکت نے کیا مانعِ صد جوش مجھے
کردیا نطقِ حقیقت نے فراموش مجھے   تھی زباں منہ میں کبھی یہ بھی نہیں ہوش مجھے

ہوئی تقسیم کہیں نالہ فشانی میری
زنگ آلود ہے اب سیف بیانی میری

یا نبی سچ تو یہ ہے جان سے بیزار ہیں ہم   کوئی یاور ہی نہیں بیکس و لاچار ہیں ہم
ہاں گنہگار ہیں ہم سخت گنہگار ہیں ہم   آپ سے اب تو معافی کے طلب گار ہیں ہم

عاصیانیم بہ امّیدِ کرم آمدہ ایم
لطف کن لطف کہ پامالِ ستم آمدہ ایم

ہائے اسلام کا اب کوئی سہارا نہ رہا صبر کی خوب کہی! صبر کا یارا نہ رہا
بیچ میں آگئے ہم پاس کنارہ نہ رہا جو خدا سب کا تھا کیا اب وہ ہمارا نہ رہا
بے قراروں کو اثر وقت دعا بھول گیا
اب تو کہنے دو کہ بندوں کو خدا بھول گیا

دونوں شعر کے اسلوب اور لہجے میں مماثلت کے ثبوت میں اقبالؔ کے شکوہ کا صرف ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

جیسا کہ عرض کیا گیا، سیماب نے نظم ''روداد بیداد'' میں جہاں ایک طرف شعلہ بیانی کی ہے تو وہیں دوسری طرف بھرپور انکسار کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ جہاں اللہ رب العزت سے شکوہ کرتے ہیں وہیں آہ وزاری بھی کرتے ہیں اور رسالت مآب حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں دست بستہ ادب واحترام سے درخواست گزار بھی ہیں جس میں ان کی نگاہیں فرطِ ادب سے جھک جاتی ہیں۔ مثلاً:

یا نبی وقتِ بد آیا ہے مسلمانوں پر جو ہوئی دیر تو بن جائے گی اب جانوں پر
ہو چکا قبضۂ اغیار خدا خانوں پر نظرِ رحم، کہ بات آگئی ایمانوں پر
ہوا ایمان کو نقصاں تو ہے نقصان کی بات
جان سے بڑھ کے ہے ایمان یہ ہے ایمان کی بات

منقولہ بالا اشعار میں سیماب نے اظہار کا جو رنگ اختیار کیا ہے، ذیل کے اشعار میں وہ اس سے مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہاں حسب موقع ملائمیت کو برتا گیا ہے:

ہاں خدا کے لیے غم خوار غریباں ہونا کہ ابھی درد کا آسان ہے درماں ہونا
تھا نصیبوں میں شکارِ غم پنہاں ہونا کیا بڑی بات ہے تسکین کا ساماں ہونا
نظر لطف غریبوں پہ اگر ہوجائے
شب تاریک مصیبت کی سحر ہوجائے

سیماب کا اپنے مدعا کو طلب کرنے کا انداز ایسا ہے کہ خدائے لم یزل کی رحمت جوش میں آجائے۔ نظم ''فریاد'' اسی جذب وسلوک کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں رحمۃ للعالمین کی بارگاہ میں فریاد کی ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی کے الفاظ میں:

''اقبال کی نظم شکوہ، سیماب کی فریاد اور آغا حشر کی شکایت ایک ہی زمانے کی لکھی ہوئی تھیں، تینوں نظموں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان نظموں کو اس دور کے مسلمان رو رو کر پڑھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں اتنی اثر انگیز نظمیں لکھیں جو کہ شعریت سے لبریز ہیں۔'' (۱۸)

نظم ''فریاد'' سے یہ بند ملاحظہ ہو:

داد منظور نہیں قابل بیداد ہوں میں خوگر داد ہوں آزردۂ افتاد ہوں میں
اپنی ملت کے لیے خستہ و ناشاد ہوں میں اک بڑی بات سے آمادۂ فریاد ہوں میں
وہ جسے دردِ محبت کی دوا کہتے ہیں
ہاں خدا تو نہیں محبوبِ خدا کہتے ہیں

نظم ''فریاد'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیماب کے دل میں احساسات وجذبات کا سیلاب اُمڈا چلا آیا ہے۔ قوم کے لیے درد وغم، کرب وخلش نظم میں پوری طرح نمایاں ہے، جس کو پڑھ کر عجیب کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اندازِ بیان بے حد دلکش وموثر ہے:

پہلے ہم صاحب اورنگ تھے اور مالکِ تاج آہ! اک ناں جویں کے لیے بیتاب ہیں آج

نہ حکومت ہے نہ ثروت ہے نہ دولت ہے نہ راج　　اس سے پہلے تو نہ تھے ہم کبھی ایسے محتاج

گوہر و لعل سے مملو تھا خزانہ اپنا

ہائے وہ دن کہ موافق تھا زمانہ اپنا

آہ! آبادی اسلام کی بربادی ہے　　جو ستم کیش ہے، آمادۂ جلادی ہے

جاں شکن غیر کی طرزِ ستم ایجادی ہے　　تنِ مجروح لبِ زخم سے فریادی ہے

یادگارِ ز وفاداریٔ بسمل باقی ست

قطرۂ خوں بسرِ دامن قاتل باقی ست

اسی نظم میں سیماب نے رسالت مآبؐ کے حضور میں بڑی اضطرابی کیفیت سے دعا مانگی ہے:

تو ہو پیدا، تو کوئی شکل ظفر ہو پیدا　　مردہ اجسام میں ہستی کا اثر ہو پیدا

پھر ہر اک جسم میں اعجاز سے سر ہو پیدا　　عالمِ حال میں دنیائے دگر ہو پیدا

یہ جو زندہ ہیں تو اسلام بھی زندہ ہوجائے

ٹھوکریں کھاکے ہر اک نفس مسیحا ہوجائے

''نیستاں'' کی دیگر نظموں میں طور کی چوٹی، عرفانِ نفس، جلال و جمال، دعوت روح، ہمہ اوست تو ہی ہے، ڈھکوری کا محویت خانہ وغیرہ شامل ہیں، جن میں ان کے خیال کی گہرائی و گیرائی نمایاں ہے۔ ان فلسفیانہ مضامین سے معمور متصوفانہ الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات پر مبنی نظموں کے مطالعہ سے سیماب کے تخیل کی گہرائی، فکر کی بلندی، مطالعۂ کائنات پر دست رس اور زبان و طرز ادا کی کثیر جہتی و تاثیر کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

''ڈھکوری کا محویت خانہ'' سیماب کی ایک تمثیلی نظم ہے۔ اس میں استعاروں اور کنایوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ بہت دلکش اور مؤثر نظم ہے۔ اس کے بارے میں خود سیماب میں لکھتے ہیں:

''ڈھکوری ایک چھوٹا سا پردار جانور ہوتا ہے۔ اسے ہر وقت جھینگر
کی تلاش رہتی ہے۔ جب جھینگر کسی سوراخ میں مل جاتا ہے تو
اسے پنجوں میں دبا کر اپنے گھر لے جاتی ہے اور وہاں اسے اپنے

سامنے رکھ کر اس پر اپنا تصور جماتی ہے اور ایسی محوِ تصور ہو جاتی ہے کہ خود فنا ہو جاتی ہے اور پھر جھینگر ڈھکوری بن کر جھینگر کی تلاش میں پھرنے لگتا ہے۔'' (۱۹)

اسی حالت سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی گئی ہے۔ اس نظم کے ذریعہ خود سیماب نے خالق حقیقی کی طرف رجوع کیا ہے اور اہل تصوف کو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ڈوب جانے کی تلقین کی ہے۔ ایک بند میں ڈھکوری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اپنی ہستی کو مٹانا کوئی تجھ سے سیکھ لے ۔۔۔ قالب دلبر میں آنا کوئی تجھ سے سیکھ لے
ہے تجھے صد آفریں اے قطرۂ لرزانِ عشق ۔۔۔ گھل کے دریا میں سمانا کوئی تجھ سے سیکھ لے
جزو کے کل میں سما جانے کی یہ ترتیب ہے ۔۔۔ اس طرح مٹنا مٹانا کوئی تجھ سے سیکھ لے
ہے فنا ہونا ترا حسن بقا کی ایک مثال ۔۔۔ زندگی مرمر کے پانا کوئی تجھ سے سیکھ لے

یہ فنا اور یہ بقاہست و عدم کا ہے ثبوت
''مثلِ سبزہ بار ہا روئیدہ ام'' کا ہے ثبوت

سیماب نے اس نظم کے توسط سے زندگی کو جاودانی، دل کو حسن جاناں کا جلوہ خانہ اور خودی سے بے خودی، احساس نفس یا تعین ذات اور خود آگہی کے اعلیٰ وارفع تصورات کو پیش کیا ہے۔ ان کا یہی تصور خودی ان کی بے پناہ رجائیت، امید آفرینی اور خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ جدید دور کے آشفتہ حال اور شکست خوردہ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ:

اس طرح اے ڈھونڈنے والے تلاش یار کر ۔۔۔ ندرِ وحشت زندگی اپنی نہ تو زنہار کر
ہے یہ تیری زندگی جاودانی کا سبب ۔۔۔ یا زمیں ہوجا فنا، اپنی خودی کو مار کر
اپنے ہونے کا نہ تجھ کو کسی صورت گمان ۔۔۔ چور اپنے ہاتھ سے خود شیشۂ پندار کر
محو ہو اتنا تصور میں کہ ہوجائے فنا ۔۔۔ دیدۂ باطن سے حاصل لذتِ دیدار کر

''ماسوا'' سے ہو منزہ محویت خانہ تیرا
حسرت جاناں میں ہو انداز جانانہ ترا

اس نظم میں تلاش وجستجو کو خودی و بے خودی کی زندگیٔ جاودانی قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کی طرح سیماب نے بھی محسوس کیا کہ انسانوں میں حرکت وعمل کے جذبے کے احیا کے لیے خودی کو بیدار کرنا ضروری ہے۔ اسی سے بزرگان دین اپنی منزل مقصود پاتے رہے ہیں۔ سیماب کی ایک دوسری نظم، جو''بلبل اسیر'' کے عنوان سے ہے، وہ بھی اسی نوعیت کی ہے، جس میں تماش بین بلبل سے مخاطب ہو کر قفس کو توڑنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن بلبل کا رویہ اس کے برخلاف ہے۔ اس کو تو ضبط وتحمل ہی میں مزہ آتا ہے۔ اسی لیے وہ تماش بین سے کہتا ہے:

گلستان نزدیک تر ہے خانۂ صیاد سے — ہیں جو انانِ چمن مصروف خوابِ ناز میں

میں قیامت کیوں کروں برپا لبِ فریاد سے — آگ پھولوں میں لگادوں سوز بھردوں ساز میں

نالہ آسان ہے مگر مشکل ہے ضبطِ آرزو — ضبط سے مایوس ہوجاؤں تو پھر نالہ کروں

ضبط اک بجلی ہے خرمن کی ہے جس کو جستجو — وقت آجائے تو گلشن کو تہ و بالا کروں

نظم ''بلبل اسیر'' مکالماتی انداز لیے ہوئے ہے۔ سیماب نے تماشائی سے بلبل کے مکالمہ کی شکل دی ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان کو خود شناسی کا احساس دلایا ہے جو ایک حساس شاعر کا پیغام حیات ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عہد جدید کے پریشان حال اور شکست خوردہ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں پنہاں خود شناسی، معرفت نفس اور قوت عمل سے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں اس دور کی بہت سی قابلِ ذکر اور دلچسپ نظمیں ہیں جن میں سیماب کی شخصیت کے دیگر پہلو بھی آشکار ہوتے ہیں۔ ان نظموں میں انسانی جذبات واحساسات میں جذبۂ محبت سب سے بلند نظر آتا ہے۔ شاعر کو ایسے حسن کی عکاسی میں مہارت حاصل ہے۔ اس نے حسن کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ اس کی رعنائیاں آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ نمودِ حسن، پرستارہ، استعفائے محبت، ارض تاج، پیام آرزو وغیرہ اس کی بہترین مثال ہیں۔

سیماب کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روحانی تصورات و کیفیات کی بھی کمی نہیں ہے، البتہ یہ ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ ان کے یہاں عشق و محبت کے جذبہ کا اظہار روایتی نہیں ہے۔ اس لیے نظم ''استعفائے محبت'' میں اس خیال کو انھوں نے بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے اس نظم کا آغاز وفا کے تذکرے سے کیا ہے۔ لیکن سیماب نے نظم میں وفائے محبت کے خیال کے ساتھ ساتھ محبوب کی بے التفاتی کا بھی گلہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

یہ سلوکِ دوستی ہے تو سلام دوستی کو

سیماب کہتے ہیں کہ محبوب کے در پر مسلسل عجز وانکسار جائز نہیں ہے۔ محبوب کے دل میں بھی تو محبت کا چراغ روشن ہو، جس سے عاشق کی خودداری جھلکتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

یہ حسرت ہوس نہیں، یہ آرزوئے عشق ہے　　تم اس کو سرخرو کرو تو آبروئے عشق ہے

خموش کیوں ہو کہہ بھی دو یہ دل ہے اور یہ ہاتھ ہے　　وفا کا عہد کہتے ہیں کہ دست و دل کا ساتھ ہے

تمھیں یہ فخر ہو کہ حسن دل نواز ہوگیا

مجھے یہ ناز ہو کہ میں اسیرِ ناز ہوگیا

''نیستاں'' کی بعض نظمیں جشن سلطانی (ایک مہجور کی نگاہ سے)، دوشیزۂ بہار، نسیم برشگال، عرض تجلی، جوش انتقام، ذروں کا مستقبل وغیرہ ایسی ہیں، جن میں سیماب کی شاعری اور نظم نگاری کا ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً نظم جشن سلطانی میں شاعر نے ایک مفلس کے جذبات واحساسات کی تصویر کشی کی ہے جس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دکھ اور تکلیف کے دور سے وہ گزر رہا ہے جذباتی طور پر سیماب اس سے وابستہ ہوگئے ہیں اور اس کی ہر تکلیف، ہر درد سیماب کا درد معلوم ہونے لگا ہے جس کی وجہ سے نظم میں بہت زیادہ تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔

اس مجموعہ کے آخری حصے میں جنت کے خطوط والی چھ نظموں کا حصہ بالکل منفرد اور بے مثال ہے۔ اس میں سیماب نے انسانی فطرت کے نشیب وفراز سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت

دیا ہے۔ موضوع بھی بالکل نیا اور انداز بیان بھی انوکھا ہے جس میں پہلا خط صغر سن بچے کی طرف سے اپنے باپ کے نام، دوسرا خط ایک معصوم بچی کی طرف سے ماں کے نام، تیسرا اماں کی طرف سے بچوں کے نام، چوتھا خط باپ کی طرف سے بچوں کے نام، پانچواں بیوی کی طرف سے شوہر کے نام اور چھٹا خط شوہر کی طرف سے بیوی کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ تمام خطوط انسانی جذبات واحساسات سے لبریز ہیں۔ ان میں مختلف لوگوں کے انتقال سے ان کے قریب ترین متعلقین پر جو کچھ گزرتی ہے، اس کا احساس کرتے ہوئے انھیں بہت خوبصورت اور اثر انگیز انداز میں صبر کی تلقین کی گئی ہے:

روتے ہو ابّا رات دن ناحق مجھے دفنا کے تم — کرتے ہو کیوں آہ و فغاں مری لحد پر آ کے تم
ابا جدا اندوہ گیں اماں الگ بے آس ہیں — آخر یہ مایوسی ہے کیوں ہم تو خدا کے پاس ہیں
اپنی امانت تھا، تمھیں اللہ نے مجھ کو دیا — میں تو اسی کا مال تھا جب چاہا اس نے لے لیا
بے سود آہ و زاریاں، بے فائدہ یہ شور ہے — قسمت پہ کس کا جبر ہے قدرت پہ کس کا زور ہے

سیماب نے اس نظم میں بچوں کی موت پر عام لوگوں کو صبر وتحمل کی تلقین کی ہے۔ وہ اس طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں صبر وشکر کرنا چاہیے۔

اس کے برخلاف جب وہ والدین کے انتقال سے بچوں کو پہنچنے والے صدمے کا احساس نظم کرتے ہیں تو ان کے الفاظ بھاری بھرکم، خیالات میں عمر کی پختگی اور تجربات کا نچوڑ اور اثر انگیزی میں انفرادیت موجود ہے۔ مثلاً ماں کے انتقال پر اس کے بچوں کے لیے اس کے بھی جذبات کا اظہار کراتے ہیں:

یہ ہماری زندگی کا تھا حصول پیارے بچو — کیا پرورش اٹھا کر غم صد ہزار تم کو
تمھیں تربیت دلائی، تمھیں آدمی بنایا — جو نہ آتا تھا بتایا، جو نہ یاد تھا کو سکھایا
نہ رہا غرض ادھورا کوئی اور کام باقی — فقط اک اجل رہی تھی بے انصرام باقی
جسے کہتے ہیں قضا سب وہ کمال زندگی ہے — اسے کیا سمجھ رہے ہو یہ مآلِ زندگی ہے

اسی طرح ایک خط میں اپنے انتقال کے بعد بچوں سے باپ ان توقعات کا اظہار کرر ہا ہے:

ہماری ہستی رفتہ کی یادگار ہو تم　　ہمارے گلشنِ امید کی بہار ہو تم
ہماری خاک سے اٹھا ہوا غبار ہو تم　　یہ کہہ رہی ہیں امیدیں کہ ہونہار ہو تم
ہمارا نام ہے دنیا میں بیش و کم باقی
تمہارے دم سے ہیں گویا جہاں میں ہم باقی

اور پھر وہ انھیں یہ نصیحت کرتا نظر آتا ہے:

ہمارا نام نہ تم خاک میں ملا دینا　　تم آبرو نہ ہماری کہیں مٹا دینا
ہماری محنتِ مرحوم کا صلا دینا　　تمہارے ہاتھ ہمارا ہے اب جلا دینا
کہ مرنے والا ہے زندہ جو نام زندہ ہے
جیے جو بعد فنا وہ مدام زندہ ہے

سیماب کی ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے گہرے شناسا ہیں۔ بچوں کے جذبات وخیالات، ماں باپ کے احساسات، شوہر اور بیوی کے جذبات وغیرہ کا بیان ان کے گہرے مشاہدے کا عکس ہیں۔ خاص طور سے بیوی کا خط بڑا ہی المناک ہے۔ جس میں انھوں نے مرد اور عورت کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

گزشتہ سطور سے یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ سیماب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی اسلامی موضوعات اور روحانی جذبات کے اظہار میں طمانیتِ قلب وروح محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی نظموں میں تصوف کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور بلا شبہ ''نیستاں'' میں پیش کردہ ان کی نظمیں اپنے ابھرتے ہوئے فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ جذبات انسانی کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

کارامروز (۱۹۳۴)

علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''کارِ امروز'' ان کے پہلے مجموعے ''نیستاں'' کی اشاعت کے دس سال بعد ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں موضوعات کا خاصا

تنوع ہے۔ اس میں سیاست، اخلاقیات، انسان وانسانیت، پند وموعظت، شخصیات، حسن وعشق، وطنیت، ادبیات اور حقائق ومعارف وغیرہ موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے ''کارامروز'' کی نظموں کے ذریعہ قوموں کو زندہ رہنے کا پیغام دیا ہے اوران میں محبت وصداقت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں منظر نگاری کے بہترین نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ سیماب کے والد ایک نیک اور بزرگ انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی عمدہ وپاکیزہ طور پر تربیت کی تھی جس کا اثر ان کے عہد شباب تک کی شاعری پر صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ سیماب کی نظموں کے پہلے مجموعے ''نیستاں'' میں اس تربیت کے عمدہ وپاکیزہ نمونے موجود ہیں اوران کی دینی ومذہبی شخصیت ہر نظم میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ لیکن زیرنظر مجموعے میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں سیماب سماجی، سیاسی، اخلاقی، جغرافیائی غرض ہر طرح کے مطالعے ومشاہدے کا اظہار فنکارانہ انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور ہمہ رنگی نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ جس طرح حالی، شبلی، اکبر، چکبست، اقبال، حسرت، ظفرعلی خاں اور جوش ملیح آبادی کی قومی ووطنی شاعری اپنے مخصوص انفرادی رنگ کی عکاس ہے، اسی طرح سیماب اکبرآبادی نے بھی اس میدان میں اپنی انفرادیت قائم کی اور اپنی قومی وسیاسی نظموں میں نئی نئی شکلیں پیدا کی ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات اورانقلابات سے شاعر کا متاثر ہونا فطری ہے۔ سیماب کی شاعری بھی اپنے دور کے حالات سے متاثر ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان زبردست سیاسی تحریکات وانقلابات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں ان کی سیاسی اور قومی شاعری وجود میں آئی۔ اسی لیے ''کارامروز'' کے موضوعات میں سیاسی شاعری کا حصہ خاصی بڑی مقدار میں موجود ہے۔

سیاسی نظمیں

سیماب اکبرآبادی جب قومی، سیاسی اور وطنی نظموں پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی نگاہ میں وہ تمام واقعات وحادثات موجود ہوتے ہیں جن میں وہ سیاست کو انسانیت کے زوال سے تعبیر

کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''طلوع سیاست'' میں انھوں نے اسی خیال کو اپنے اظہار کا مرکز بنایا ہے۔ نظم کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

رسم و آئین محبت پر تباہی آگئی صبح فطرت کی سپیدی میں سیاہی آگئی
بھول بیٹھا ہے آدمی انجام کار زندگی سرنگونی میں ادائے کجکلاہی آگئی
ذرۂ ناچیز سورج بن کر اترانے لگا خاک کے سر میں ہوائے بادشاہی آگئی
جوش نخوت میں سیاست نے کیے ایسے گناہ تنگ اپنی جان سے خود بے گناہی آگئی
محفلِ مہر و وفا سے بے خودی رخصت ہوئی خود نمائی صورتِ قہر الٰہی آگئی
مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگیا
نام اس قانونِ وضعی کا ''سیاست'' ہوگیا

اس مجموعہ کی پندرہویں نظم ''بساط سیاست'' ہے۔ اس کے مطالعہ سے سیماب کی تاریخ عالم پر گہری نظر اور مختلف بادشاہوں اور فوجی سربراہوں کے دورِ اقتدار پر شاعر کی تنقیدی رائے کا علم ہوتا ہے۔ اس میں جس دقت نظر اور حسن بیان کے ساتھ قدیم زمانے سے سیماب کے زمانے تک کے مخصوص مشاہیر کے کارناموں کی طرف اشارے اور ان کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے۔ ان مشاہیر میں انھوں نے اپنے خاص مقصد کے تحت درج شخصیات کو شامل کیا ہے۔ سکندر، قیصر روم، خالد بن ولیدؓ، صلاح الدین ایوبی، نپولین، انور پاشا، مصطفیٰ کمال پاشا، مہاتما تلک، سی آر داس، لینن، گاندھی، سعد زاغلول پاشا، رضا شاہ پہلوی، امان اللہ خاں، ڈی ویلرا، محمد علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور جواہر لال نہرو۔

سیماب نے بین الاقوامی سطح کے چند مشہور مدبروں کے سیاسی کردار کا ذکر نہایت دلکش پیرائے میں کیا ہے۔ سیماب نے اپنی سیاسی نظموں میں انقلاب کے تصور کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کے سیاسی منظرنامے پر سی آر داس، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی ہے اور پنڈت نہرو کی شخصیت میں پوشیدہ

زبردست امکانات پر اطمینان اور مستقبل کے لیے بھرپور امید کا اظہار کیا ہے۔ بقول اعجاز حسین:

''سیماب کا سیاسی جذبہ یا سیاست سے دلچسپی شعوری یا تقلیدی
نہیں بلکہ وسیع النظری اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔'' (۲۰)

سیماب کا سیاسی شعور اتنا بالغ اور بصیرت اتنی گہری تھی کہ بات اور کلام میں خود بخود تاثیر پیدا ہو جاتی تھی۔ سیماب کی شاعری کے بغور مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری براہِ راست سیاسی اظہار کی شاعری ہے۔ انھوں نے علامتوں، استعاروں اور تمثیلوں کی مدد سے بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان کی شاعری متنوع موضوعات کی شاعری ہے۔ وہ ایک حق گو اور بے باک شاعر ہیں۔ انھوں نے جس منصفانہ نظام کا خواب دیکھا تھا، آج کے عہد میں بہت سے علاقوں میں اس کی تعبیر سامنے آ چکی ہے۔ سیماب کی شاعری میں وہ آگ اور جذبات کی وہ لے جگہ جگہ موجود ہے جو قوموں کو خود مختاری کی جانب لے جاتی ہے۔ ان کی نظمیں طلوع سیاست، آزار و اسیر، جذب و سلوک محبت (سیاسی نقطۂ نگاہ سے)، آزادی، اتحاد اور رہنما وغیرہ اسی طرح کے زبردست سیاسی جذبات سے لبریز ہیں اور ان سے شاعری کا سیاسی قد بہت بلند اور نقطۂ نظر بہت وسیع نظر آتا ہے۔

یہ تمام نظمیں سیماب کی سیاسی اور سماجی بصیرت کی کامیاب آئینہ دار ہیں۔ سیماب کا کمال فن یہ بھی ہے کہ انھوں نے سماج کے تلخ حقائق کے اظہار میں پوری سادگی، سنجیدگی اور خلوص سے کام لیا ہے۔ ان کی نظموں میں تفکر کا بھی گہرا احساس ملتا ہے اور وہ سیاسی اور سماجی حقیقتوں کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر بصیرت اور فنی ریاضت کے شواہد رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''بساط سیاست'' کا پہلا ہی بند اپنے اندر بڑے امکانات رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عہد اولیٰ کی سیاست شمع خلوت خانہ تھی   انجمن اصلاح اور تہذیب سے بیگانہ تھی
جنگ ہوتی تھی مگر حسن و محبت کے لیے   لوٹ لی جاتی تھی دنیا ایک عورت کے لیے
زندگی سے بھی زیادہ تھی ضرورت حسن کی   حکمرانوں کے دلوں پر تھی حکومت حسن کی

سیماب کا یہ سب سے بڑا وصف ہے کہ وہ اپنی سیاسی نظموں میں فریاد کر کے خاموش نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ بالغ النظری سے اس کا علاج بھی بتاتے ہیں۔ سیماب کے یہاں پیغامات اور ان کی اختیار کردہ شاعرانہ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ اصلاح اور تعمیر و ترقی، فکر و نظر کی بیداری اور ذہنی انقلاب سے عمل میں آسکتی ہے۔ڈاکٹر زرینہ ثانی نظم ''بساط سیاست'' کے متعلق لکھتی ہیں:

''سیماب کی نظم بساطِ سیاست اور جوش کی نظم ملکوں کا رجز کا آہنگ یکساں ہیں۔ جوش نے ملکوں کے نام لے کر وہاں کی خصوصیات بتائی ہیں، جب کہ سیماب نے اس سلسلے میں ملک کے مقتدر رہنماؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نظم میں سیماب نے بتایا ہے کہ ابتدا سے سیاست کس طرح ارتقا پذیر ہوئی۔ یہ عالمی سیاسی رجحانات کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ سکندر، قیصر روم، خالد، صلاح الدین ایوبی، نپولین وغیرہ عملی سیاست میں بڑے اہم نام ہیں۔انور پاشا اور مصطفیٰ کمال نے ترکی میں جمہوریت قائم کی''۔ (۲۱)

سیماب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔انھیں وطن اور اہل وطن سے غیر معمولی پیار تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ایک ذمہ دار فرد کی طرح ملک وقوم کی حیات اجتماعی کو سنوارنے کے لیے فکر مند تھے۔ڈاکٹر پرویز شاہدی لکھتے ہیں:

''سیماب کا سیاسی کلام جوش وخروش، نظم وضبط، صدق وخلوص، شعور وادراک، شدت وحرارت، لطافت ونزاکت وغیرہ کا آئینہ نظر آئے گا جس میں بعد کی سیاسی شاعری کا چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے''۔ (۲۲)

نظم ''طلوع سیاست'' کے ساتھ ساتھ ''جذب وسلوک'' بھی سیاسی نقطۂ نگاہ سے اہمیت کی حامل ہے جس میں سیماب نے اپنے سیاسی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔''جذب وسلوک''

میں انھوں نے جو درس دیا ہے وہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ تمام اقوام کے لیے ہے۔
اس نظم کا درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

کام ہونا چاہیے وعدوں سے کچھ حاصل نہیں — اب فقط امید ہی وجہ سکونِ دل نہیں
دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں — دوسرا دل ہے ہمارا عقدۂ مشکل نہیں
اہل غیرت ہیں پشیمانی ماضی سے ہلاک — حال میرا یہ کہ مجھ کو فکر مستقبل نہیں
جس کو دیوانے ترا حسن کرم سمجھا کیے — وہ فریبِ لطف اب برداشت کے قابل نہیں
کامیابی کی تمنا ہے تو کچھ تدبیر کر — صرف قسمت کا گلہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں
سالک تدبیر ہوں غالب نہیں جذب وخروش — ناشکیب اتنا ابھی سیماب میرا دل نہیں

''جذب وسلوک'' میں سیماب نے جو سیاسی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ہندوستان کے سیاسی مسائل اور سماجی افراتفری پر ہی نظر نہیں رکھتے بلکہ وہ عالمگیر سیاست کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔ سیماب نے اپنی سیاسی نظموں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے نظموں کے ذریعہ اپنے سیاسی رجحانات کا برملا اظہار کیا۔ سیماب کا یہ خاص وصف ہے کہ انھوں نے محبت میں بھی سیاست کا پہلو تلاش کیا ہے۔ چونکہ اس دور میں سیاست کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ محبت بھی سیاسیات کی روشنی میں دیکھی جانے لگی تھی۔ چنانچہ سیماب نے نظم محبت (سیاسی نقطۂ نگاہ سے) جس انداز سے لکھی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔
اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا سمجھے قوانین جہان مادیت کو — غرض مندی کا اک آلہ بنا ڈالا محبت کو
محبت خود غرض ہے، عشق ہے اک جوش نفسانی — نہ آئی شرم اس اعلان سے اہل سیاست کو
یہ تنقید غلط ہی حسن کو بدظن بناتی ہے — سمجھتا ہے ہوس وہ جذبۂ اربابِ الفت کو
محبت کی سیاست پوچھئے ان مٹنے والوں سے — جو فرش خاک پر بیٹھے ہوں ٹھکرا کر حکومت کو
محبت کونسل میں اور عدالت میں نہیں ملتی — دلِ ویراں میں ڈھونڈ اس ماہتاب بزمِ الفت کو
یہ وہ علم ہے جس کو عرش سے تعلیم ہوتی ہے — سیاست خاک پہچانے محبت کی حقیقت کو

فنائے روح ہے ذوق محبت کی گراں جوشی
ہے خود غرضی سیاست اور محبت خود فراموشی

سیماب نے نظم میں محبت موضوع رکھ کر اس میں سیاست کا ایک نیا پہلو تلاش کیا ہے۔ انسان کو خودغرضی یا خودفراموشی کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ خودفراموشی پر خودغرضی ہمیشہ غلبہ پاتی ہے۔''کارامروز'' کی دوسری نظموں میں آزادی، جذب وسلوک، اتحاداور رہنما بھی سیاسی نوعیت کی نظمیں ہیں، جن میں سیماب نے اپنے سیاسی زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ نظم آزادی سے اپنے حسن کے ساتھ سیاست کے بیشتر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

وہ اک حور مجسم صد بہار و صد چمن در بر
نشاطِ دو جہاں دردل، حیات انجمن در بر

سیاہ و مست لمبے بال، پیچ وخم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں، لیکن مذاقِ رم سے بیگانہ

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ خودرنگ پر مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں

ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں، ہر ادا رنگیں

تنفس میں نجات اس کے، ترنم میں حیات اس کے
تکلم گلستاں اس کا، جلو میں کائنات اس کے

وہ فطرت سے براہ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی

وہ شہزادی ہے، میں اس کی محبت کا بھکاری ہوں
وہ آزادی کی دیوی اور میں اس کا پجاری ہوں

نظم''آزادی''میں سیماب نے جو پیکر تراشی کی ہے وہ ایسے پراثر اوردل نشیں انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والے کی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی طرح نظم''آزادی''میں سیاست کی جو عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ البتہ شاعر اس قسم کی آزادی نہیں چاہتا جس میں سیاست نے اپنے مفوضہ قوانین کو غلام بنالیا ہو، بلکہ وہ اس آزادی کا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں بال بھی اپنے پیچ وخم سے بیگانہ نہ ہو اس لیے کہ پیچ وخم سے بھی سیاست کی بو آتی ہے۔

''انقلاب روس''اور''اس کی یاد میں''بین الاقوامیت اور آفاقیت کی حامل نظمیں ہیں۔

ان میں سیماب نے انسانیت کو ترجیح دی ہے۔انھوں نے ''انقلاب روس'' کو سیاسی انقلاب کا مرکزی خیال تصور کیا ہے۔اسی بدولت انھوں نے انقلاب روس کو ایک خاص انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔نمونے کے لیے نظم ''انقلابِ روس'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب ہستی طوفانوں میں اک قطرہ غوطے کھاتا ہے
آہستہ آہستہ آخر جزو طوفاں ہوجاتا ہے
ادبار کے بادل اٹھتے ہیں، افکار کی فوجیں اٹھتی ہیں
گردش کے تیز تھپیڑوں سے عبرت کی موجیں اٹھتی ہیں
یوں زر مستانِ عالم میں تکمیل حوادث ہوتی ہے
خود نشو ونمائے ہنگامہ، تحلیل کا باعث ہوتی ہے

علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاعری درحقیقت زندگی کا آئینہ ہے جس میں ان کے دور کی سیاسی وسماجی، معاشرتی وتہذیبی واصلاحی تحریکات اور ان کی کشمکش کی بڑی واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے ادب کو سماجی،تہذیبی اور سیاسی آلۂ کار کی شکل میں استعمال کیا ہے۔نظم ''کسی کی یاد'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو — اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھ کو
ہم نفس فکرِ خوشی کیا جو بہار آئی ہے — زندگی میں ہے فقط، فرصتِ ماتم مجھ کو
اپنے بچھڑے ہوئے احباب کا ہے سوگ مجھے — بزمِ عبرت ہے طرب خانۂ عالم مجھ کو
ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گل ریز — نظر آتا ہے یہ گلشن ابھی مبہم مجھ کو

صحنِ گلشن میں وہ ہنگامۂ پرواز نہیں
ساز موجود ہے پیدا مگر آواز نہیں

اس نظم میں سیماب کا سیاسی شعور بڑا نکھرا ہوا اور پختہ ہے اور یہ نظم ان کے سیاسی رجحانات کی بڑی عمدگی سے نمائندگی کرتی ہے۔اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیماب کا

یہ مجموعہ موضوع کے اعتبار سے گلہائے رنگارنگ کا ایک حسین گلدستہ ہے جس میں سیاست پر شاعر نے بہت منفرد اور بلیغ انداز میں اپنے ہمہ جہت خیالات کا دلکش انداز میں اظہار کیا ہے۔

شخصیات پر مبنی نظمیں

''کار امروز'' میں سیماب اکبرآبادی کی متعدد ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح کی سیاسی، علمی، مذہبی یا ادبی شخصیات پر لکھی ہیں۔ان میں سے اکثر ایسی ہندوستانی شخصیات ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی انداز سے ملک وقوم کی خدمت کی ہے یا ہندوستان کی آزادی کے لیے حد درجہ کوشش کی ہے۔

جن شخصیات پر سیماب نے باقاعدہ طور پر مکمل نظمیں لکھی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

رسول اکرم حضرت محمدؐ، گوتم بدھ، سری کرشن، گاندھی جی، محمد علی جوہر، ناصر علی خاں، غالب، داغ، نور جہاں ثانی، شاہ جہاں اور نظیرا کبرآبادی۔ان کے علاوہ نظم ''بساط سیاست'' میں انھوں نے ملکی و بین الاقوامی ۱۹ مشاہیر پر باقاعدہ طور پر اپنے منظوم خیالات پیش کیے ہیں، جن کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ یہ شخصیات ایسی ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں انقلاب پیدا کرنے کی موجب ہوئیں۔مثلاً کسی نے مذہب وروحانیت کے ذریعہ انقلاب پیدا کیا ہے اور کسی نے علم وادب میں اور کسی نے ہندوستان کے انتظام حکومت اور فن تعمیرات میں۔غرض ان کے کارناموں سے ہندوستان کے نقوش روشن ہیں۔

ان شخصیات سے متعلق سیماب نے اپنے قلبی احساسات وتاثرات کا اظہار کیا ہے۔ان کے مذہبی کردار وعقائد، ان کے ذہنی وفکری ارتقا اور سماج پر ان کے اثرات کا بھی برملا اظہار کیا ہے۔ ان شخصیات کے مختلف مذاہب ومسالک سے وابستہ ہونے کے باوجود باہمی اتحاد ورواداری کے جذبات کو بہت خوبصورت اور دل نشیں انداز میں سیماب نے بیان کیا ہے۔

''کار امروز'' میں جن شخصیات کا تذکرہ بہت نمایاں ہے ان میں سری کرشن اور رسول

اللہؐ کی ذات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

''رسول کائناتؐ '' کے عنوان سے تحریر کردہ ان کی نظم تین بندوں پر مشتمل ہے۔اس میں انھوں نے جذبات کے ٹھہراؤ، عالمانہ وقار اور حقیقت پسندانہ پیشکش کے ساتھ آپؐ کی ذات اقدس کے انقلاب آفریں پہلوؤں کو بطور خاص بیان کیا ہے۔ پہلے بند میں پس منظر کے طور پر دنیا میں پھیلی ہوئی جہالت، ظلم واستبداد، خونریزی، حکومتوں کی من مانی، گندی سیاست، بت پرستی، خدافراموشی اور اس کے نتیجے میں پنپنے والی تمام خرابیوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔

دوسرے بند میں مکہ مکرمہ میں آپؐ کی پیدائش کے بعد آپؐ کے انقلاب انگیز پیغامات کی طرف اشارہ کیے ہیں جن میں آپؐ کی ذات اقدس میں تجلیات روحانی اور نور انبیا کا ذکر کر کے یہ واضح کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے محبت کی بنیاد پر سیاست کی فضا استوار کی، توحید کا پیغام دے کر پوری دنیا کو وحدت واتحاد کی تسبیح میں پرو دیا، سیاست کو مذہب کے اور تمدن کو اعلیٰ تہذیب کے تابع کر کے اخوت، محبت، مساوات اور بھائی چارگی کا پورا ماحول پیدا کرایا اور زندگی کے اپنے نئے اصولوں سے ماحول میں روحانیت وتقدس اور پاکیزگی اور تقویٰ وطہارت کی ایسی فضا پیدا کی کہ جانی دشمن بھائی بھائی بن گئے۔

تیسرے بند میں آپؐ کی ذات اقدس میں حضرت ابراہیم کی جانشینی اور حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی صفات کی موجودگی کے نتیجے میں پورے عالم پر آپؐ کے کریمانہ اخلاق اور روحانی فیض وشفقت کے اثرات کی نشاندہی بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔تمام عالم کے لیے آپؐ کی ذات رحمت ہے۔اگر تمام انسانیت آپؐ کی پیروی کر لے اور آپؐ کے بتائے ہوئے اصول زندگی، سیاست ومعیشت سیکھ لے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے تو انسانیت ہی نہیں ساری کائنات آزاد اور باہم متحد ہو جائے۔

نظم ''رسولِ کائنات''میں سیماب اکبرآبادی حضرت محمدؐ کی عظمت کا اظہار بہت عقیدت

اور دل کی گہرائیوں سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

مدبر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا سیاست میں بھی جس نے کی محبت کی ادا پیدا
ادھر باطل کی ظلمت میں حقیقت کی ضیا پوشی ادھر اس کی تجلی میں خودی پنہاں خدا پیدا
اصول نو یہ قائم کی اساسِ زندگی اس نے کمالِ روح سے کر کے مقدس تر فضا پیدا
غلاموں کو دیا دل کھول کر پیغام آزادی کیا احساس اعرابی میں رنگ ارتقا پیدا
عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کردیا جاری نیا بت خانے کے ماحول سے، کعبہ کیا پیدا
سیاست کو کیا مذہب کے تابع اپنی قوت سے مذاق سجدہ سر افرازیوں میں کردیا پیدا
تمدن کو کیا آراستہ تہذیب کامل سے تدبر سے کیا دنیا و دیں میں واسطا پیدا
ان الہامی مساعی کا بالآخر یہ نتیجہ تھا
کہ جو قانون فطرت تھا وہی قانون دنیا تھا

سلام اے صبح کعبہ، السلام اے شام بت خانہ تو چمکا بزم آذر میں بہ انداز خلیلانہ
حریم پاک تیرا اک بلند ایواں حقیقت کا جہاں جبریلؑ بھی ہے مختصر سا ایک پروانہ
کہیں تو زندگی پیرا بہ اعجاز لب عیسیٰؑ کہیں تو خطبہ فرما، اوجِ طائف پر کلیمانہ
فروغِ آفرینش قوتوں پر تیری قائم ہے کہیں تو شمع محفل ہے کہیں تو نورِ کلشانہ
یہ دنیا تیری نظروں میں مثال نقطۂ ناقص یہ عالم سامنے تیرے بقدر ظرف یک دانہ
مجھے معلوم ہے رازِ غلامی اہلِ عالم کا ہے آداب سیاست سے ترے ذہن ان کا بیگانہ
اگر پیرو ترا پھر عالم ایجاد ہوجائے
تو انساں کیا یہ ساری کائنات آزاد ہوجائے

سیماب اکبرآبادی کو سری کرشن سے گہری عقیدت و محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں اور نثری تحریروں میں بھی کیا ہے۔ زیر مطالعہ نظم سری کرشن میں انھوں نے بالخصوص ان کے پیغام محبت کو پیش کیا ہے۔ اس میں منظر کشی بھی کی ہے اور ان کے پیغام کی پیشکش بھی۔ ملاحظہ ہو:

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لے کر سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لے کر
گزشتہ شب صبح محبت کو ڈھونڈھنے نکلا اک آفتاب، محبت کی روشنی لے کر
خودی کے ہوش اڑانے بصد نیاز آتا نئے پیالوں میں صہبائے بے خودی لے کر
فضائے دہر میں گاتا پھرا وہ پریت کے گیت نشاط و دشت میں فطرت کی چاندنی لے کر
جہانِ قلب سراپا گداز بن ہی گیا
ہر ایک ذرہ محبت کا ساز بن ہی گیا

سیماب کو سری کرشن سے عقیدت و محبت ایسی ہے کہ تصور میں ان کو کہیں سری کرشن کی بانسری کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کی میٹھی آواز کانوں تک آ رہی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نغموں سے زمانے کو معمور و مسحور کر دیا ہے۔ وہ اپنے ان نغموں سے صداقت و محبت کے بیج بوتے ہیں، محبت کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس نظم سے یہ بند ملاحظہ ہو:

کیا زمانے کو معمور اپنے نغموں سے سکھائے عشق کے دستور اپنے نغموں سے
صداقت اور محبت کی اس نے دی تعلیم اندھیریوں میں بھرا نور اپنے نغموں سے
بنائے طور تجلی سے اپنی بن بن میں دکھایا جلوۂ مستور اپنے نغموں سے
جو روح غم کی تہوں میں کہیں ملی مغموم اسے بھی کردیا مسرور اپنے نغموں سے
لطافتوں سے کیا ارض ہند کو لبریز کثافتوں کو کیا دور اپنے نغموں سے
فلک کو یاد ہیں اس عہد پاک کی راتیں
وہ بانسری وہ محبت کی سانولی راتیں

سیماب نے سری کرشن کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مصوری و پیکر تراشی کے ذریعہ قارئین کے دل کے ان تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو ان کے ذوق و احساس کو بہت زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس میں جذبات کی پاکیزگی بہت نمایاں ہے۔ ساحل ٹونکی نظم ''سری کرشن'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''سری کرشن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، اس میں تخیل کی

کارفرمائیوں سے کہیں زیادہ دل کی لطافتیں شامل ہیں۔ بڑی ہی
پیاری اور پاکیزہ نظم ہے اور حقیقی تجلیات کی آئینہ دار
ہے۔''(۲۳)

سیماب نے سری کرشن اور گوتم بدھ سے متعلق نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے۔ وہ سری کرشن کی عظمت اور ان کے صداقت ومحبت کے پیغام کا تذکرہ جوش وعقیدت سے کرتے ہیں۔اس قسم کی تمام نظموں سے ان کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ نظم کے علاوہ دوسرے مجموعوں کی نظموں ''وہ بانسری کہاں ہے''، ''میرا خطاب سری کرشن کی قوم سے'' میں بھی ان کا یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی شخصی نظموں کے متعلق نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''شخصی نظموں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ بہتر نظم سری
کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ مذہب میں سری
کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساساتِ حسن
کو بیدار کرسکتی ہے۔ انھوں نے کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں،
لیکن ان میں وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔'' (۲۴)

''نیستاں'' کے برعکس ''کارامروز'' میں سیماب خالص ہندوستانی شاعر نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کا مزاج، انداز فکر اور لب ولہجہ یکسر بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اب وہ صرف ہندوستان سے محبت نہیں کرتے بلکہ وہ ہندو مذہب کو بھی عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔انھوں نے کرشن گیتا کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف سری کرشن سے عقیدت ومحبت ہے۔اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق ومحبت کے جتنے نغمے پھیلے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن کی مشہور بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔ وہ کرشن جی سے اپنی محبت کا دوسرا سبب بتاتے ہیں کہ اگر برج کی سرحد واقع ہے اور میں اکبرآبادی

ہونے کی حیثیت سے گو برج باسی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا مگر اس کا ہمسایہ ضرور ہوں، اس لیے مجھ پر سری کرشن کا روحانی اثر ایک فطری اور عمرانی چیز ہے۔ انھوں نے تیسرے سبب کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ میں سری کرشن کی زندگی میں ایشیا کے بعض دوسرے پیغمبروں سے مماثلت پاتا ہوں۔ ان کے ابتدائی حالات حضرت موسیٰ سے ملتے ہیں۔ چوتھے سبب میں وہ کہتے ہیں کہ بھگوت گیتا کی تعلیم ہر انسان کے لیے مجھے یکساں مفید اور قابل عمل نظر آتی ہے اور میں اس کے اشلوکوں میں سرتا سر روحانیت پاتا ہوں اور پانچویں سبب عقیدت والفت کا یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ ایسی نظموں کی ترویج سے ہندوستان میں متحدہ قومیت کے لیے رواداری اور بے تعصبی کی بنیاد رکھتے ہیں۔

سیماب اکبرآبادی نے گوتم بدھ اور گرونانک پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ وہ نانک اور گوتم بدھ کو بھی گیان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظم ''گوتم بدھ'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن جب افسردہ پھولوں کی طرح پامال تھا　　جب محبت کا غلط دنیا میں استعمال تھا
بے خودی کے نام سے جب دورِ جام بادہ تھا　　جب تجلی حقیقت سے ہر اک دل سادہ تھا
نفس تھا جب عیش کو راز بقا سمجھے ہوئے　　جب ہوس تھی صرف ''عورت'' کو خدا سمجھے ہوئے
زیست کا اور موت کا ادراک دنیا کو نہ تھا　　ظلم کا احساس جب بے باک دنیا کو نہ تھا
علم و عرفان الٰہی کی شہادت تو نے دی　　غور کرنے کی دلِ انساں کو فرصت تو نے دی
بند آنکھیں کرکے اس دنیا کے مکروہات سے　　تو نے حاصل کی ضیائے دل تجلیات سے
برف زاروں کو ترے انفاس نے گرما دیا　　تخت شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرادیا
یاد تیری آج بھی ہندوستاں میں تازہ ہے　　چین، جاپان اور تبت تک ترا آوازہ ہے

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند، وہ مشعل ہے تو
سرزمین ہند کا عرفانی ''اول'' ہے تو

سیماب نے نظم ''گوتم بدھ'' میں اپنے علم وعرفان کے دریا بہائے ہیں۔ ان کے پیغامِ

عرفانی کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کو بھی یاد کیا ہے، جس میں صداقت، محبت، نغمۂ عرفانیت اور شگفتگی سے لبریز نظر آتی ہے۔ سیماب کے ان احساسات میں ہر مذہب وملت اور عقیدہ کے لوگ شریک ہیں۔

ان کی نظموں میں جو روانی اور طبیعت میں جوش بیان ہے وہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جذبے پر دلالت کرتا ہے اور اس جذبے سے اشعار میں جو روانی سرور پیدا ہوا ہے اس کا سرچشمہ بعد میں ارتقا پذیر ہونے والی عمیق مذہبی حسیت ہے جس نے شاعر کو فن کا سانحہ اس نہج پر ترتیب دینے کے لیے یک سو کر دیا تھا اور اس طرح وہ اپنے جذبات ربط وتسلسل کے ساتھ ایک منظّم ہیئت میں بہت عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس میں فنی حسن کے ساتھ دیگر محاسن شعری کا بھی بھرپور مظاہرہ ہوا ہے۔

قومی اور وطنی نظمیں

انجمن پنجاب کے قیام کے بعد مولانا آزاد اور حالی نے اپنی نظموں میں جن موضوعات کو بطور خاص اختیار کیا تھا ان میں حب وطن وقوم بہت اہم موضوع تھا۔ بیسوی صدی تک آتے آتے اس میں اور شدت پیدا ہوگئی اور اس صدی کے ربع اول میں ہر طرف حب وطن سے متعلق نظموں کا چرچا ہو گیا اور اس طرح کے موضوعات پر اردو میں نظمیں لکھنے کی روش عام ہوگئی۔ ملک کے سیاسی حالات ایسے ہو گئے کہ شعرا کے دلوں میں وطنی شاعری کے لیے جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حالی، اقبال، چکبست، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خاں، سیماب، تلوک چند محروم وغیرہ اسی نوع کے چند شعرا ہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں قومی اور وطنی شاعری کو بڑا فروغ ہوا۔

قومی ووطنی شاعری میں سیماب اپنے بزرگ اور ہمعصر شعرا کی تیار کردہ شاہراہ پر چلے اور انھوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر شاعری کی۔ انھوں نے وطن کی محبت میں والہانہ انداز میں نغمے گائے اور ضرورت پڑی تو اس کی زبوں حالی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔

''کار امروز'' میں ۱۹۱۸ کے بعد کی نظموں میں وطنیت پورے طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ سیماب کے ذہنی وفکری ارتقا میں ہندوستانی آب و ہوا اور دوسرے تہذیبی وثقافتی عناصر بدرجہ اتم کارفرما ہیں۔ اسی لیے انھوں نے حب الوطنی کے نغمے خوب گائے ہیں۔ اس کے علاوہ تہذیبی قدروں کی پامالی کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس کے اسباب وعلل بھی بتائے ہیں۔ ان کی حب الوطنی سے متعلق نظم ''میرا وطن'' کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

طلوعِ رنگ وضیا ہے، مرے وطن کے افق سے جہان نور بناہے، مرے وطن کے افق سے
بہار جلوہ نما ہے مرے وطن کے افق سے ہے آفتاب کا مولد، سواد مرے وطن کا
نزولِ آب بقا ہے، مرے وطن کے افق سے گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں صرف مرے وطن میں

یہیں نمودِ سحر ہے، وجودِ شام یہیں ہے
غرض فرائضِ فطرت کا اہتمام یہیں ہے

''حب وطن'' انسان کے اعلیٰ ترین جذبات میں سے ایک ہے اور اچھے انسانوں میں یہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ کے بعد اس جذبے کی شکل سیاسی اور قومی ہوگئی۔ سیماب نے ایک اچھے فرد اور سچے محبت وطن کی طرح اپنے لیے اسی جذبے کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

> ''سیماب بھی اپنے ہمعصر شعرا کی طرح وطنی محبت سے سرشار تھے۔ انھوں نے والہانہ انداز میں وطن کی عظمت کے گیت گائے اور اس کی زبوں حالی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔ ان کے تخیل کی بازگشت وطن ہی سے مواد حاصل کرتی ہے جس سے ان کی گہری وطنی وابستگی ظاہر ہوتی ہے''۔ (۲۵)

سیماب اکبرآبادی نے حب الوطنی کے جذبہ کو شعری پیکر عطا کیا جس میں انھوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ وطن کی محبت کے اظہار میں

اپنی دلی کیفیات کا اظہار بہت خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نظم ''وطن'' ان کے اس جذبے کی عکاس ہے۔ ملاحظہ ہو:

جہاں جاؤں وطن کی یاد میرے ساتھ رہتی ہے　　نشاطِ محفل آباد میرے ساتھ رہتی ہے
کوئی اہل وطن جب مجھ کو مل جاتا ہے غربت میں　　وطن یاد آکے کیا کیا مجھ کو تڑپاتا ہے غربت میں
وطن کا حال اس سے پوچھتا ہوں مضطرب ہوکر　　تصور میں پیا کرتا ہوں اس کے پاؤں دھو دھوکر

☆☆

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے　　تو جیسا ہے جو کچھ ہے سکونِ دل کا ساماں ہے
وطن میں مجھ کو جینا ہے وطن میں مجھ کو مرنا ہے　　وطن پر زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے
وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہوکر
وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاکِ وطن ہوکر

نظم ''وطن'' سیماب نے ۱۹۳۴ میں لکھی۔ اس نظم کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کے لیے اپنے وطن میں ہی سب کچھ موجود ہے۔ علامہ کو اپنے وطن سے جو محبت ہے اس کا اظہار ان کی دوسری نظموں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً فردوس وطن، ارض تاج، دیار باغ، درۃ التاج، جودابائی کا مندر اور روضۂ ممتاز وغیرہ خصوصیت کی حامل ہیں۔ بہرحال وہ اپنی نظموں کے ذریعہ فرزندان قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے ۱۹۳۰ کے اپنے ایک خطبے میں کہتے ہیں:

''ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق اہل ملک اور فرزندانِ
وطن کے لیے ایک مستقبل کا پیغام ہونا چاہیے''۔ (۲۶)

درحقیقت سیماب کی نظموں سے نہ صرف وطن کی محبت، عظمت اور قدر و منزلت جھلکتی ہے بلکہ وطن و قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے بھی ایک عالمانہ پیغام ملتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے کو آزادانہ طور پر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کی قوم میں تابنا کی اور

درخشندگی پیدا ہو جائے تا کہ سارا جہاں روشن و تابناک نظر آئے۔ وہ اپنی قوم میں صور اسرافیل پھونکنے کے خواہاں تھے۔

ان کا ایک مقصد نظموں کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا تھا اور وہ حب قوم کے ذریعہ وطن کے روشن مستقبل کے حامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جوانان وطن کو آگے بڑھنے کی رغبت دلاتے ہیں اور بڑھے چلو کا نعرہ بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

سیماب ایک سچے وطن پرست اور عظمتِ مشرق کے دلدادہ ہیں۔ ان کے شعری ترانوں میں وطن پرستی کے جذبات اعلیٰ انسانی تصور میں ڈوب کر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ وطنیت اور انسانیت کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیتے ہیں۔ ایک محبّ وطن اپنے آرام و آسائش سے زیادہ قوم و ملک کے لیے متفکر رہتا ہے۔ سیماب نے اس نظم میں محض قوم کی بدحالی کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ اہل قوم کے ضمیر کو جھنجوڑا بھی ہے۔ انھوں نے اخوت اور ہمہ گیر محبت، اتحاد اور مساوات کی اہمیت کو بھی روشن کیا ہے۔ سیماب کو وطن سے اور اس کی تہذیبی و روایتی اقدار سے جتنا انس تھا، اردو شاعری میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ نظم ''میرا وطن'' میں جن جذبات کو پیش کیا گیا ہے، علامہ اقبال ان کو ترانۂ ہندی، نیا شوالہ اور ہمالہ میں پیش کر چکے تھے۔ لیکن اقبال، اقبال تھے اور سیماب، سیماب۔ یہ دانشوری کی بلندی اقبال ہی کے حصے میں آئی تھی اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیماب وطن کی مٹی اور مناظر قدرت کو ہر حالت میں اپنی شاعری کا حصہ بناتے رہے اور کامیاب رہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

زمین کی سطح سے تا آسماں میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ ''سارا جہاں میرا وطن ہے''

سیماب کی وطنی شاعری کے مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ ان کا وطنی شعور بہت بلند و پختہ تھا۔ وہ ایک سچے محبّ وطن کی طرح قوم کے افراد کو اعلیٰ خصائل سے مزین دیکھنے کے

لیے ہمیشہ متمنی رہے۔

اشتراکیت پر مبنی نظمیں

سیماب ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی گھن گرج والی شاعری کا نمونہ پیش کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان کے جذبات پر سنجیدگی اور فکر کی گہرائی غالب ہوئی ہے تو اس طرح کی ولولہ انگیز نظمیں وجود میں آئی ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے نظام اقتدار کی بساط الٹنے لگی ہو۔ نظم ''اے سرمایہ دار'' میں سیماب نے سچے جذبات اور حقائق کی آمیزش سے سرمایہ داری کے مضر اثرات کو طشت از بام کیا ہے۔ ہماری تہذیب اور ہمارے معاشرے کے لیے یہ سرمایہ دارانہ نظام کس قدر مضر اور مہلک ہے، ان کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری نے انسانی تہذیب پر جبر و تشدد کے پنجے گاڑ دیے ہیں۔ ردعمل کے طور پر بغاوت اور انقلاب کی لہریں تیز ہوئیں۔ اسی سبب سے اقبال نے بھی کہا تھا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی طرح سردار جعفری کی ''اودھ کی خاک حسیں'' ہو یا ''پتھر کی دیوار'' مخدوم کی ''قید'' ہو یا ''موت''، ہر جگہ سماج میں ہو رہے استحصال اور طبقاتی کشمکش کے سبب پیدا حالات کو موضوع بنایا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سرمایہ داری کی مذمت اور مزدوروں سے ہمدردی ایک رسم سی ہو گئی تھی۔ اسی لیے ''مزدور اور کسان'' کے عنوان پر بے شمار نظمیں لکھی گئیں۔ سیماب نے بھی مزدور کے حالات کی مرقع کشی بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ ان کی نظم ''مزدور'' سے اس طبقہ کی کربناک صورت حال سامنے آتی ہے۔

گرد چہرے پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی   آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابل برداشت اک بارِ گراں   ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں

ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پاؤں مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
جارہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل و ماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال چار پیسے کی توقع، سارے کنبے کا خیال
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
گو ہے تیری ہی طرح انساں، مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے

مزدور کے عنوان سے شعرانے اکثر نظمیں لکھی ہیں، مگر سیماب نے اپنے تخیل کی مدد سے اس نظم میں مزدور کی حالت کا ایسا حقیقی نقشہ کھینچا ہے جو دل پر فوراً اثر کرتا ہے۔ مثلاً تیز چلنے سے کمزوری کے سبب پاؤں کی ہڈیوں کے چٹخنے کی صدا، اس کو محاکاتی انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

''مزدور'' اور ''اے سرمایہ دار'' سیماب کی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ایک طرف تو سرمایہ دار اور مزدور کو اپنے تخیل سے نہ صرف مدمقابل دکھایا ہے بلکہ سرمایہ داروں کے عیش، شان وشوکت کو بھی کھل کر پیش کر دیا ہے۔ وہیں دوسری طرف انھوں نے مزدوروں کی بے بسی ولاچاری، غربت کی زندگی اور اس کے استحصال نیز اس پر ہونے والے مظالم کی بھرپور عکاسی بھی کر دی ہے۔

سیماب نے محنت کش طبقے سے متعلق جو نظمیں لکھی ہیں ان کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں مزدوروں سے کس قدر محبت وہمدردی تھی۔ اپنی نظموں روزہ دار اور مزدور، اے سرمایہ دار، سازش، تخریب، جوش انتقام، مزدور اور عزت نفس میں انھوں نے اس عہد کے اور اس طبقے کے حالات کی بڑی سچی تصویر کشی کی ہے۔

سیماب کے عہد کا ہندوستان انقلاب انگیز حالات سے گزر رہا تھا۔ معاشرتی وسماجی مسائل اور سرمایہ دارانہ نظام نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ سیماب کی ان نظموں میں ہمیں طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دار، زمین دار اور طبقۂ اعلیٰ کے ظلم وستم کو نمایاں کرنے والے اشعار بکثرت ملتے ہیں، جو ان کے خیالات واحساسات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے دولت کے نشے میں چور لوگوں کے مردہ احساسات کو بہت کھل کر پیش کیا ہے۔ وہ مظلوم ونادار طبقے کی مفلوک الحال زندگی کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ سیماب کسانوں اور مزدوروں، مفلسوں اور غریبوں کو ظلمت کدہ سے نکال کر لمعات سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انقلابی آہنگ میں محض گھن گرج نہیں بلکہ مقصد اور مشن کے تئیں پرخلوص پیغام رسانی کا جذبہ کارفرما ہے۔

سیماب اکبرآبادی جہاں اپنی نظموں میں کسان اور مزدوروں کے استحصال پر آنسو بہاتے ہیں، وہیں ان کے اندر جوش وولولہ پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسے مقامات پر ان کی فکر اقبال کی فکر سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم ''جوش انتقام'' ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اقبال کے مردِ کامل کو نظر میں رکھ کر لکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزم عشرت سے — کہ آرہا ہوں میں صد محشر جنوں بردوش
ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دنیا — بکائے حشر چکان و فغان صور فروش
مسل کے پھینک دو پھولوں کو، آئینے توڑو — ہٹا دو پردۂ رنگین و مسندِ گل پوش
حقیقتوں پہ ہیں آثار تیرگی طاری — سحر نہیں ہے کہ ہو جاؤں مثلِ شمع خموش
مجھے جہان ریا کی جڑیں ہلانی ہیں — ملا ہے اذن تکلم بہ اقتضائے سروش

اب انکشاف کی قوت سے کام لینا ہے
منافقوں سے مجھے انتقام لینا ہے

نظم ''جوش انتقام'' میں وقار، جوش وولولہ اور بلند آہنگی بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ سیماب کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جو اشترا کی خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان میں مزدوروں اور کسانوں پر کیے گئے ظلم و جبر کو وہ ایسے پر اثر پیرایے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی کسک اور تڑپ ہماری روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ سیماب کو اشترا کی نظام سے اس لیے بھی ہمدردی ہے کہ اس نے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے استحصال اور نسلی و طبقاتی امتیازات کو ختم کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔

حسن و عشق کے موضوع کو اردو نظم میں تقریباً تمام شعرا نے برتا ہے۔ چنانچہ قلی قطب شاہ سے نظیر اکبر آبادی تک اور نظم جدید کے آغاز سے سیماب کے عہد تک تمام شعرا کے یہاں عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مگر سیماب اکبر آبادی نے عشقیہ شاعری کو ہر نہج پر مفصل و مکمل طریقہ سے اپنایا ہے اور اس میں سنجیدگی کے ساتھ دردمندی پیدا کی ہے۔ ان کا عشقیہ کلام خالص واردات قلبی کی پیداوار ہے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں محسوسات کی بنا پر بیان کرتے ہیں۔ ان کی انفرادی حیثیت ان کے ایک ایک شعر سے ظاہر ہوتی ہے۔

حسن و عشق کے تاثرات کی پیشکش میں سیماب نے اکثر نظموں میں حسن نسوانی کی مرقع کشی کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر یہ مرقع روایتی ہیں۔ ’’کارامروز‘‘ کی نظمیں اس کی عمدہ مثال ہیں۔ مثلاً حسن، ترے ماضی کی یاد، نیا عہد نامہ، گناہ عشق، عقل و عشق، حسن کو دعوتِ سکون، حسن مجبور، حسن کا آخری حربہ، تم کاش وہی ہوتے، دل کی پیاس، صبح محبت، اے چراغ صبح سن، نزاکت احساس، اساس کائنات، انتظار، صبوحی، دعائے نیم شبی وغیرہ اس نوع کی نظمیں ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شاعری کے جذبات واحساسات اپنی اعلیٰ وارفع شکل میں موجود ہیں۔ ان کی نظم ’’تم کاش وہی ہوتے‘‘ سے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

اے کاش نہ تم جاتے خلوت سے خفا ہوکر
فردوس نظر بنتے تسکین وفا ہوکر

احساس سے دوری کے مغموم نہ ہوتا میں
جلوؤں کے تسلسل سے محروم نہ ہوتا میں
میں جذب تمھیں کرکے اپنے دلِ سوزاں میں
ہر وقت جلا سکتا اک شمع شبستاں میں
تم کاش فلک ہوتے! معمور ستاروں سے
میں تم کو چھوا کرتا نظروں سے اشاروں سے
ہر وقت جواں رہتا میرا دل ناکارہ
ہوتا نہ قیامت تک برہم مرا نظارہ
جس وقت جہاں جاتا تم سامنے آجاتے
محدودِ نظر ہوکر آنکھوں میں سما جاتے

نظم ''تم کاش وہی ہوتے'' میں عشق کے متعلق ان کی قلبی کیفیات اس طرح ظاہر ہوتی ہیں کہ (روح کے ذریعہ جسم میں) پوری طرح سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ سیماب کے یہاں جسم اور روح کا یہ تعلق متصوفانہ افکار کو بھی تقویت دیتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے اپنی فکری اساس کے لیے قدیم مشرقی علوم اور مذہبی عقائد سے ایسے عوامل تلاش کر لیے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا تخلیقی سفر انفرادی طور پر جاری رکھ سکیں۔

اردو شاعری میں سب سے پہلے غالب نے کہا تھا کہ حسن و جمال کا خیال بھی ایک طرح حسن عمل یا نیک کرداری ہے۔ اس طرح انھوں نے روایتی سکون اور جمہوری تصور کو حرکت اور عمل کی دنیا سے آشنا کرایا۔ مثلاً غالب کا شعر ملاحظہ ہو:

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

بہرحال غالب کا تو یہ خیال ہے کہ حسن پرستی کا آخرت میں وہی صلہ ملا جو نیکی اور حسن کا

ملتا ہے تو وہ خسارے میں نہیں رہے۔ سیماب اکبرآبادی نے حسن وعشق کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بھی قابل صد تحسین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن اپنے حدود میں محدود اور مجبور ہے۔ برخلاف اس کے عشق حدود کا پابند نہیں۔ وہ دیوانہ اور صحرا نورد ہے اور آزادی اس کی سرشت ہے۔ حسن کی راہیں الگ ہیں اور عشق کی راہیں جداگانہ ہیں۔ بقول ان کے:

حسن محوِ احتیاط و عشق آزادی شعار

ان کا خیال ہے کہ حسن حدود کا پابند اور عشق میں آزادیاں مضمر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن اس کو ملتا ہے جس کو آزادیاں نصیب ہوتی ہیں۔ جس کی روح میں حقیقت کی تلاش ہوتی ہے وہ حسن کو آزاد رہنے کے لیے مجبور کرسکتا ہے۔ سیماب حسن وعشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توضیح وتشریح بھی کرتے نظر آتے ہیں اور وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ایک عارف کی حقیقت شناس نظر اور قلب بتاں دونوں مل کر اس شاہد حقیقی کے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سیماب کے یہاں حسن وعشق کی واردات کی رمزیت نہایت لطیف نظر آتی ہے۔ اس نے محبوب کو پتھر کی مورت نہیں سمجھا بلکہ اسے دل سے بھی تسلیم کیا ہے۔ بہرکیف عشق ایک فطری جذبہ ہے اور یہ ہماری شاعری میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کا کلام حسن وعشق کے جذبات سے خالی ہو۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق ومحبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی''۔ (۴۷)

سیماب نے حسن وعشق جیسے موضوعات پر جو نظمیں لکھی ہیں، ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اس موضوع کو اس صنف میں بیان کرنے پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔

وہ حسن کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے اور بدلتے ہوئے زمانے اور انقلاب دہر کا احساس زیادہ رکھتے تھے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی نے نظم ''عقل وعشق'' میں عقل اور عشق کی کشمکش کا احاطہ کیا ہے۔ یعنی عقل مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معنی میں اور عشق اس والہانہ محبت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جو آدابِ مصلحت سے ناآشنا اور وضعِ احتیاط سے بیگانہ ہے۔ نظم عقل وعشق سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ می بازی بہ سازِ مغربی زیرکی و عشق، عشق و زیرکی
زیرکی در عشق عین گمرہیست بر حواس نو، اساس زندگیست
عشق چوں با زیرکی محکم شود کائناتِ عاشقی، برہم شود
تو و صد تعلیم عشق و زیرکی ما و ناز عشق و ساز بے خودی
بے خودی ما را خدا آموز شد شام ما قبل سحر نو روز شد
تو و خود بینی کہ خوئے ناکس است
ما خدا بینم، مارا ایں بس است

علامہ اقبال کی طرح سیماب بھی عقل کو عشق کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ نظم عقل وعشق ان کی اسی طرح کی نظم ہے۔ اس میں وہ خودی کا پیغام نہیں دیتے ہیں بلکہ بے خودی کی تعلیم دیتے ہیں جس پر اساس کائنات قائم ہے۔ ان کے عقیدے میں راز حیات محبت میں مضمر ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت نہ ہوتی تو عالم کا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ بقول سید حامد علی نقوی مالپوری:

> ''وہ حسن وعشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توضیح وتشریح کرتے ہیں حسن پرست ہیں اور محرم ذوق عشق، حسن وعشق میں رابطہ بتاتے ہیں وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی کا مترادف سمجھتے ہیں''۔ (۲۸)

حسن وصداقت اور محبت سیماب کی تمام نظموں کا نصب العین ہے۔ سیماب کہتے ہیں کہ دنیا کی اساس ہی محبت پر ہے۔ دنیا کو محبت کا درس دو، تم اپنی جنت زمین پر ہی تیار کر لو گے۔ انھوں نے جذبۂ محبت سے معمور ہو کر ''نزاکت احساس'' کا جو نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:

مرا احساس جو تاروں کی کرنوں سے بھی نازک ہے — جو نازک فکر شاعر کے خیالوں سے بھی نازک ہے
لطافت جس کی پچھلی رات کے پھولوں میں پلتی ہے — جو وقت صبح بوئے گل کی موجوں میں نکلتی ہے
گوارا اس کو ہوگی چوٹ کیونکر نشتر غم کی — حقیقت جو رگ گل کی ہو اور فطرت ہو شبنم کی
مرا احساس آب و رنگ کی گرمی بڑھاتا ہے — جبین حسن میں احساس میرا مسکراتا ہے
پذیرائی مرے احساس کی اے حسن فانی کر — بسر اس کی پناہوں میں شبابِ زندگانی کر

نظم ''نزاکت احساس'' میں سیماب نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ وہ الفاظ کی مدد سے اپنی نظموں میں خواب ناک فضا کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ فضا قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فن کی ایک بڑی خصوصیت ان کی مینا کاری ہے۔ ان کی نظموں کی فنکارانہ تعمیر کو دیکھ کر تاج محل کی نفاست، نزاکت، پاکیزگی اور مینا کاری کا احساس ہوتا ہے۔

غرض اپنی نظموں میں سیماب نے عشق و محبت جیسے روایتی موضوع کو اس قدر دلنشیں اور متنوع انداز میں پیش کیا ہے کہ کبھی کبھی موضوع کے اچھوت ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور یہ ان کی زبردست قدرت کلام کی دلیل ہے۔

منظر نگاری

منظر نگاری کے سلسلے میں ہمارے ناقدین ادب نے مختلف انداز فکر سے کام لیا ہے۔ ہر شخص نے اپنے طور پر اسے سمجھا اور برتا ہے۔ کسی نے فطرت نگاری کو منظر نگاری تصور کیا ہے اور کسی نے نیچرل شاعری کو۔ یوں تو اردو کے سبھی شعرا نے شروع سے ہی نیچر کو گلے لگایا ہے۔

البتہ یہ وصفِ خاص قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی، نظیر، سودا، میر وانشا، ذوق وغالب، مومن، سرور جہاں آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، انیس ودبیر، آزاد وحالی، اقبال وچکبست اور سیماب کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ سیماب، انیس اور اقبال جیسی منظر نگاری کرنے سے تو قاصر رہے ہیں، لیکن اکثر اوقات ان کے کلام کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک مصور برش سے تصویر کھینچتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے فطرت کو قریب سے دیکھا ہے اور فطرت کی کیفیات کو اپنے قلب ونظر میں اتارا ہے۔ مثلاً وہ اپنی نظم ''شاعر امروز'' میں فطرت کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں:

شام کی تصوری کھینچی ہے سحر کے نور سے تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے
چاند کی کرنوں سے کیا تو ہو چکا ہے ہم کلام ساغر خورشید میں پی ہے شراب لالہ فام
لرزشِ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا طرح کا مصرع کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا

سیماب کی شاعری میں مناظر فطرت کے معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نزول انسان، آئینہ افق، صبح صادق، صبح کا چاند، میرا ہم خرام شب، چراغ ساحل، تاج کنار شفق میں، صبح تاج، تاج شب تاریک میں، چاند اور تاج وغیرہ نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب منظر نگاری کی زبردست قوت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس منظر پر قلم اٹھایا ہے، اس کو حیات نو بخشی ہے۔ اس ضمن میں سید حامد علی نقوی رقمطراز ہیں:

> ''مولانا مناظر فطرت کی تصویر کھینچنے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ وہ فطرت کے پرستار حقیقی ہیں اور فطرت ہی ان کا مذہب ہے۔ وہ صحیفۂ فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے میں ان کو حسن نظر آتا ہے اور وہ حسن لافانی کو وجہ قیام عالم سمجھتے ہیں۔ ان کا قلب رموزِ قدرت کا مخزن ہے۔ وہ حسن وعشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توسیع وتشریح

کرتے ہیں۔حسن پرست ہیں اور مجرم ذوق عشق، وہی حسن
وعشق میں رابطۂ سرمدی بتاتے ہیں، وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی
کا مترادف سمجھتے ہیں''۔ (۲۹)

سیماب نے اپنی نظم ''فطرت کی جوگن'' میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ان کی یہ منظر نگاری بہت واضح اور دلکش ہے۔ملاحظہ ہو:

عروج شب ہائے ماہ کا ہے ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروس شب بے حجاب ہوکر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہاہے دھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں فضا میں خنکی بتا رہی ہے
پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں محیط ہے نور چوٹیوں پر
کرن جو ہے آبروئے چشمہ وہ آئینے سے بنا رہی ہے
ہے دور میں چاند کا پیالہ، افق پہ پھیلی ہوئی ہے مستی
رواں ہے یوں آبشار گویا شراب فطرت بہا رہی ہے
تلاطم رنگ وبو میں، کیفِ نظر ہے اک پرشباب جوگن
جو اپنے ماحول کی خموشی میں زندگی بن کے چھا رہی ہے
قریبِ چشمہ سجائے بیٹھی ہے مرگ چھالے پر اپنی دنیا
کوئی تو ہے چاند میں یہ جس سے نشیلی نظریں لڑا رہی ہے
ادھر ہے اک آبشار لرزاں، ادھر ہے زلفِ رسا پریشاں
وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے، یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے

اس نظم میں سیماب نے مناظرِ فطرت کی عکاسی نہایت واضح اور روشن انداز میں کی ہے۔یہ حسین مناظر اور ان مناظر میں ایک جوگن مرگ چھالے پر بیٹھی ہوئی ہے،اس کو نہ دنیا کی فکر ہے اور نہ عقبیٰ کا ہوش ہے بلکہ یاد خدا میں محو ہے۔سیماب کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ اپنے

فلسفیانہ تخیل کا سہارا نہیں لیتے ہیں وہاں ان کی عقبیٰ زمین زیادہ روشن اور تابناک معلوم ہوتی ہے۔ جہاں ان کے خیالات میں کچھ فلسفیانہ چھاپ ہوتی ہے وہاں ان کی عقبیٰ زمین دھندلی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی دوسری نظم ''ہلال رمضان اور بسنت'' ہے جس میں انھوں نے ہلال کی تصویر کشی کی ہے:

ہلال ماہ رمضاں آسماں پر سرنگوں نکلا — بسنتی پیرہن میں بے قرار و بے سکوں نکلا
اسے ترکوں کے چہرے کی طرح گلرنگ ہونا تھا — اسے ایرانیوں کی طرح شوخ و شنگ ہونا تھا
بسنت اس کی شعاعِ نور سے رنگین ہوجاتی — گھڑی بھر کے لیے نظارے کی تسکین ہوجاتی
یہ مغرب سے اٹھا تھا چلبلا پن کیوں نہیں اس میں — بتانِ مغربی کا رنگ و روغن کیوں نہیں اس میں
اگر بیدار کرنا تھا تقدس ماہ رمضاں کا — تو ہوتا ابروئے حورِ ارم انداز عنواں کا
پیام صوم دے کر پھر افق میں ہوگیا پنہاں — چمکتے ہی اندھیرے کے عمق میں ہوگیا پنہاں

سیماب نے نظم ''ہلال رمضان اور بسنت'' میں اگرچہ ہلال کی تصویر کشی کی ہے لیکن سیماب کے یہ اشعار ہلال کی اچھی اور عمدہ منظر کشی کرنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد:

''سیماب میں قصد، آورد اور تصنع زیادہ ہوتا ہے''۔ (۳۰)

چونکہ سیماب صاف سادہ اور سلیس الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے جس کے سبب منظر نگاری کی تصویر ان کے یہاں دھندلی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس ''فطرت کی جوگن'' میں ان کی منظر کشی تابناکی کے ساتھ روشن ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سیماب نے یہاں آورد اور تصنع سے زیادہ کام نہیں لیا ہے۔

سیماب نے اپنی بعض نظموں میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ چونکہ انھوں نے فطرت کی مصوری فطرت کی خاطر بہت کم کی ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اقبال کی طرح فطرت کے ذریعہ عوام الناس تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں اس لیے منظر نگاری کی طرف

انھوں نے بہت کم توجہ صرف کی ہے۔ البتہ انھوں نے اپنی نظموں میں منظر نگاری سے سرور وکیف ضرور حاصل کیا ہے۔ ان کی نظم ''صبح صادق'' سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے کیف بادۂ صبح ہے، تجھے لطف خواب سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں، جو بہار میری نظر میں ہے
کبھی میری بزم سحر میں آ، تجھے میں دکھاؤں وہ آئینہ
جو تجلیوں سے گھرا ہوا، میری چشم جلوہ نگر میں ہے
یہی لمحہ صبح ظہور ہے یہی لحظہ مشرق نور ہے
عجب انتظام سرور ہے کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے

اسی ضمن میں ان کی دوسری نظم ملاحظہ ہو:

ابھی راہ میں ہے عروس شب، ابھی گرم محفل ناز ہے
ابھی پر پڑے ہیں جلے ہوئے، ابھی شمع صرف گداز ہے
ابھی ہوش تشنۂ ہوش ہے، ابھی ہیں سکوت میں شورشیں
ابھی کائنات خموش ہے ابھی بے صدالبِ ساز ہے

سیماب اپنی نظر میں صبح کو ایسا تصور کرتے ہیں جیسے شراب۔ اسی وجہ سے انھوں نے بادۂ صبح کی ترکیب استعمال کی ہے۔ ان کو بادۂ صبح میں ایک خاص قسم کا سرور وکیف ملتا ہے۔ ان کو صبح سے بہار کے جلوے بھی ملتے ہیں اور یہ صبح آئینہ کی تجلیوں سے گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کبھی دل میں سرور پیدا کرتی ہے اور کبھی سر میں۔ سیماب نے ان اشعار میں فطرت سے مسرت اندوزی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ بقول سید سعید احمد:

''ان کی جیسی منظر نگاری کی مثالیں اردو شاعری میں خال خال نظر آتی ہیں''۔ (۳۱)

سیماب نے جہاں فطرت نگاری سے سرور و کیف حاصل کیا ہے وہیں انھوں نے فطرت سے انسان کو پیغام دیا ہے کہ فطرت بھی انسان ہی کی طرح گفتگو کرتی ہے اور کائنات کے راز کی گرہوں کو کھولتی ہے۔ ''تاروں کا گیت'' اسی قبیل کی نظم ہے:

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں، ہم جنت کے پروانے ہیں
لبریز شرابِ فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں
مضراب نگاہِ فطرت ہے، مہتابِ رباب زریں ہے
ان نغموں کی بوچھاروں سے یہ ساز ہستی رنگیں ہے
اے دنیا کے رہنے والو، تم کیوں مغموم پستی ہو
ہم بھی اُس کی آبادی ہیں تم جس دنیا کی بستی ہو
تم میں ہم میں کچھ فرق نہیں، مخلوق خدا کی دونوں ہیں
وابستہ ایک ہی رشتے سے یہ نوری خاکی دونوں ہیں
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم ہنستے ہیں تم روتے ہو
ہم جاگتے رہتے ہیں شب بھر تم غافل ہوکر سوتے ہو

اس نظم میں تارے مختلف مقامات سے گردش کے ساتھ ساتھ انسان سے کہتے ہیں کہ دنیا سے غافل ہوکر سونا محرومی کی نشانی ہے۔ سونے والا کبھی دنیا میں ترقی اور فلاح و بہبود حاصل نہیں کرسکتا اور نہ کائنات کے رازوں کو سمجھ سکتا ہے۔

فطرت نگاری کی حامل نظموں میں سیماب کی نظم ''تاج کنار شفق'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں فکری وفنی وسائل انھوں نے بہت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ نظم ''تاج کنار شفق'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب ۔۔۔ فضاؤں کو سلام شام کررہا ہے آفتاب
طلائی تھال میں شفق سجا کے لائی شام کو ۔۔۔ سکونِ منظر و نظر بنا کے لائی شام کو
گلوں کے قمقمے جلے، کنول جھکا ہوا اٹھا ۔۔۔ شفق ہوئی جو رنگ بار ''تاج'' جگمگا اٹھا

قدح یہاں، سبو یہاں، بہار چار سو یہاں　　سمٹ کر آ گیا ہے اک جہان رنگ و بو یہاں
ادھر شفق کی شعلہ تابیاں بنفشہ زار میں　　ادھر ریاضِ تاج رنگ و نور کی کنار میں
ہجوم رنگ و بو میں ہے، تجلی دوام بھی　　کرشمہ ہے یہ تاج کا کہ صبح بھی ہے شام بھی
جھلک نقابِ شام میں ہے لیلی بہار کی　　چمک نمودِ تاج میں ہے لعلِ شاہوار کی
چمک رہا ہے ''تاج'' بھی شگفتہ ہیں گلاب بھی
ہیں قائم ایک ہی جگہ شفق بھی آفتاب بھی

الغرض کار امروز میں پیش کردہ فطرت نگاری سے معمور شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے۔ سیماب کے کلام میں فطرت نگاری بہت حسین اور فنی محاسن کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انھوں نے فطرت کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا ہے اور پیغام رسانی کے لیے اسے بطور پس منظر بھی استعمال کیا ہے۔

ساز و آہنگ (۱۹۴۱)

علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ''ساز و آہنگ'' ۱۹۴۱ میں شائع ہوا۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے باب اول بعنوان ''نوائے عصر'' میں قومیت، سیاست اور وطنیت پر نظمیں شامل ہیں۔ باب دوم میں ''صلائے تہذیب'' کے زیرعنوان مذہب، اخلاق، معاشرت پر اور باب سوم میں ''حدیث ادب'' کے تحت شعر و حکمت پر نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ باب چہارم میں ''سرودِ روح'' کے عنوان سے سیماب نے معتقداتی نظمیں لکھی ہیں اور باب پنجم میں ''نغمۂ معصوم'' کے نام سے بچوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے عام اور سلیس زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔

ساز و آہنگ کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی نظموں میں سیماب اکبرآبادی کی سوچ اور فکر میں تبدیلی رونما ہوئی ہے تاہم ساز و آہنگ کی نظموں اور اقبال کی ''بانگ درا'' کی نظموں میں خاصی مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ سطور ذیل میں ''ساز و آہنگ''

کے ابواب کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

باب اول: نوائے عصر: قومیت، سیاست، وطنیت

باب اول میں نوائے عصر کے زیر عنوان قومیت، سیاست اور وطنیت پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد پورا ہندوستان فکری، تہذیبی اور تمدنی سطح پر مغربی تہذیب وثقافت کی یلغار سے دوچار ہوا تھا اور ساٹھ، ستر سال کے عرصہ میں اس کے اثرات ونتائج نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ سیماب نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور اپنی نظموں کے ذریعہ سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظمیں زیادہ تر سیاسی حالات پر مبنی ہیں۔ ان کے ذریعہ سیماب نے انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی سیاسی جدوجہد کو تیز کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس دور میں سیماب کے یہاں قومی وملکی تعمیر کا جوش زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ اقبال سے بہت متاثر ہوئے اور بہت سی جگہ ان کی تقلید کی بھی کوشش کی ہے۔

سیماب نے اپنے سیاسی مقاصد کی اشاعت اور ملک وقوم کی خدمت کے جذبے کے تحت ۱۹۲۹ میں ایک ہفت روزہ اخبار ''تاج'' جاری کیا جو ان کے سیاسی اور ادبی افکار وخیالات کا ترجمان تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے سیاسی رجحانات اور عقائد کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

پھر از سر نو اجڑی دنیا کو بسا لوں میں
اس ساز کے نغموں سے مردوں کو جگا لوں میں

سیماب نے اپنی قومی، سیاسی اور وطنی نظموں میں بھی پیغام دیا ہے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔

ساز وآہنگ کے باب اول میں ہندوستان، اذان ہمالہ، صبح آزادی کا گیت، ایشیا، وطن،

ہندوستانی نوجوانو، کہ ہم ہندوستانی ہیں، قومی ترانہ، بہ نژادِ نو، صنم کدۂ جمہوریت، دعوتِ انقلاب، نوحۂ وطن، سیاسی قیدی، کارزار فلسطین، اے اسیران وطن، تشدد اور عدم تشدد، مجلس اقوام، امن و جنگ، قدم بڑھائے چلو وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ نظم ہندوستان ان کی ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے ملک کے حسین ماضی کو یاد کرتے ہوئے حال کی نوحہ گری اور مستقبل کے بارے میں سوچنے کی رغبت دلائی ہے۔

یہ نظم سیماب کے سیاسی اور تاریخی شعور کا عمدہ نمونہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آہ اے ہندوستاں! یہ تیری پستی وہ شباب — کچھ تری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب

گو بظاہر تو نشاطِ ندرت ایام ہے — فی الحقیقت بے سکوں، بے چین، بے آرام ہے

وہ بہاریں وہ چمن وہ گلشن ایجادی کہاں — اے غلام آباد، اب وہ تیری آزادی کہاں

بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار — ایک ذرے ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار

اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساط ماہتاب — تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب

روح سے خالی ہے لیکن پیکر مردہ ترا — جلوہ پژمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا

جیسے شمعِ صبح محفل، جیسے چھپتا آفتاب — جیسے شاعر کا بڑھاپا اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پیرایۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

سیماب کی دیگر نظموں میں ایشیا بھی بے حد مقبول ہے، جس میں مقدس سرزمین پر فخر کرنا، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہونا، اس کی عظمتِ رفتہ کا اظہار اور خستہ حالی پر ماتم کرنا اور انقلاب نو کا پیغام دینا یہ سب ان کی وطن سے بے پایاں محبت کی دلیل ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کا وطن ہندوستان ہے اور ہندوستان ایشیا کا ہی حصہ ہے۔ نظم ایشیا میں سیماب کہتے ہیں:

مشرق فطرت ہے یہ فطری مناظر ہیں یہاں — جلوۂ در پردہ کے لاکھوں مظاہر ہیں یہاں

زندگی آتی ہے لینے ان سے تعلیم حیات — منزل ہستی سے واقف سب مسافر ہیں یہاں

وسعت رنگ ونوا فردوس در فردوس ہے　　کتنے ساماں باعثِ تسکین خاطر ہیں یہاں
ارتقا انگڑائیاں لیتا ہے اس اقلیم میں　　آئینے خورشید بن جانے پہ قادر ہیں یہاں
گرم بازاری عہد رفتہ پھر ہونے کو ہے　　زندگی کی موجزن چنگاریاں پھر ہیں یہاں
انقلابِ نو بدلنے کو ہے رخ تقویم کا
ایشیا پھر ''تاج'' بن جائے گا ہفت اقلیم کا

ملک کی سیاسی فضا، حالات وحادثات اور انقلاب سے ایک فطری شاعر کا متاثر ہونا لازمی ہے۔''ساز وآہنگ'' کی نظموں میں انھیں حالات کا ذکر ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی رہنمایانِ ملک کی جدوجہد آزادی کی داد بھی دی گئی ہے اور نوجوانان وطن کو درسِ عمل بھی دیا گیا ہے۔ وہ ایک اہل علم، شاعر، دردمند اور حساس انسان کی حیثیت سے ملک کی ترقی وآزادی اور عوام کی خوشحالی کے متمنی تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس وقت لوگوں اور خاص طور پر نوجوانوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔مثلاً:

پھر از سر نو اجڑی دنیا کو بسا لوں میں
اس ساز کے نغموں سے مردوں کو جگا لوں

پروفیسر عبدالقادر سروری سیماب کی قومی اور وطنی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیماب کے لیے شاعری زندگی کا مشغلہ ہے، اس پر ان کی طبیعت کی روانی مستزاد ہے....اخلاقی وسیاسی ہدایت کاری ان کے خاص موضوع ہیں... بیان کی لطافت اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت سیماب کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔شکوہ الفاظ کے لحاظ سے وہ غالب واقبال تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جذبات میں گہرائی نہیں ملتی ہے''۔ (۳۲)

اسی ضمن میں وہ مزید آگے لکھتے ہیں:

''قومی شاعری میں سیماب کے پاس کبھی رجز ہے کبھی حسی خوانی

اور کبھی دلاسا اور کبھی خوش آئند مستقبل کا ترانہ وہ ترقی پسند تحریک
کے حامی ہیں۔ لیکن نوجوانوں کے بے شعور شغف اور خواہ مخواہ
کی بغاوت آمادگی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ اس سے کسی کو انکار
نہیں ہوسکتا کہ الفاظ کا شکوہ اور دربست، فقروں کی چستی اور
برجستگی اور ترکیبوں کی تراش خراش میں وہ اپنے معاصرین میں
ممتاز حیثیت رکھتے ہیں''۔ (۳۳)

سیماب نے اقبال کی وطنی نظموں کے تتبع میں بھی چند نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں ہندوستان، اذانِ ہمالہ، قومی رجز، وطن، قومی ترانہ، ہندوستان کا پیغام، خسرو برطانیہ کے نام، یوم آزادی، اے جوانان وطن، نوحۂ وطن، اے وائے وطن صدائے وطن، اے اسیران وطن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

باب دوم: صلائے تہذیب

ساز و آہنگ کے دوسرے باب کی نظمیں مذہب، اخلاق اور معاشرت پر مبنی ہیں۔ اس میں سیماب کے قلم کی جولانی اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ سیماب کی یہ نظمیں اہم پیغام کی حامل ہیں۔ سیماب تعمیری پیغام رکھتے ہیں اور جمود کی منزل پر کھڑی اپنی قوم اور اپنے اہل وطن کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں روح عصر پائی جاتی ہے۔ ان میں انسان دوستی اور خلوص کا پرتو صاف طور سے نظر آتا ہے۔ سیماب عوام پسند شاعر ہیں، ان کی روح اور ان کے تخیل میں ہندوستان کی محبت رچی بسی معلوم ہوتی ہے۔ وہ قدم قدم پر یہاں کے حسین مناظر، باغ، گل وگلزار، دشت و کہسار اور آب رواں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

وہ ہندوستانی مزاج کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں اسلامی مذہبی روایات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی روایات کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گنگ وجمن کی لہریں اور ان کا ترنم سیماب کے کلام میں روانی سی پیدا کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم دیوالی سے چند اشعار

ملاحظہ ہوں:

کیا رنگ و نور ایوان ہستی عشرت فروز ذہن و نظر ہے!
ہر در پہ شمعیں، ہر سر میں مستی، گھر گھر چراغاں گھر گھر اجالا
لیکن یہ قیدِ ظاہر پرستی تہذیب باطن ممکن نہیں ہے
پیکر ہو تیرا کتنا ہی روشن پہنچے گا دل تک کیونکر اجالا
ہے انتظارِ نور حقیقت روشن ہو جس سے شام ابد تک
تسکین دل کا ساماں نہیں ہے، ظلمت ہمیشہ، دم بھر اجالا
پیشِ تصور دنیا ہے ایسی راتیں بھی جس کی مطلق سحر ہوں
یوں تو بہ فیضِ ذوقِ تماشا ہوتا رہا ہے اکثر اجالا
اے دستِ فطرت! بہر بصیرت دل میں جلادے شمع محبت
یہ کیا طلسمِ انوار و ظلمت، اندر اندھیرا باہر اجالا

سیماب اکبرآبادی کی نظم ''دیوالی'' میں جہاں ان کے قلم کی چمک دکھائی دیتی ہے وہیں ان کی دوسری نظم ''میری ہولی'' بھی اسی رنگ میں رچی بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

کاش حاصل ہو حقیقی زندگی کا ایک دن
سرخوشی کا ایک لمحہ، یا خوشی کا ایک دن
روح ہے ہنگامۂ باطل سے گھبرائی ہوئی
ہر طرف ہے سرد مہری کی گھٹا چھائی ہوئی
اب بھی بنتا ہے یہاں در پردۂ جنگ و جدال
خاک انساں ہے عبیر اور خونِ انساں ہے گلال
ہے جنوں یہ خاک و خوں سے کھیلنا ہولی نہیں
مدعا ہے انتقام اس سے مرا، ہولی نہیں
اک نئی دنیا کی خلقت ہے میری تخیئل میں

جو معاون ہوسکے انسان کی تکمیل میں
اہتمام زندگی جس میں بطور خاص ہو
آسماں جس کا محبت ہو زمین اخلاص ہو
از سرِ نو پھر مرتب ہو جہانِ رنگ و بو
خار و خس سے پھر ہو پیدا کاروانِ رنگ و بو
عرش سے برسے عبیر و رنگ تخت و تاج پر
اوج پر انسان ہو، انسانیت معراج پر
بربریت کا تفوق، شخصیت کا اعتلا
ہو نیاز آگینی اخلاق سے بدلا ہوا
ارتقا کے رنگ سے لبریز جھولی ہو مری
انقلاب ایسا کوئی ہولے، تو ہولی ہو مری

سیماب کی دوسری نظم ''چراغان بہار'' ہے۔اس میں بھی حب وطن سے متعلق متاثر کن اشعار کا ایک سلسلہ ہے۔نظم ''چراغان بہار'' میں سیماب کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کے قلم کی روانی میں کسی خوف اور جھجک کا مسئلہ نہیں آتا۔ وہ اپنے جذبات وخیالات کا بے تکان اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے باخبر ہیں۔ سیاست، مذہب، معاشرت، قومیت، انسانیت، وطنیت، آزادی وغیرہ کے موضوعات پر وہ خوب نظمیں لکھتے ہیں۔ان کی ایک دوسری نظم ''شگفت نظر'' ہے۔ یہ نظم ان کے فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کی حامل ہے جس میں انھوں نے اپنے مفکرانہ خیالات کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

پھر جہانِ رنگ و بو نشوونما پانے لگا　　خلد کی آغوش میں صحرا نظر آنے لگا
پھر فروزاں روحِ تازہ خاک مردہ میں ہوئی　　پیکرِ افسردگی پھر نور برسانے لگا
پھر زمیں نے کردیے اپنے خزانے آشکار　　ذرہ ذرہ لعل و گوہر بن کر اترانے لگا

پھر بساط ارض نیرنگ نمو سے کھل اٹھی　　پھر جمالِ رنگ و نزہت جلوہ فرمانے لگا
پھر مزاج آفرینش نے نئی انگڑائی لی　　خونِ تازہ نبض نامیہ میں لہرانے لگا

سیماب نے اپنے اعلیٰ وارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ بڑی خوبی سے شعر کے پیکر میں ڈھالا اور ادبی وفنی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ یہ ان کی قدرت بیان کی دلیل ہے۔ ان کے یہاں ہر جگہ متانت وسنجیدگی اور تہذیب وشائستگی نظر آتی ہے۔ ابتذال ورکاکت بالکل نہیں ہے۔ وہ معمولی باتوں سے دوررس نتائج مرتب کرکے ادب اور زندگی کے صحیح رشتے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سیماب جہاں اخلاقی نظموں میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں وہیں مذہبی نظموں میں بھی اپنے قلم کی جولانی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ سیماب کی نظموں کے پہلے مجموعے ''نیستاں'' میں مذہبی اعتبار سے ان کو پختگی، جوش وخروش اور روحانی بلندی کے برعکس ''کارامروز'' اور ''سازوآہنگ'' میں ان کی فکرومزاج میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ''کارامروز'' میں وہ کرشن کی لیلا گانے میں مستغرق ہیں تو سازوآہنگ میں مذہبی ارکان وعبادت کا زیرلب مضحکہ اڑانے سے بھی نہیں چوکتے اور انھیں محض رسمیات کا نام دے کر ظاہری عبادات سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ نظم ''میرا مذہب'' سے چند اشعار پیش ہیں:

یہ جو انگڑائی سی صبح و شام لے لیتا ہوں میں　　عرش کو چھوکر خدا کا نام لے لیتا ہوں میں
ذکر کرتا ہوں، مگر خاموش، بے شور و خروش　　سانس سے اپنی زباں کا کام لے لیتا ہوں میں
ذروں کی پاکیزگی پر اعتبار نور ہے　　خاک سے بھی جامۂ احرام لے لیتا ہوں میں
مسجد اور مندر کی شورش سے ہوں دل برداشتہ　　خلوت دل سے بھی ایسے کام لے لیتا ہوں میں
الغرض ہوں بے نیاز رسم و راہِ بندگی　　جس طرح ہوتا ہے اس کا نام لے لیتا ہوں میں

اس سے دل غافل نہ ہو، مذہب کا مطلب ہے یہی
یاد کرلیتا ہوں اس کو میرا مذہب ہے یہی

نظم ''قربانی'' میں سیماب نے بظاہر مسلمانوں کو اپنے کردار درست کرنے، ظاہرداری

وریاکاری، حرص وہوس اور نفس پرستی سے بچنے اور خدا کے بندوں کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے، لیکن الفاظ وتراکیب اوران اشعار کا لہجہ صاف طور پرظاہر کرتا ہے کہ اس کے پس پشت بھی ان کی مذہب بیزاری کام کررہی ہے۔

اے مسلماں، اے رواج و رسم کے ڈھالے ہوئے
شہرت و کبر و ریا کی گود کے پالے ہوئے
اک مجسم نقش استعمار ہے تیرا وجود
ہے فریضے میں بھی تجھ کو حسرتِ نام و نمود
رسم قربانی کے خوگر، قومیت کے غمگسار
خود بھی ہوجاتے تھے ناموسِ الٰہی پر نثار
اپنی قربانی کا اس دنیا میں کچھ سامان کر
خواہشوں کو نفس کو پیشِ خدا قربان کر
جاری و باقی ہے جب تک حرصِ نفسانی تری
ہو نہیں سکتی کبھی مقبول قربانی تری

سیماب اپنی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی نظموں کے ذریعہ اس سوئے ہوئے احساس رفعت اور قوت کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی طرح وہ بڑی متانت کے ساتھ کبھی دوسری قوموں کا عروج دکھاتے ہیں تو کبھی اہل وطن کی پستیوں کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری ایک طرف تو قوم پرستی کی علمبردار ہے تو دوسری طرف ایک حیثیت سے اقبال کی شاعری کا تکملہ۔ سیماب اپنی نظموں کے بارے میں ''کلیم عجم'' میں لکھتے ہیں:

''میری نئی قومی اوراخلاقی نظموں میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جنھیں میں بہترین تعین کرتا ہوں مثلاً ایشیا، غدار قوم و وطن، تقویم اسلامی کے تین دور پیرشوالہ، مرا مذہب، قبروں کے غلط کتبے اور

روحوں کے اعمال نامے، لقمۂ تلخ، مسجد اور مندر کے پرستاروں
سے، طالب علم، بیداری، مشرق اور اذانِ ہمالہ''۔ (۴۴)

مذہبی اور اخلاقی نظموں میں سیماب کی نظم ''عید اور بسنت'' میں بھی مذہبی رسومات اور تیوہاروں پر سیماب کا طنزیہ لہجہ اپنی جولانیاں دکھاتا ہے اور ان تیوہاروں میں محبت وعقیدت سے شریک ہونے کے بجائے سیماب ان کا خاکہ اڑاتے نظر آتے ہیں:

دیکھ کر درد آشنائے گلشن و صحرا مجھے ۔۔۔ رنگ و بو کی دعوتیں دینے لگی دنیا مجھے
چاک دامان سحر پر ثبت کرکے لفظ عید ۔۔۔ عیشِ ماضی کا دیا کرتا ہے دل دھوکہ مجھے
لہلہا اٹھتی ہے خاکِ دشت سے اک زندگی ۔۔۔ دیکھ کر خوں گشتۂ یادِگل و لالہ مجھے
ہر طرف سے گھیر لیتا ہے مسرت کا سراب ۔۔۔ وقت دیتا ہے فریبِ عشرت بے جا مجھے
میری پیدا کردہ رسمیں ہیں یہ عید اور یہ بسنت ۔۔۔ کس طرح مسحور کر لے ان کا نظارہ مجھے
جانتا ہوں میں حقیقت ہر نشاط و عیش کی ۔۔۔ جلوۂ امروز ہے آئینہ فردا مجھے

سرخ ہے چہرہ شفق کے عکس سے دل سرد ہے
دوسرا رخ میری تصویر خوشی کا زرد ہے

سیماب کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ جہاں طنز آمیز لہجے میں ہی سہی وہ اپنی اخلاقی اور مذہبی نظموں کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کی نگاہ معاشرتی نظموں کے ذریعہ قوم کی بے عملی، تہذیبی انحطاط، تنگ نظری، استحصال اور دیگر کمزوریوں کی نشاندہی کرکے ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اکثر جگہ ان کے طنزیہ لہجہ میں تحقیر بھی شامل ہوجاتی ہے جو ان کی شدت پسندی کی دلیل ہے۔ ایسی نظموں میں روزہ دار مزدور، مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام، مزدور کوہسار، مزدور اور کسان وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کو مزدوروں کی زندگی، ہندوستان کی تمدنی زندگی کا عمدہ نمونہ محسوس

ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھیں مزدوروں میں خلق ومروت بھی نظر آتی ہے اور سچائی ودیانتداری بھی۔اسی لیے مزدور کی ہستی انھیں انسانیت کے سب سے بلند مقام پر فائز نظر آتی ہے۔اس ضمن میں ان کی نظم ''روزہ دار مزدور'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

صبح کا نکلا ہوا اب شام کو لوٹا ہے گھر	کان آوازِ اذاں پر ہیں، نظر ہے جیب پر
بوجھ دن بھر اپنے نازک دوش پر ڈھوئے ہوئے	غیر آسودہ ارادے، حوصلے سوئے ہوئے
اجر مجبوری کا دل میں جائزہ لیتا ہوا	فطرت سرمایہ داری کو دعا دیتا ہوا
اپنے روزہ دار بچوں اور بیوی کا خیال	اتنی محنت پر بھی اپنی فاقہ مستی کا خیال
پیاس سے لب خشک ہیں پھر اس پہ محنت کا عذاب	سوچتا ہے کر نہیں سکتا مگر پورا حساب

سیماب اکبرآبادی نے محنت کش طبقے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔انھوں نے مزدوروں کی بے چارگی، آہوں اور کراہوں کا صداقت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔مزدوروں کی اقتصادی بدحالی کا احساس دلانے کے لیے انھوں نے ان کی خانگی زندگی کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ یہ مرقعے مختلف واقعات اور تقریبات سے اخذ کر کے صورت پذیر ہوئے ہیں۔

ان کی کسی نظم میں مزدور کے اہل وعیال کی فاقہ کشی، کسی میں اس کے گھر میں عید کا منظر دل میں سوز نظارہ، کسی میں دیوالی کا منظر پیش کیا گیا ہے، جو شاعر کے مشاہدے کی صداقت پر مبنی ہے۔اسی طرح ''مزدور اور کسان'' بھی ایک اہم نظم ہے۔اس سے اشعار ملاحظہ ہوں:

اے بیکسو، مفلسو، غریبو	اے میرے وطن کے بدنصیبو
پوجو مرے آہنی قلم کو	دو آج دعائیں میرے دم کو
میں نے دلِ ذرہ کو تپش دی	کانٹوں کو عطا نئی خلش کی
مسرور ہو اے غریب مزدور	دنیا کا بدل رہا ہے دستور

دل شاد ہو اے کسان، دل شاد ہونے کو ہے تیرا دیس آزاد
آنے کو ہے فصلِ شاد کامی ہے عالمِ نزع میں غلامی
افرادِ وطن کا ساتھ دے کر ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر
پرواز کرو اب آشیاں سے
منزل نزدیک ہے یہاں سے!

محنت کش طبقہ، خاص طور سے مزدور اور کسان سے ترقی پسندی کے دور میں شعرا و ادبا نے بہت ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور طرح طرح سے ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے تھے۔ مذکورہ بالا گفتگو اور مثالوں سے سیماب کی اس موضوع سے دلچسپی عیاں ہو جاتی ہے۔ لیکن جس طرح مزدوروں کے دیگر طبقوں سے تعلق اپنی فکری و فنی جولانیوں کا مظاہرہ کیا ہے، اسی طرح پہاڑوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی مشقت اور سخت کوشی کو بھی بہت واضح انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ نظم مزدور کوہسار میں انھوں نے پہاڑوں کے مزدوروں کی حالت زار کا نقشہ حقیقت نگاری اور تاثیر کے ساتھ کھینچا ہے:

اس کی رفعت نے مگر مجھ کو بڑا دھوکا دیا ایک ہی منظر نے قلب و روح کو سمادیا
میں جہاں ٹھہرا تھا، تھی اس سے بھی نیچی ایک سڑک راہچہ جاتا تھا اک زینے سے اوپر مال تک
میں نے اک مزدور کو دیکھا وہاں چڑھتے ہوئے سیڑھیوں پر مثلِ مور ناتواں چڑھتے ہوئے
پیٹھ پر بارگراں، آنکھوں میں نم، دل میں خضوع جس طرح کوئی نمازی روئے ہنگام رکوع
آنسوؤں میں تھے پسینے کے بھی قطرے بے قرار رو رہی تھیں اس کی آنکھیں، تھی جبیں بھی اشکبار
خاک پر احساں تھا اس کے دیدۂ خونبار کا وہ بھی گویا چلتا پھرتا ابر تھا کہسار کا
اپنی لکڑی ٹیکتا، آہستہ بل کھاتا ہوا چل رہا تھا سختیٔ منزل سے کتراتا ہوا
کوئی اس کے اضطرابِ حال کا پرساں نہ تھا
جیسے سب انسان تھے، مزدور ہی انساں نہ تھا

سیماب نے اپنی نظموں میں اپنے زمانے کے رجحانات اور ان کے تقاضوں کو پوری

طرح سمو دیا ہے۔ وہ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی نظموں میں مزدوروں کے آنسو ہیں، ان کی مظلومیت ہے اور ان کے جذبات واحساسات کی انھوں نے پوری طرح مرقع کشی کی ہے اور بالآخر وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مظلوم ونادار طبقے میں بیداری پیدا ہو۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''سیماب نے دردمند ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول سے اثرات قبول کرتے ہوئے سرمایہ دار کے خلاف احتجاج کیا ہے''۔(۳۵)

بہرکیف سیماب سرمایہ داروں کو مزدوروں کے مقدس آنسوؤں کی عزت، ان کے کمزور دلوں کی دلجوئی اور انھیں حقِ خدمت ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''سیماب اپنے عہد کے بدلے ہوئے حالات میں مزدوروں کے لیے ایک سماجی قوت بن کر ابھرے''۔ (۳۶)

سیماب کی مذہبی، اخلاقی، اصلاحی نظموں میں ''قبروں کے غلط کتبے'' اور ''روحوں کے اعمال نامے'' اپنے اندر ایک جدت اور ندرت لیے ہوئے ہیں۔ ایک صوفی کا اعمال نامہ، ایک مولوی کا اعمال نامہ، ایک بادشاہ کا اعمال نامہ، ایک تاجر کا اعمال نامہ، ایک لیڈر کا اعمال نامہ، ایک طوائف کا اعمال نامہ وغیرہ دلچسپ اور انوکھی نظمیں ہیں، جس میں انھوں نے فطرتِ انسانی کی کمزوری کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً نظم ''ایک مولوی کا اعمال نامہ'' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے بچیرت پڑھنے والے کتبۂ لوحِ مزار — کر نہ ان کالک بھرے لفظوں پہ ہرگز اعتبار
ہے سیاہی ان کی میری روسیاہی پر گواہ — نامۂ اعمال ان سے بھی زیادہ ہے سیاہ
عالم قرآں تھا میں اور ماہر علم حدیث — باوجود اس کے مرا باطن تھا خاطی و خبیث
عام لوگوں کو تھا جن باتوں سے لازم احتراز — سب روا تھیں وہ مجھے در پردۂ ریش دراز

مل رہی ہے اب مجھے دنیا فریبی کی سزا　　ہے فشار قبر کا دن رات مجھ کو سامنا
اب تک اس کتبے سے آلودہ گنہگاری میں ہوں　　مبتلا مر کر بھی پاداشِ ریاکاری میں ہوں
دور لے جا کر مرے کتبے کا پتھر پھینک دے
اور میری لوحِ تربت کو کچل کر پھینک دے

جیسا کہ احادیث میں ہے، اعمال کا سلسلہ موت پر ختم ہوجاتا ہے۔نیک وبداعمال،اخلاص وریاکاری اور دوسرے تمام اعمال کی حقیقت مدت کے بعد ظاہر ہوکر رہتی ہے۔اعمال ناموں سے متعلق ان نظموں میں سیماب نے بھرپور طنز سے کام لیتے ہوئے سماج کے مختلف طبقات اور کرداروں کے اعمال اور سزاوجزا کا احتساب کیا ہے اور بالواسطہ طور پر ظاہر داروں، رہنماؤں،مولویوں اور تاجروں کو نیک عمل کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔

بابِ سوم:　　حدیثِ ادب

سیماب اکبرآبادی نے ''سازوآہنگ'' کے باب سوم میں ''حدیثِ ادب'' کے عنوان کے تحت شعروحکم پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کی قادرالکلامی اور شاعرانہ مہارت کی مظہر ہیں۔ان میں موضوعات کا تنوع اور بیان کی دلکشی ونیرنگی ہر جگہ اپنے جلوے دکھارہی ہے۔افکاروخیالات کے تموج کی لہریں ہر نظم میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ان کی نظمیں فرشتۂ محبت،تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں، نیلا ناگی، کمسن راہبہ سے، جنت ارضی،موجِ تصور وغیرہ اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ان نظموں میں تخیل کی رفعت،نفسیات پر گہری نظر اور معاشرے کے حالات سے بھرپور واقفیت کے نتیجے میں سیماب شاعری کے بہت بلند معیار پر پہنچ گئے ہیں۔ شوکت لفظی،ٹھہراؤ اور عمیق مشاہدہ اس حصہ کی اہم خصوصیات ہیں۔

سیماب نے ان نظموں میں اپنے اعلیٰ وارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔کتنا ہی فلسفیانہ وپیچیدہ خیال ہو اس کو شعری پیکر عطا کرتے وقت انھوں نے ادبی اور فنی

تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظم ''صبح بہار'' سے ایک بند ملاحظہ ہو:

رحمت ہے دہر کے لیے فطرت کا انقلاب گو اس سے فیضیاب نہیں ماہ و آفتاب
دنیائے کہکشاں میں تغیر نہیں کوئی نیرنگیوں سے عالم ارضی ہے کامیاب
یہ صبح و شام اور یہ دھوپ اور چاندنی یہ گرم و سرد یہ کبھی آندھی کبھی سحاب
انسان کا مزاج تنوع پسند تھا فطرت نے دے دیا اسے آرام و اضطراب
اکتا گئیں جو اس کی نگاہیں بہار سے موجِ خزاں نے کردیے پیدا نئے سراب
فصلِ خزاں سے جب ہوا افسردہ اس کا دل صبح چمن نے نذر کیا تختۂ گلاب
جب کمسنی کے کھیل سے دل تنگ آ گیا انگڑائی لے کے آ گئی سرمستی شباب

سیماب نے ہمیشہ وقت کے تقاضوں اور عصری رجحانات کو سمجھنے اور شاعری کے ذریعہ انھیں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے کسی بھی قسم کی لسانی، شعری اور ادبی گمراہی کو جائز قرار نہیں دیا۔ معمولی باتوں سے دوررس نتائج مرتب کرکے وہ ادب کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''کمسن راہبہ'' بظاہر رومانیت انگیزی سے شروع ہوتی ہے لیکن تقدس کے جذبات پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔

حسن رنگ و بو کی اک دعوت ہے عالم کے لیے اک پیامِ معصیت ہے ابن آدمؑ کے لیے
محفل عیش و طرب کا جزو غالب حسن ہے شاہد رنگیں ہے لازم بادۂ جم کے لیے
عصمتِ رنگِ شفق ہر شب کو ہوتی ہے تباہ باعثِ تخریب ہے ہر صبح شبنم کے لیے
ترکِ دنیا کا سبق دیتی ہے اہل ناز کو انتظام کسل ہے کیف مجسم کے لیے
ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی ہے مادیت کو وداع ترے سینے میں تڑپ ہے روحِ اعظم کے لیے
دیکھ وہ بجھنے لگے ایوان ہستی کے چراغ وہ فرشتے آئے تیرے خیر مقدم کے لیے

سیماب کے نظریات بلند اور اعلیٰ ادبی اقدار و معیار کے حامل ہیں۔ان کی نظموں میں پیش کردہ افکار کتنے ہی بلند و پیچیدہ ہوں، قاری کے ذہن کو نہ صرف بوجھل نہیں کرتے بلکہ اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتے ہوئے غور وفکر کی طرف راغب کرتے ہیں۔

سیماب کی نظم ''اختلاف ظرف'' کو پیش کیا جا رہا ہے جس میں تقابل کے ذریعہ زندگی کی منفی اور مثبت قدروں کو واضح کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

بلند کوش ہوں ماحول سے الگ ہوکر
ستارہ ہے مری بزمِ خیال کی قندیل
میں سجدہ گسترِ فطرت، تو سنگ و خشت پرست
تو بندۂ در آزر میں ہم مذاقِ خلیلؑ
براہِ راست مرا کاروبار عرش سے ہے
تو خاکداں کی انھیں پستیوں میں خوار و ذلیل
ہے طفلِ مدرسہ و خانقاہ تو اب تک
میں علم باطن و عرفاں کا فارغ التحصیل
تجھے ہے دعوتِ منزل ابھی جرس کی نوا
مجھے ہے نغمۂ منزل صدائے کوسِ رحیل
فرازِ طور سے بھی دور تر ہے بام مرا
بلند تیرے تصور سے ہے مقام مرا

یہ نظم سیماب کے افکار وخیالات اور ان کے تخلیقی مزاج کی اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے ٹھوس حقائق اور زمانے کے تقاضوں کو جذبے کی شدت کے ساتھ شعر کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں فنی چابکدستی، گہرائی، تخیل کی بلندی اور ندرت ادا بہت نمایاں ہیں۔ موجِ تصور، نیلا ناگی، خدا کہاں ہے، جنت ارضی، صداالصحرا، نوائے مستقبل وغیرہ اسی سلسلے کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ''خدا کہاں ہے'' کے عنوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا طویل قباؤں کی جنبشوں میں نہیں ہے
خدا سفید جٹاؤں کی بندشوں میں نہیں ہے

خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب ادھر آ
خدا کہاں ہے تجھے اس کا دوں جواب ادھر آ
وہ نامرادوں کے مجروح آسروں میں ملے گا
گناہگاروں کی خالص ندامتوں میں ملے گا
وفا پرست کے خوں ریز دامنوں میں ملے گا
غبارِ راہ سے ملفوف گیسوؤں میں ملے گا
وہ خون و خاک میں جلوہ نما ضرور ملے گا
خدا کے ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملے گا
مگر تسکین خاطر کا کوئی سامان تو دے دے
نہ دے کچھ اور بابا دل کا اطمینان تو دے دے

سیماب علم شعر اورفن عروض کی باریکیوں کے رمز شناس اور ماہر تھے۔انھیں الفاظ پر زبردست قدرت حاصل تھی اور بیان کی وسعتوں اور نیرنگیوں پر انھیں عبور تھا۔وہ جس موضوع کو جس طرح چاہتے،شعری قالب میں پیش کر دیتے۔اکثر ترنم وموسیقی اور منظر نگاری میں بھی وہ بے بدل نظر آتے ہیں۔انھیں خود بھی اپنے اس شاعرانہ کمال کا علم ہے اور اس پر یک گونہ ناز بھی کرتے ہیں۔بہرحال یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سیماب کی نظم نگاری،توازن اور تنوع کی دلکش مثال ہے۔ان کی ان نظموں میں حقیقتاً وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کو جان شاعری کہا جا سکتا ہے۔

باب چہارم: سرودِروح

ساز وآہنگ کے باب چہارم''سرودِروح''میں معتقدات سے متعلق نظمیں ہیں جن میں مذہبی شخصیات کا تذکرہ،فلسفہ اور انسانیت وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔فطرت الٰہی کا عرفانی دور اور اس کے مخصوص پیامی،عنوان کے تحت نظموں میں ابن آزر،ابن عمران اور ابن مریم وغیرہ شامل ہیں،جن میں سیماب نے مذکورہ شخصیات کے کردار کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔نظم فطرت

الٰہی میں ابن آزر یعنی حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس عہد میں انسان مذہب اور فطرت سے نا آشنا تھا۔ بدعات شرک ناروا، شخصیت پرستی، بت پرستی کی انتہا عروج کو پہنچ چکی تھی۔ لوگ خود تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھ رہے تھے اور آزر بت تراشی کا سب سے بڑا نمونہ تھا۔ ایسے دور میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کی آمد ہوئی جس کی تفصیلات تاریخوں میں موجود ہے۔ بالآخر ایک وقت آیا کہ انھیں حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ خدا کا گھر بنا اور عرفان ذات حق تعالیٰ کا دور شروع ہوا۔ نظم فطرت الٰہی کا عرفانی دور میں، جس کے آغاز میں انسان کے فطرت سے نا آشنائی کا بیان کرتے ہوئے خود تراشیدہ پتھروں کو سجدہ کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر آگے چل کر حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کا ذکر کر کے عبد اور معبود میں رابطے اور مرکزِ عالم مسلمہ میں بت توڑ کر خدا کا گھر بنانے کا بیان کیا گیا ہے اور ایسے دور میں انسان کو عرفانِ ذات باری کا آئینہ دکھایا ہے۔ اس طویل سلسلے کی نظم میں حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ کیا ہے جنھیں ابنِ عمران کے نام سے یاد کیا ہے۔ نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کیا مجبور اک الکن زباں کو رب ارنی پر — لگادی آگ دل میں ڈھونڈنے کو جب چلا پانی
صدائے ''لن ترانی'' بربنائے پردہ داری تھی — مگر منظور تھی خود ان کو اپنی جلوہ افشانی
فراز طور پر بجلی چمک کر ہوگئی پنہاں — کلیم اللہ کے دل پر ہوا الہام ربانی
کسی انسان نے تفویض کی ہوتی تو بول اٹھتا — عصا کی سامریت اور ید بیضا کی تابانی
ہوا ثابت وہ اپنی قوتوں کے ساتھ قائم ہے — وہی ہے حیّ قیوم اور وہی شایان یزدانی
کیا فرعون کو غرق آب رودِ نیل میں کس نے؟ — فرد کی کس نے اسرائیلوں کی دل کی طغیانی؟
وہ خود انسان کے پردے میں اب تنظیم فرما تھا — جو ''خوددار'' تھے انھیں کو تو مقدر تھی ''خدادانی''

خلیل اللہ کو عرفاں ملا تھا، بہترین اس کا
کلیم اللہ سے مقصود تھا عین الیقین اس کا

نظم ابنِ عمران میں سیماب نے حضرت موسیٰؑ کے معجزات، یدِ بیضا، صدائے رب ارنی،

ولن ترانی، فرعون سے کشمکش، عصائے سامری اور پھر دریائے نیل میں فرعون کے غرقاب ہونے کے واقعہ کو نظم کیا ہے جو بہت دلکش و موثر اور مذہبی و تاریخی حوالوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ نظم ابنِ مریم میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائیوں نے نیا فتنہ پیدا کر کے تثلیث کو اختیار کیا اور حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کرنے لگے اور پھر سے شرک و بدعات کا دور شروع ہو گیا۔ لیکن پھر غیرت الٰہی نے جوش مارا اور دنیا کو شرک و بدعات سے پاک کرنے کے لیے حضرت محمدؐ ابن عبداللہ کو جہان میں بھیج دیا تا کہ دنیائے انسانیت اسم و محبت کی روشنی سے منور ہو جائے اور پھر تو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب برپا ہو گیا جس کی ضیافشانی اور روحانیت قیامت تک باقی رہے گی:

خدا کی ترجمانی جس نے کی انسان کے پیکر میں　　سلام اس پر صلوٰۃ اس پر درود کائنات اس پر

نظام شرک پیغام رسول اللہ نے الٹا
نقاب ''اللہ'' کا فرزند عبداللہ نے الٹا

سیماب نے مذہبی، اسلامی اور تاریخی نظموں کے علاوہ ہندوستان کی تاریخی شخصیات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، جن میں سری کرشن، گرونانک، گوتم بدھ وغیرہ نظموں میں تاریخی صداقت کو شعریت کے لباس میں پیش کیا ہے۔

سیماب نے نظم نوازش دوست میں کرشن سداما کے عہد کو یاد کیا ہے۔ وہ بانسری کہاں ہے، میرا خطاب سری کرشن کی قوم سے وغیرہ نظموں میں ان کا آفاقی پیغام موجود ہے۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں صداقت، محبت، نغمہ عرفانیت سے فضا معمور و لبریز نظر آتی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ان کی تاریخی نظموں میں شعور کی بالیدگی اور گہرائی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں تاریخ کی ایسی ہستیوں کو پیش کیا ہے جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں اپنا اثر ڈالا ہے۔

باب پنجم: نغمۂ معصوم

قومی زندگی کے عروج وکمال اور تعمیر میں تو بچوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچے ہی قوم کے ستون و معمار ہوتے ہیں اور انھیں کے ذریعہ قوم کا مستقبل استوار ہوتا ہے۔ اردو میں بچوں کے فہم وادراک کے مطابق ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں جو ان کے ذہنی ارتقا اور اخلاق وعادات کو سنوارنے میں معاون و مددگار رہیں۔ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے نظیر اکبر آبادی نے بچوں کے لیے نظمیں لکھی تھیں جن میں کھیل کا بیان، سیر تماشے کا ذکر اور مناظر قدرت کا بیان خصوصیت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ نظیر کے یہاں اس نوعیت کی نظمیں ریچھ کا بچہ، ہنس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظیر کے بعد آزاد اور حالی بھی اس سے متاثر ہوئے اور بچوں کے لیے متعدد نظمیں لکھیں۔ حالی اور آزاد کی نظموں میں بڑی عمدگی اور کشش پائی جاتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی کا شمار بچوں کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے اور ان کی نظمیں درسی کتب میں ہمیشہ اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اسماعیل کو بچوں کی نفسیات، عادات اور جذبات کا گہرا شعور ہے۔ اس لیے انھوں نے ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر نظمیں لکھی ہیں جن میں برسات، خدا کی کاریگری، پن چکی، ایک جگنو اور بچہ، گائے، ایماندار لڑکا، جاڑا اور گرمی وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اقبال، تلوک چند محروم وغیرہ نے بھی بچوں کے لیے کئی نظمیں لکھی ہیں، جن میں ان کی دلچسپی کے موضوعات کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقا کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے حب وطن اور مناظر فطرت سے متعلق بھی متعدد نظمیں لکھیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں میں مذکورہ شعرا کے علاوہ سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرہ اہم ہیں۔

بچوں کے لیے نظمیں لکھتے ہوئے سیماب نے ان کے تصور، تخیل اور نفسیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی نظمیں ترنم، موسیقی اور غنائی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ موسیقی کا اثر بچوں کے اذہان پر زیادہ پڑتا ہے، جس کی وجہ سے بچے اسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے روزمرہ زندگی کے واقعات، فطری مناظر، گھریلو اشیا اور پالتو جانوروں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ اس حصہ میں سیماب کی نظموں میں دعا، خدا، بچوں کی دعا، خدا کا شکر ادا کرو، جگنو اور بچہ، بلبل اور گلاب، برسات، سلیمہ کی بلی، وطن کی لگن، میں ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام روشن کروں گا، ماں کی لوری، شام کی دعا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ نظمیں سیماب نے اس طرح لکھی ہیں کہ فطرت کا حسن ان میں ابھر آیا ہے۔ ان نظموں کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ یہ بچوں کی سمجھ اور ذہنی معیار کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بچوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ برسات ایک خوبصورت نظم ہے جس میں اختصار کے ساتھ ترنم بحر اور آسان لفظوں میں برسات کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

برکھا آئی، بادل آئے اوڑھے کالے کمبل آئے
ٹھنڈی ٹھنڈی آئیں ہوائیں کالی کالی چھائیں گھٹائیں
گرمی نے ڈیرا اٹھوایا دھوپ پہ سایہ غالب آیا
پھیلا دن کے ساتھ دھندلکا بھورا، بھورا، ہلکا، ہلکا
بدلی آئی شور مچاتی بھیگے بھیگے نغمے گاتی
بادل سے امرت جل برسا امرت جل کیا کومل برسا
ہوگئی زندہ مرہ کھیتی دھل گئے ذرے، چمکی ریتی

یہ رت یہ برسات کا موسم
ہے گویا جذبات کا موسم

بچوں کی نظموں میں ''سلیمہ کی بلی'' بھی ان کی ایک اور دلچسپ نظم ہے۔ اس نظم میں بلی اور بطور خاص پالتو بلی کی عادتوں کی ایک متحرک تصویر ابھرتی ہے۔ خاص کر اس کی چھینا جھپٹی، اس کے نازنخرے کی عادت، شرافت اور مانوسیت بہت خوبی سے بیان کی گئی ہیں:

بڑی شوخ ہے اور بہت منچلی ہے بڑے ناز نخروں سے گھر میں پلی ہے
ہے چھوٹا سا قد، رنگ میں صندلی ہے یہ سانچے میں قدرت کے گویا ڈھلی ہے
سلیمہ کی بلی بہت ہی بھلی ہے

نہ یہ کاٹتی ہے، نہ یہ نوچتی ہے بہت ہی غریب اور سیدھی بڑی ہے
سلیمہ سے اس درجہ ہل مل گئی ہے کہ اب اس کی گودی میں بیٹھی ہوئی ہے
سلیمہ کی بلی بہت ہی بھلی ہے

نظم ''جگنو اور بچہ'' میں انھوں نے بچوں کے جذبات اور ان کی ہمدردی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس نظم میں ان کا پیرایہ بیان مکالماتی ہے۔ اس نوع کی ان کی دوسری نظم ''بلبل اور گلاب'' ہے۔ ان نظموں میں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے درس موعظمت دیا گیا ہے۔ نظم کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی بچہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

دراصل سیماب اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ بچوں کی نظمیں ان کے اخلاق اور عادات کو سنوارنے اور ان میں شعور کی پختگی پیدا کرنے کی طرف رغبت دلانے والی ہونی چاہیے۔ ان کی نظم جگنو اور بچہ ملاحظہ ہو:

جگنو: ادھر آؤ اے میرے نادان بچے کروں گا میں دوچار باتیں تمہیں سے
ہو مصروف کیوں کھیلنے میں تم ایسے سنو تو سہی کچھ پڑھو گھر پہ جاکے
نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کے

بچہ: میں ابا کا جانی ہوں اماں کا پیارا نہیں رنج میرا کسی کو گوارا
نہ جاؤں گا پڑھنے، یہ ہے کیا اشارہ میں کھیلوں گا تیرا نہیں کچھ اجارا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

جگنو: نہیں پیارے بچے نہیں کھیل اچھا کہ پڑھنے کا ہے اک یہی تو زمانہ
اگر ابتدا سے رہا شوق اس کا تو آجائے گا پھر بہت جلد پڑھنا
نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کا!

بچہ: پکڑ لوں گا تجھ کو جواب تونے چھیڑا تو آیا بڑا علم والا کہیں کا
میں کھیلوں گا، کھیلوں گا ہر جا مجھے کھیل سے روکتا ہے پرندا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

اس نظم کی دلکشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کا انداز مکالماتی اور کہانی پن لیے ہوئے ہے۔ بچوں کو کہانیاں سننے کا فطری شوق ہوتا ہے اور ایسی نظمیں بچوں کے تجسس اور مسرت کے جذبے کو جگاتی ہیں، ان میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور زندگی کے تگ ودو میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ڈاکٹر زرینہ ثانی رقمطراز ہیں:

''نظم جگنو اور بچہ میں جگنو کی زبانی بار بار یہ مصرع ''نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کا'' دہرایا جاتا ہے تو اس بازگشت کی آواز سے بچہ رفتہ رفتہ مانوس ومتاثر ہوجاتا ہے''۔ (۳۷)

نظم ''جگنو اور بچہ'' سے بچوں کی نفسیات، ہٹ دھرمی اور ضد کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ یہ شاعر کے گہرے مطالعے کی دلیل ہے لیکن نظم کے آخر میں بچے کو ضدی ہونے کے باوجود اسے موم کی طرح پگھلتے دکھایا گیا ہے۔مثلاً:

جو تو علم کی روشنی ہے تو آجا مرے دل میں میرے جگر میں سما جا
مجھے پڑھنے لکھنے کا شیدا بنا جا اگر اور کچھ ہے تو ہٹ جا، چلا جا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

تلوک چند محروم لکھتے ہیں:

''بچوں کے لیے نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا مناسب نہیں بلکہ اسلوب کچھ اس نوعیت کا ہو کہ جو بھلائی ہم ان میں پیدا کرنا یا جس برائی سے انھیں بچانا چاہتے ہیں اس کی طرف کچھ ایسا اشارہ ہو کہ بچہ خود بخود اس اچھائی یا برائی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجائے اور اس کا دل از خود نیکی کی طرف مائل ہو اور بدی

سے تنفر ہو جائے''۔ (۳۸)

نظم ''جگنو اور بچہ'' کے بارے میں ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''جگنو اور بچہ میں اسی نوعیت کا اسلوب ملتا ہے کہ بچہ کے دل میں
علم کی فضیلت گھر کر جاتی ہے''۔ (۳۹)

جگنو اور بچہ کی طرح سیماب کی نظم ''بلبل اور گلاب'' بھی مکالماتی انداز کی نظم ہے۔ یہ بھی انھوں نے بچوں کے ذہن کو بالیدہ کرنے کے لیے لکھی ہے۔ نظم بلبل اور گلاب بڑی عمر کے بچوں کے لیے ان کے مزاج اور رجحان کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس نظم سے دو بند ملاحظہ ہوں:

بلبل:

پیارے مرے اے گلاب کے پھول   اے گلشن لاجواب کے پھول
رنگین، خموش، سیدھے سادے   اے ملک چمن کے شاہزادے
کرتی ہے بہار جب کنارا   ہوجاتا ہے زرد باغ سارا
آتا نہیں کیوں مجھے نظر تو؟   جاتا ہے چھپا چھپا کدھر تو؟
مرجھاتی ہیں تیری ساری کلیاں   رہتی نہیں پھر یہ رنگ رلیاں
اڑ جاتی ہے بو حنا کی مانند   ہوتا ہے فنا، ہوا کی مانند

گلاب:

اے مطربۂ بہار بلبل!   اے عاشق بے قرار بلبل!
ہوتا ہوں میں خاک ہی سے پیدا   آخر کو ہوں خاک ہی میں ملتا
غمخوار بھی غمگسار بھی ہے   ماں بھی ہے یہی مزار بھی ہے
دنیا میں ہیں جتنے پھول کلیاں   ہے سب میں بقا فنا نمایاں
مرجھا کے ہر ایک پھول پتا   ہوتا ہے پھر اس زمیں سے پیدا
ہر پھول میں ہے خدا کی قدرت
ہر خار میں ہے اسی کی حکمت

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، سیماب کا یہ وصفِ خاص ہے کہ انھوں نے اپنی نظمیں بچوں کے فہم و ادراک اور ذہنی ارتقا کی مناسبت سے لکھی ہیں۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

> ''بلبل اور گلاب میں ایک ایسی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے جسے بڑے ہو کر بھی سمجھنا دشوار ہی ہوتا ہے۔ لیکن طرزِ ادا کی دلکشی اور اسلوب بیان نے بچوں کے ذہن میں اس مسئلے کے اترنے کے لیے بہت کچھ گنجائش نکال لی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ نظم بڑی عمر کے بچوں کے ادب میں شمار کی جائے گی''۔ (۴۰)

بچوں کے ذہنی نشو و نما کی خاطر لکھی گئی نظموں میں ''دعا'' اور ''بچوں کی دعا'' اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں نسبتاً چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ نظم ''دعا'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے راجا پرجا کے مالک ۔۔۔ اے ساری دنیا کے مالک
اے دونوں عالم کے داتا ۔۔۔ تیرا نہیں کسی سے ناتا
کوئی نہیں ہے تیرا ہمسر ۔۔۔ تو ہے سب سے بالا برتر
ہم ہیں ترے در کے بھکاری ۔۔۔ شرم ہے تیرے ہاتھ ہماری
جس کو چاہے عزت دے دے ۔۔۔ جس کو چاہے ذلت دے دے
عزت ذلت کا تو مالک ۔۔۔ دوزخ جنت کا تو مالک
مالک ہے تو دونوں عالم کا ۔۔۔ خالق تو جن و آدم کا
چاہتے ہیں ہم تجھ سے عزت ۔۔۔ دے دے مولا دے دے عزت
عزت دے ہم کو دنیا میں ۔۔۔ راحت دے ہم کو عقبیٰ میں
یاد سے اپنی شاد ہمیں کر ۔۔۔ دنیا میں آباد ہمیں کر
عقل بھی دے اور علم عطا کر ۔۔۔ فہم بھی دے اور علم عطا کر
عشق کی بو موجود ہو دل میں ۔۔۔ تو ہی تو موجود ہو دل میں

بن جائے ہر کام ہمارا
حق پر ہو انجام ہمارا

اسی طرح ان کی دوسری نظم ''بچوں کی دعا'' ہے۔اس سے بھی چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اے میرے والی اے میرے مولا
اے میرے داتا اے میرے آقا
سب کے مولیٰ
سب سے اولیٰ
علم و ہنر دے بھر دے بھر دے
صحت بھی دے دولت بھی دے
عزت بھی دے
راحت بھی دے
میری دعا سن میرے خدا سن
دنیا تیری عقبیٰ تیری
تجھ سا کب ہے
تو ہی رب ہے

زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''سیماب کی نظمیں بچے کی عمر کی ہر منزل کے لیے لکھی گئی ہیں۔ دنیا اور دنیا دار، تاج محل اور نور جہاں کا مقبرہ، بڑی عمر کے بچے ہی پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ سادگی الفاظ نہیں جو سات آٹھ سال کے بچے سمجھ سکیں۔ ساتھ ساتھ ان کا موضوع اور مفہوم بھی کم عمر کے بچوں کے لیے نا قابل فہم ہو جاتا ہے لیکن یہ بچوں

کے ذہن کو بالیدہ کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں'' ۔ (۴۱)

اس حصہ کی مکالماتی نظموں میں دنیا دار دلچسپ نظم ہے۔ یہ بھی کم سن بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح تاج محل اور نور جہاں کا مقبرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جن کو صرف بڑی عمر کے بچے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نظم ''دنیا اور دنیا دار'' میں مکالماتی طرزِ ادا اختیار کیا گیا ہے اور اس نظم کے ذریعہ بچوں کو دنیا کے حوالے سے مثبت پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس نظم سے ایک مکالمہ پیش ہے:

دنیا:

مرگئے تو یہ نشاطِ جاودانی پھر کہاں   یہ گلستاں، یہ بہار گلفشانی پھر کہاں
یہ تماشائے حیاتِ بزم فانی پھر کہاں   یہ زمیں اور یہ فضائے آسمانی پھر کہاں
سیر کردنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی بھی رہی تو نوجوانی پھر کہاں

دنیادار:

بندۂ مجبور ہوں نظروں کو رسوا کیا کروں   میں نشاطِ جاودانی کی تمنا کیا کروں
ہوں افسردہ سیرِ گلشن کا ارادہ کیا کروں   سیکڑوں جھگڑے ہیں میری جان کو کیا کیا کروں
زندگی بے کیف ہے عزم تماشا کیا کروں
مجھ پہ دنیا تنگ ہے میں سیرِ دنیا کیا کروں

سیماب کی ایک اور نظم ''تاج محل'' ہے۔ یہ نظم بھی بڑی عمر کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس نظم سے نوحہ گری اور عبرت کی کیفیت سامنے آتی ہیں۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

یہ قصرِ مرمریں صنو خیز ہے جمنا کے پہلو میں   ثریا محوِ خواب ناز ہے، زہرا کے پہلو میں
ریاض سرمدی ہے کوثرِ رعنا کے پہلو میں   کہ روحِ تازگی بالیدہ ہے دریا کے پہلو میں
مجسم اک جگہ انوار ممتاز جواں کے ہیں

اور آنسو اس کے قدموں میں رواں شاہ جہاں کے ہیں

سیماب نے بچوں کے لیے ہلکے پھلکے انداز کی اور بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔پستی بلندی ہر جگہ اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ان نظموں میں شام کی دعا، میں ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام کروں گا، خدا وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس کو پڑھنے کے بعد اس کے اثرات بچے کے ذہن پر نقش ہوجاتے ہیں اور ان میں جوش ولولہ پیدا ہوجاتا ہے۔نظم ''ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام کروں گا'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ملک کی خدمت سحر و شام کروں گا کاہل نہ بنوں گا نہ میں آرام کروں گا
جس کام میں بہبود ہو وہ کام کروں گا ہر کام غرض قابلِ انعام کروں گا
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

میں جانتا ہوں ملک کو کیا کیا ہے ضرورت پھر کیوں نہ کروں گا میں بھلا ملک کی خدمت!
مدت سے نہیں ہند میں مقبول تجارت کوشش میں کروں گا کہ بڑھے صنعت وحرفت
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

کھیتی کو ترقی نہیں گزرے ہیں بہت سال ہر سال کہیں جنگ ہے موجود کہیں کال
افلاس یہ پھیلا ہے کہ ملتا ہی نہیں مال بدلوں گا میں اس ملک کا یکبارگی یہ حال
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

سیماب کی نظم ''شام کی دعا'' ایک مشہور نظم ہے کا اسلوبِ بیان سادہ اور ہلکا پھلکا ہے۔ اس میں بچوں کے ذہنی رجحان، جذبات اور کردار اور خدا پر ان کا یقین سبھی چیزیں موجود ہیں جو بچوں کے ادب کے اعتبار سے حقیقی معنویت رکھتی ہیں اور بچوں میں جوش وولولہ پیدا کرتی ہیں۔ گزشتہ نظموں کا آہنگ، اسلوب اور طرز تحریر بچوں کے ذہنی معیار کے مناسب ہے۔غرض بچوں کے اذہان کی نشو ونما اور شعور کی بالیدگی، ان کے اخلاق وکردار کی تعمیر وتشکیل میں سیماب صاحب کی تخلیق کردہ بچوں کی نظمیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

شعر انقلاب (۱۹۴۷)

سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا آخری مجموعہ ''شعر انقلاب'' دسمبر ۱۹۴۷ میں شائع ہوا۔ اس میں ۶۸ نظمیں اور ایک سیاسی غزل شامل ہے۔ شعر انقلاب کی پوری شاعری سیماب کے اسی طرح کے اصلاحی و انقلابی رنگ اور طرز بیان کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ مجموعہ ان کے کلام میں خاص اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ اس کی نظمیں قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ ایک بڑے شاعر کی طرح ان میں پیغام بھی ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان میں سیماب نے نہ صرف عصر حاضر کے مسائل پر تنقید کی ہے اور انقلاب کی دعوت دی ہے بلکہ خرابیوں کو دور کرنے کے مؤثر اور مفید طریقے بھی تجویز کیے ہیں۔ اس کی نظموں میں ''بھوکا ہندوستان''، ''پھوٹ کا گیت بین الاقوامی ساز شکستہ پر'' اور ''صبح بنارس'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

نظم ''بھوکا ہندوستان'' میں شاعر نے تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس ملک میں بکثرت تاریخی و مذہبی عمارات، متمدن شہر، تفریح گاہیں، ندیاں، غلے، میوہ جات اور معدنیات ہوں، وہاں کے لوگ بھوکے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جہاں تاج محل، قطب مینار، جامع مسجد، ایلورا، دولت باغ، شالامار جیسی یادگاریں اور مذہبی، تہذیبی اور تاریخی وراثتیں اور بندرابن کے مندر، امرتسر کا گرودوارہ، شوالے، مسجدیں ہوں، جہاں دہلی، آگرہ اور لاہور جیسے شہر، گنگا، جمنا اور جہلم جیسی ندیاں ہوں، وہاں کے لوگ بھوکے ہوں یہ ناممکن ہے۔ شاعر نے اس نظم میں نہ صرف ہندوستان کی بھوک کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اس کی حقیقت تک رسائی کی کوشش بھی کی ہے۔ سیماب کہتے ہیں:

بھوکے ہیں خود ہندوستانی بھوکا ہندوستان نہیں

بھوکا ہندوستان کو کہنا، آگاہی کی شان نہیں

بھوک ہے یہ روحانیت کی، بھوکا ہندوستان نہیں

سیماب کے نزدیک ہندوستان بھوکا نہیں، بلکہ ہندوستانی بھوکے ہیں اوران کی بھوک کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر روحانیت مفقود ہے۔اگر وہ روحانیت کو حاصل کرلیں تو ان کی بھوک بھی کافور ہو جائے گی۔

شاعر نے لوگوں کی بھوک کا علاج بھی تجویز کیا ہے اور علاج یہ ہے کہ لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات کو اختیار کریں اور خدا کو یاد کریں۔وہ چاہے جس مذہب کے ماننے والے ہوں، اگر انھوں نے اسے اپنایا، تو ان کی بھوک دور ہوسکتی ہے۔ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ صدقہ اور دان دیں اور ایمان کی دولت حاصل کریں۔ساتھ ہی ظلم وتکبر سے بچیں:

بھول گئے ہیں یہ مذہب کو دل میں خدا کی یاد نہیں
قرآں، وید، گرنتھ سے یعنی ان کے گھر آباد نہیں
جو اپنے رزّاق کو بھولے رزق اُسے دے کون یہاں
جس کے پاس نہیں کھانے کو وہ بھی ہے فرعون یہاں

اس مجموعے کی ایک اور اہم نظم ''پھوٹ کا گیت بین الاقوامی ساز شکستہ پر'' ہے جس میں شاعر نے پھوٹ کی فتنہ سامانیوں، اس کے دارۂ اثر اور اس کی خصوصیات کی نشاندہی موثر پیرائے میں کی ہے۔ ''پھوٹ''، یعنی ایک دوسرے کے درمیان اختلاف پیدا کر کے فساد پھیلانا۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس سے فتنہ فساد اور خانہ جنگی پیدا ہوتی ہے۔شاعر نے ہندوستان میں اس کی موجودگی کو بین الاقوامی نشانی قرار دیا ہے۔انگریزوں نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اصول پر برسوں عمل کیا اور ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر کے اپنی حکومت مضبوط اور وسیع کرنے کا وسیلہ اسی صفت کو بنایا۔ ہر شخص اپنے فرقہ کی اہمیت کو ترجیح دینے لگا اور حب وطن اور وطنی اتحاد سے بیگانہ ہوگیا۔ سیماب نے بہت خوبصورتی سے مکالماتی انداز میں پھوٹ کے فلسفہ اور اس کے تدارک پر گفتگو کی ہے۔ یہ نظم تقسیم ہند سے قبل لکھی گئی ہے۔اس سے اس کے پس

منظر کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو جاتی ہے:

فسادوں کی معاون، خانہ جنگی کی میں بانی ہوں
دیار ہند میں اک ''بین الاقوامی'' نشانی ہوں

شاعر نے اس کے مسکن و مراکز کی نشاندہی بھی کی ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تقدس کے مراکز بھی اس کے فروغ کا باعث بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں یہ اشعار تخلیق کیے گئے، اس وقت یہ جذبہ نہ صرف بہت طاقتور تھا، بلکہ اپنے ملک سے اتفاق واتحاد رخصت ہو کر ملک عدم کو سدھار گیا تھا اور ''پھوٹ'' کی لعنت نے اس کی جانشینی اختیار کر لی تھی۔ پھوٹ اور نزاع کے اس بیان میں زبان کی سادگی، سلاست، روانی و بے تکلفی کے ساتھ تخیل کے ہنرمندانہ استعمال کے سبب پوری نظم میں تاثیر اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مکالماتی طرز اظہار کے ساتھ خود پھوٹ کا اپنے بارے میں درج ذیل اظہار خیال بڑی معنویت کا حامل ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

کبھی مسجد مرا گھر ہے، کبھی مندر مرا مسکن
تقدس کے حجابوں میں ''تکدر'' کی کہانی ہوں
کوئی ہندوستاں میں میرا ہمسر ہو نہیں سکتا
میں تنہا جانشینِ ''اتفاق'' آں جہانی ہوں
مرے سیل تعصب سے ابھرنا غیر ممکن ہے
عقائد کا تلاطم ہوں، مذاہب کی جوانی ہوں
کروں میں غور شاید اس وطن سے کوچ کرنے پر
اگر ہر فرد یہ کہہ دے کہ میں ہندوستانی ہوں

آخری شعر میں پھوٹ نے ہندوستانی سماج سے اپنے کوچ کرنے کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے جو قابل غور و عمل ہے اور یہی سیماب کا تخلیق نظم کا مقصد ہے کہ ہر شخص اپنے فرقے یا

گروہ کے محدود جذبات کو تیاگ کر پورے وطن سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔

اس مجموعے کی ایک اور نظم ''صبح بنارس'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے گنگا کے کنارے کے دو متضاد خوبی وافادیت اور اس کے مذہبی تقدس کی حفاظت کی خاطر اس کی کثافت وآلودگی دور کرنے اور اسے ہر طرح سے پاک وصاف کرنے کے سلسلے میں سائنسدانوں اور عقیدت مندوں نے تو صرف گزشتہ بیس پچیس سال سے ہی راگ چھیڑا ہے اور اس کے لیے وزیر، بڑے بڑے افسر اور انجینئر، بڑے سے بڑے پروجیکٹ بناتے ہیں اور اپنی جیبیں بھرتے ہیں لیکن اب سے ۶۵ سال پہلے اردو کے ایک عظیم شاعر اور اپنے ملک کے نہایت دردمند، ہمدرد اور حساس محبّ وطن جناب سیماب اکبرآبادی نے اس ندی کے تقدس کا احساس اور اپنے جمالیاتی ذوق کا اظہار کرتے ہوئے اس کی صفائی رکھنے پر زور دیا اور اصرار کیا۔سیماب نے صبح کے وقت بنارس میں واقع گنگا کے کنارے صبح کے منظر کا بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں بنارس میں گنگا کے کنارے صبح کے وقت لوگوں کے اشنان، پوجا پاٹ اور سیر وتفریح ہوتی ہے اور دوسری طرف اسی وقت گنگا کے کنارے ایک مرگھٹ میں لاشیں جلتی ہیں۔شاعر یہ چاہتا ہے کہ گنگا کی حسین اور رومانی فضا کو باقی رکھا جائے اور اسے ان شعلوں اور اندر کی آلودگی سے محفوظ بنایا جائے۔ندرت تخیل اور شاعرانہ حسن کے ذریعہ شاعر نے اپنے محسوسات وتاثرات کو پیش کیا ہے۔نظم کے منتخب اجزا ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

سحر کی گود میں کیوں شام عبرت ناک ہوجائے
جواں نظروں کے آگے کیوں جوانی خاک ہوجائے
کنارے روز گنگا کیوں یہ مردے لائے جاتے ہیں
سرِ کوثر کہیں آتش کدے سلگائے جاتے ہیں

انھوں نے گنگا کی صفائی کے لیے اپنے وجدان سے یہ بہت اہم تجویز پیش کردی ہے:

نظر سے دور مرگھٹ کیوں نہ ہو تعمیر صحرا میں
وہاں سے راکھ لاکر کیوں نہ ڈالی جائے دریا میں
اگر ممکن نہیں اس رسم سے پہلو تہی ہونا
تو ہے دو چار ساعت بہتر اس کا ملتوی ہونا
سحر جب ساز رنگیں چھیڑ کر اپنا چلی جائے
تو پھر اس سوز غم افروز کو آواز دی جائے

یہ انتظام جیسا کہ عرض کیا گیا، اگرچہ ایک مخصوص مقام کے ایک جذباتی مسئلے سے تعلق رکھتا ہے لیکن گنگا کے اس منظر نے بہرحال شاعر کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا ہے اور اپنی شاعرانہ حسیات کو استعمال کرتے ہوئے سیماب نے جہاں ایک طرف خوب صورت مناظر کی تصویر کشی کی ہے وہیں اصلاح طلب پہلو پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ چنانچہ اس نظم میں تخیل اور شعری وسائل کے استعمال کے سبب ادبی حسن اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔

''شعر انقلاب'' کی نظمیں سیماب کی دلی کیفیات و احساسات اور فنی مہارت کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے عہد کی ملکی اور سماجی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے۔ ساتھ ہی صحیح رویے اور طریق کار کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کے مطالعے سے ذہن میں انقلاب کی دستک ہوتی ہے اور ایک عزم پیدا ہوتا ہے۔

حواشی

(۱) خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی،، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، ۱۹۸۵
ص ۱۳۷

(۲) ماہنامہ ''کندن''، سیماب نمبر، فروری ۱۹۹۳، ص ۲۵

(۳) خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی،، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، ۱۹۸۵
ص ۱۳۴

(۴) کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، مشمولہ مضمون از جلیل قدوائی، سیماب اکادمی،
کراچی پاکستان، ۱۹۸۵ ص ۱۹

(۵) کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، مشمولہ مضمون از پروفیسر نظیر صدیقی، سیماب اکادمی،
کراچی پاکستان، ۱۹۸۵ ص ۱۹

(۶) ایضاً، ص: ۲۲

(۷) سدرۃ المنتہیٰ، سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۶، ص ۱۹۴

(۸) لوح محفوظ، سیماب اکبرآبادی، مشمولہ مضمون از ابواللیث صدیقی، سیماب اکادمی،
کراچی پاکستان، ۱۹۸۵ ص ۲۲

(۹) ایضاً، ص ۲۳

(۱۰) خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، ۱۹۸۵ ص ۱۲۱

(۱۱) ایضاً، ص ۱۵۳

(۱۲) ایضاً، ص ۳۸

(۱۳) ایضاً، ص ۶۰

(۱۴) ایضاً، ص ۹۳

(۱۵) ایضاً،ص۱۶۲

(۱۶) سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، ۱۹۷۸،ص ۵۵

(۱۷) ایضاً،ص ۵۷

(۱۸) نیستاں، سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصرالادب، آگرہ، ۱۹۲۵،ص ۹۰

(۱۹) سیماب کے کلام میں سیاسی عناصر، اعجاز حسین، الوارث سیماب نمبر، ۱۹۴۹،ص ۴۶

(۲۰) سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، ۱۹۷۸،ص ۴۸

(۲۱) سیماب اکبرآبادی۔ سیاسی شاعری کے ایک عظیم ستون، پرویز شاہدی، شاعر، اگست، ستمبر ۱۹۶۱،ص ۳۶

(۲۲) حامد سعید خاں ساحل ٹونکی، شاعر، کارامروز نمبر، ۱۹۳۷،ص ۸۷

(۲۳) سیماب اکبرآبادی کا مجموعہ نظم باب الانتقاد، نیاز فتحپوری، نگار، اپریل ۱۹۳۵،ص ۵۰

(۲۴) سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، ۱۹۷۸،ص ۷۳۔۷۴

(۲۵) خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، ۱۹۸۵،ص ۲۸

(۲۶) یوسف حسین خاں، اردو غزل، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷،ص ۱۰۳

(۲۷) حامد علی نقوی، شاعر، کارِامروز نمبر، جولائی ۱۹۳۵،ص ۴۱

(۲۸) ایضاً،ص ۴۱

(۲۹) اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، حصہ دوم، ایوانِ اردو، پٹنہ، ۱۹۶۶،ص ۱۵۶

(۳۰) سیماب اکبرآبادی۔ ایک شاعرِ انجمن، سید سعید احمد، شاعر، اگست ۱۹۶۶،ص ۶۲

(۳۱) جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، مکتبہ عزم و عمل، کراچی، ۱۹۶۶،ص ۷۷

(۳۲) ایضاً،ص ۸۷

(۳۳) خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، ۱۹۸۵،ص ۱۲۸

(۳۴) سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی ۱۹۷۸، ص ۸۴

(۳۵) تاریخ ادب اردو، سیدہ جعفر، گیان چند جین ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۴۰۱

(۳۶) سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، بمبئی، ص ۱۳۳

(۳۷) ایضاً: ص ۱۳۲

(۳۸) رباعیات محروم، تلوک چند محروم (دیباچہ از جوش ملیح آبادی) مطبوعہ رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ، نئی دہلی، ۱۹۵۴، ص ۱۳۳

(۳۹) ایضاً، ص ۱۳۳

(۴۰) ایضاً، ص ۱۳۳

(۴۱) ایضاً، ص ۱۳۳

باب سوم

سیماب اکبرآبادی کے منظوم تراجم

اردو ادب میں ترجمہ نگاری کا فن بہت قدیم ہے۔ ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں اور ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشو ونما کے لیے بھی ضروری ہے۔ ایک لسانی طبقہ دوسرے لسانی طبقہ سے سماجی رشتہ قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات کو بخوبی سمجھنے کے لیے ترجمے کا سہارا لیتا ہے۔ ترجمہ نگاری وہ شے ہے جس کے ذریعہ نازک سے نازک مفہوم و مطالب کو خوش اسلوبی کے ساتھ دوسری زبان میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔ ترجمے کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے، نیز ادبی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس میں قارئین کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مترجم کو ترجمے کی زبان کے سرمایہ کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ الفاظ کے معنی و مطالب سے سمجھوتہ کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ صوتی آہنگ کے لیے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے اور مناسب لفظوں کی تلاش و جستجو کے بعد ہی صحیح ہیئت یا موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

ترجمے کے سلسلے میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ترجمہ نگار کو جس زبان سے ترجمہ کرنا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے، ان دونوں زبانوں پر اسے عبور حاصل ہونا چاہیے۔ نیز زبان کی ساخت، مزاج اور پس منظر سے بھی اس کی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ترجمہ صرف ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں منققل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس کی صحیح ترتیب و تاثر کے ساتھ منتقل کرنا ترجمہ نگار کا فرض ہوتا ہے۔

ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ترجمہ میں الفاظ کا صحیح استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ترجمہ نگار ناکام ہے تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس ضمن میں بہت اہم بات کہی ہے:

''خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا عمل ادبی اور تخلیقی نوعیت کا
ہے۔اس لیے دوسری زبانوں سے اردو میں منظوم منتقل کرتے
وقت علم بدیع و بیان پر نظر رکھنا ضروری ہے اور عروض وقوافی،
معائب ومحاسن سخن اور شعری اسالیب کا عرفان بھی ضروری
ہے''۔ (۱)

ایک اور جگہ عنوان چشتی منظوم ترجمے کے سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہتے ہیں:

''ترجمہ کی زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال یا انتقال فکر
کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی بہت پیچیدہ اور محنت طلب ہو جاتا
ہے جس کے لیے تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت
کی ضرورت ہے''۔ (۲)

ترجمے میں تکنیک اور اسلوب کا کام آرائش نہیں بلکہ مرکزی خیال کی ترسیل یا اظہار کا ہوتا
ہے۔سید مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا ہے:

''کسی خاص خیال کو کسی خاص اثر کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دو
زبانوں میں ایسے الفاظ ملنا تقریباً محال ہیں جو صوتی کیفیت،
معنوی ایتلافی حالت اور تاثیری قوت میں بالکل ایک سے
ہوں''۔ (۳)

اعلیٰ درجے کے منظوم ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے
ہیں۔اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔اس کے
علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ فلسفیانہ خیالات اور جذبے کی شدت کو پوری قوت کے ساتھ ترجمے
میں سمویا جاتا ہے۔اس میں بنیادی خیال، جذبہ اور فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان تکنیک اور
اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا خوبصورت
امتزاج ہوتا ہے۔

کسی بھی زبان کا ادب محض اپنے دائرے میں رہ کر خاطر خواہ وسعت اور بین الاقوامی معیار کا حامل نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے اسے دیگر قومی و بین الاقوامی زبانوں کے ادب سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر استفادہ کرنا، اثر قبول کرنا اور اپنا تاثر ان زبانوں کے ادب پر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ ترجمہ اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یعنی اپنی زبان کے ادب پاروں اور شہ پاروں کے ترجمے دوسرے زبانوں میں اور دوسری زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے اپنی زبان میں کرنے سے اپنے ادبی سرمائے کی وسعت و مقبولیت میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوتا ہے اور جب ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دوسری زبانوں کے قارئین ترجمہ کے توسط سے ہمارے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے ادب میں پیش کردہ تمام افکار و خیالات فنی رموز و نکات، شعری و نثری نیرنگیاں ان لوگوں تک بآسانی منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ ہمارے ادب کو مختلف جہتوں سے سمجھنے اور اس کی تحسین کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ادب کا کارواں وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے شاعروں، ادیبوں اور ترجمہ نگاروں نے عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور فرانسیسی شاہکاروں کے تراجم اردو زبان میں کیے جن کی بدولت اردو کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ عربی اور فارسی سے جذباتی لگاؤ اور مذہبی عقیدت کے باعث ان زبانوں سے اہل اردو کو ہمیشہ تعلق و شغف رہا ہے اور اسی سبب سے قرآن پاک کے متعدد تراجم اردو میں کیے گئے ہیں۔

(الف) وحی منظوم

یوں تو قرآن پاک کے نثری ترجموں کا سلسلہ کافی پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن منظوم ترجمہ کرنے کا سلسلہ تیرہویں صدی ہجری سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے کسی بھی شاعر نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلا منظوم ترجمہ سید غضنفر علی، منشی فاصل سونی

پت نے کیا تھا۔ انھوں نے صرف پارہ ''الٓم''، یعنی پہلے پارے کا ترجمہ کیا تھا۔ دوسرا منظوم ترجمہ شاہ شمس الدین شائق کا ہے، جس کا صرف پہلا ہی پارہ دستیاب ہے۔ تیسرا ترجمہ مطیع الرحمٰن خادم نے ''نظم المعانی'' کے عنوان سے کیا۔ چوتھا، آغا قزلباش نے کیا جس کے صرف تین پارے چھپے ہیں۔ پانچویں ترجمہ مولوی محمد عبداللطیف کا ہے۔ چھٹا عبدالسلام کا اور ایک ترجمہ فیضی نے کیا تھا۔ وہ بھی شاید مکمل نہ ہوسکا۔ بہرحال ان شعرا کی کوششوں اور کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سیماب اکبرآبادی نے بھی خیال ظاہر کیا کہ وہ بھی قرآن مجید کا ایک عام فہم، سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نظم کریں۔ وہ خود کہتے ہیں:

> ''میں ایک عرصہ سے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کرنے کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔ مسلسل غور وفکر کے بعد اب یہ محسوس کررہا ہوں کہ میرے ارادے میں تائید ایزدی شامل ہے۔ ہفتہ عشرہ میں ابتدائی تیاریاں ہوجائیں تو میں کام شروع کروں گا۔ جب تک ترجمہ مکمل نہ ہوجائے میں کسی بیرونی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا۔ البتہ قصرالادب کی وہ ذمہ داریاں جو مجھ سے وابستہ ہیں بدستور انجام دیتا رہوں گا''۔ (۴)

چنانچہ انھوں نے یہ عظیم اور مقدس کام شروع کردیا اور حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے اعلان کے مطابق سات ماہ تک مسلسل کام کرتے رہے اور تکمیل کے بعد ہی سکون سے بیٹھے اور اس طرح ان کی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ صفحۂ قرطاس پر رقم ہو چکا تھا اور اس یادگار تاریخی ترجمے نے ''وحی منظوم'' کا نام اختیار کرلیا۔

اس منظوم ترجمے کے مکمل ہونے کی خبر قصرالادب، آگرہ کے اخبارات وجرائد میں شائع ہوئی تو برصغیر کے گوشے گوشے سے مبارکباد کے خطوط موصول ہونے لگے اور سیماب کے ہمعصر شعرا نے تاریخی قطعات بھی لکھ کر انھیں بھیجے جن میں حامد حسن قادری، کیفی چریاکوٹی، سید

علی امیر احسن مارہروی، دل شاہ جہاں پوری، درد کاکوروی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ممتاز علمائے کرام اور معروف ادبا نے بے حد تحسین آمیز کلمات سے سیماب کو نوازا۔ ان کی اس علمی ادبی خدمات اور ''وحی منظوم'' کی تکمیل پر خراج تحسین پیش کیا اور اپنے سپاس نامہ میں سیماب کو ''شاعر اسلام'' کے خطاب سے نوازا۔

سیماب اکبرآبادی نے اپنے منظوم ترجمے پر خود نظر ثانی کی۔ اس کے بعد وہ اپنا یہ مسودہ لے کر مختلف مکاتب فکر کے علما کی خدمت میں گئے اور اس پر ان کی رائے جاننے کی کوشش کی۔ ان حضرات میں احمد مدنی، مولانا سعید اکبرآبادی مدیر ''برہان''، مولانا حفظ الرحمٰن ندوۃ المصنّفین دہلی، مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ شامل ہیں۔ ان حضرات نے اس ترجمے کو دیکھا اور مناسب مشورے بھی دیے۔ ترجمہ میں عربی متن سے جہاں ذرا سی بھی عدم مطابقت یا قرآنی مفہوم کے واضح نہ ہونے کا معمولی سا احتمال ظاہر کیا، سیماب نے ان کے مشورے کے مطابق اس کی اصلاح کر لی۔

سیماب نے یہ منظوم ترجمہ ''وحی منظوم'' کے نام سے صرف سات ماہ چھ دن کی قلیل مدت میں مکمل کر لیا۔ انھوں نے یہ ترجمہ بڑی احتیاط و ذمہ داری اور دل جمعی کے ساتھ کیا۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت قرآن کریم کے تمام آداب کا ادب و احترام ملحوظ رکھا۔ ترجمہ کرتے وقت ان کے سامنے مختلف تراجم اور تفاسیر موجود تھیں۔ اس لیے اکثر پورے عرصے وہ باوضو رہے۔ اس کتاب میں انھوں نے متعدد مشاہیر و مستند علمائے کرام کی آرا و تصدیقات شامل کی ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

> ''مترجم میں کسی عربی عبارت کو عربی ہی کے اندازِ فہم کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی تو وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب اور اس کے مخصوص طریقۂ تعبیر سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا اور اس بنا پر قرآن کے مفہوم و مطالب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے

ہوں گے جو اس کی عقل وفہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے''۔(۵)

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس کا ترجمہ زبردست محنت اور غیر معمولی ذمہ داری چاہتا ہے۔اس کے لیے نہ صرف عربی زبان سے واقفیت شرط ہے بلکہ ترجمہ نگار کے اندر ذوق عربیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔

علامہ سیماب نے ''وحی منظوم'' میں جہاں ترجمے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے وہیں ترجمہ کرتے وقت شاعری کے رموز ونکات سے بھی انحراف نہیں کیا ہے۔انھوں نے یہ ترجمہ اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے کہ کہیں قرآنی متن کے تقاضے نہیں چھوٹیں اور نہ ہی شعریت میں کوئی کمی محسوس ہو۔یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ انھوں نے پورے تیس پاروں کا ترجمہ ایک ہی بحر میں کیا ہے۔ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان کے ترجمے کی نوعیت واہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔موصوف نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں (جوہے) رب سارے جہانوں کا رحیم ومہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)
(یاالٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی
(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا ان کا رستہ جن پر انعام (وکرم) تیرا ہوا
راستہ ان کا نہیں جن پر غضب (کی) ہے (نگاہ) اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردہ راہ

سیماب نے ''قرآن پاک'' کا یہ منظوم ترجمہ آسان اور عام فہم زبان میں کیا اور پوری احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے زائد الفاظ کو قوسین میں جگہ دی اور جہاں کہیں ضرورت پڑی تو انھوں نے پورے مصرعے کو قوسین میں درج کیا۔''سورۃ الاخلاص'' کا ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا ہے:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں　　جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
کہہ دو ہے (میرا) خدا ایک اور خدا ہے بے نیاز　　ہے نہ زائیدہ نہ زائیدہ (جہاں کا کارساز)
اور نہیں ہے کوئی اس کے جوڑ کا (بے امتیاز)

''سورۃ الہمزہ'' اور ''سورۃ اللیل'' کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ لفظی بھی رہتا ہے اور حشو وزواید سے پاک بھی ہے۔ ''سورۃ اللیل'' کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت (مہرباں)

رات کی سوگند جب ہر چیز کو وہ لے چھپا　　اور قسم دن کی، وہ جب ہو خوب روشن پرضیا
اور اس کی جس نے مادہ اور نر پیدا کیے　　ہے تمہاری سعی بے شک مختلف (انداز سے)
(مال) جس نے (راہ مولا میں) دیا (اس سے) ڈرا　　اور ہے اچھی بات (یعنی دین کو) سچ جانتا
منزل آسان اس کی کردیں گے ہم آسانی کے ساتھ　　اور جو بے پروا رہا دینے سے روکا جس نے ہاتھ
اور اچھی بات کو جو جھوٹ ہے سمجھے ہوئے　　کردیں گے سختی میں جانا سہل ہم اس کے لیے
اور اس کا مال اس کے نہ کچھ بھی آئے گا　　جب جہنم کے گڑھے میں وہ گرایا جائے گا
ہے ہمارا کام بندوں کو دکھانا راستہ　　ہاتھ میں دنیا و عقبیٰ ہے ہمارا (برملا)
ڈراتے ہیں تمہیں (لوگو) بھڑکتی آگ سے　　صرف وہ بدبخت داخل اس میں ہوگا ٹوٹ کے
روکشی کی جس نے اور جو (حق کو) جھٹلاتا رہا　　متقی جو ہے وہ اس سے دور رکھا جائے گا
مال دیتا ہے کہ حاصل تزکیہ ہو نفس کا　　اور نہیں احساں کسی کا اس پہ جس کا دے صلہ
اس کو تو درکار ہے صرف اپنے ہی رب کی رضا　　جو ہے اعلیٰ عنقریب اس سے وہ خوش ہوجائے گا

سورہ ''ہمزہ'' کا ترجمہ سیماب اس طرح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں　　جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
ہے خرابی مطعن و ہرعیب جو کی (برملا)　　جس نے مال (وزر) سمیٹا اور گن گن کر رکھا
وہ سمجھتا ہے کہ دے گا مال ساتھ اس کا سدا　　کچھ نہیں وہ 'روندنے والی' میں پھینکا جائے گا

اور تم سمجھے ہو کیا یہ 'روندنے والی' ہے کیا؟ آگ سلگاتی ہوئی اللہ کی (سوز انتما)
وہ جو ایڑی سے لگی تو دل کی لے لے گی خبر بند اس میں کر دیے جائیں گے وہ (ارباب شر)
(شعلوں کے) لمبے ستونوں میں (بہ ہر سو گھیر کر)

ترجمے کے تعلق سے سیماب بہت محتاط تھے۔ وہ ایک ایک لفظ پر بہت غور و فکر کرتے تھے تا کہ کہیں معمولی سی بھی لغزش نہ آنے پائے۔ مولانا پرواز اصلاحی لکھتے ہیں:

''اردو کے تمام منظوم تراجم میں ادبی محاسن کے لحاظ سے جس قدر یہ ترجمہ اہم ہے اتنا کوئی نہیں کیونکہ اس میں جس قدر لغوی معنی کی رعایت کی گئی ہے اتنی کسی منظوم ترجمے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لیے اردو کے ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ ان سے بہتر ملنا دشوار ہے۔ ترجمہ باوجود یکہ خاصا تحت اللفظ ہے مگر اغلاق سے قطعاً پاک ہے۔ قرآن کی مراد کو واضح کرنے کے لیے جا بجا قوسین میں اپنی جانب سے الفاظ بڑھائے گئے ہیں مگر بہت قلیل مقدار میں۔ حالانکہ نظم تو نظم نثر میں بھی مترجمین بالعموم یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے مترجم ترجمے کو بامحاورہ کرنے کے لیے آخری الفاظ کا ترجمہ شروع میں اور پہلے حصے کا ترجمہ آخر میں کرتے ہیں۔ لیکن سیماب صاحب کے ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے بالکل مقابل میں دیا گیا ہے اور پھر بامحاورہ اور عام فہم کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کو پڑھئے تو اس میں مقدس نغمگی بھی ملتی ہے اور پاکیزہ آہنگ بھی ملتا ہے جو نہ صرف شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے بلکہ وجد آفریں کیفیت بھی پیدا کرتا ہے''۔ (٦)

اس ترجمہ میں ہر ہر جگہ روانی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اس کا آہنگ اور نغمگی بھی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سیماب کے ذریعے کیے ہوئے چند مزید سورتوں کے ترجمے یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سورہ ''قریش'' کا ترجمہ سیماب اس طرح کرتے ہیں:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں میں آغاز (بیاں)

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

چونکہ ہیں اہل قریش اس بات کے خوں آشنا　　جاڑے گرمی کے سفر سے انس (ان کو ہے بڑا)

چاہیے ان کو، کریں اس گھر کے رب کی بندگی　　جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا (بھر کے جی)

خوف سے (غارت گری کے) پھر اماں بھی ان کو دی

سورۂ ''فیل'' کا ترجمہ سیماب یوں کرتے ہیں:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں میں آغاز (بیاں)

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

(اے پیمبر) کیا نہ دیکھا تم نے (غور وفکر سے)　　ہاتھی والوں سے کیا (برتاؤ) کیا اللہ نے

کیا نہیں اس نے غلط سب داؤ ان کے کردیے　　اور پرندے جھنڈ کے جھنڈ ان پہ بھیجے (غیب سے)

سورۂ ''عصر'' کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)　　جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

(اے پیمبر) ہم قسم کھاتے ہیں تم سے عصر کی　　بالیقیں انساں خسارے میں ہے (سوچو تو سہی)

ہاں مگر، جولائے ایمان اور عمل اچھے کیے　　اور وصیت (دین) حق کی باہمی کرتے رہے

اور جو کرتے رہے تاکید باہم صبر کی　　(وہ خسارے میں نہیں ہیں فائدے میں ہیں وہی)

''وحی منظوم'' کی مندرجہ بالا مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ردیف وقافیہ اور عروض ووزن کے باوجود سیماب اپنے ترجمہ میں مفہوم کی وضاحت وسلاست کے لیے کم الفاظ

استعمال کرتے ہیں۔اس سے سیماب کی زبان دانی، الفاظ پر تصرف اور عربی زبان پر دسترس ظاہر ہوتی ہے۔ سیماب کے منظوم ترجمے کے جو چند نمونے یہاں پیش کیے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس ترجمہ میں کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو کس طرح احسن طریقہ سے نظم کیا گیا ہے۔

ترجمہ نگاری کی ایک اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ شدہ زبان کے الفاظ متن سے حتی الامکان مطابقت رکھتے ہوں۔اس لیے زبان دانی کی شرط لازم ہوتی ہے۔ترجمہ نگار کے پاس جب تک ذخیرۂ الفاظ نہ ہو اسے زبان پر مکمل عبور نہ ہو وہ مناسب ترجمہ کرنے کا اہل نہیں کہا جاسکتا۔کلام پاک کے دیگر منظوم تراجم کا سیماب کے اس ترجمہ سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں کی مناسب پیشکش، سلیقہ مندی اور زبان پر عبور سیماب کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔سیماب سے قبل قرآن کریم کے ان منظوم تراجم میں ایسی خصوصیت کا فقدان ملتا ہے۔سورۂ فاتحہ کے تراجم کی مختلف مثالیں ملاحظہ ہوں جس سے سیماب کے ترجمے کی امتیازی حیثیت کا تعین ہوتا ہے:

ہے سزاوار خدائے (پاک) ساری خوبیاں   جو ہے رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں

سیمابؔ

ہے خدا کے لیے ثنا ساری   سب جہانوں کا ہے وہی والی

مہربان و رحیم ہے جو بڑا   مالکِ روزِ حشر و روز جزا

غضنفرؔ علی

سب ستائش ہے سزاوار خدا   جو کہ رب ہے جملہ مخلوقات کا

وہ ہے بخشش کرنے والا مہرباں   مالکِ روزِ جزائے انس و جاں

شائق ایزدی

جملہ خوبی خدا کو ہے شایاں کہ ہے پروردگار عالمیاں
کہ بہت رحم و مہر والا ہے جس کی رحمت بیاں سے بالا ہے
عبدالسلام سلاؔم

سبھی خوبی سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا بزرگی ہے اسی آقائے عالی جاہ کو زیبا
وہ ہے سارے جہانوں کا خدائے برتر و بالا برابر ساری مخلوقات کا ہے پالنے والا

بہت ہی مہرباں ہے وہ بڑا ہی مہرباں ہے وہ سدا رحمت فشاں، رحمت فشاں، رحمت فشاں ہے وہ
کیف بھوپالی

سید غضنفر علی ''رب'' کا ترجمہ ''والی'' کرتے ہیں۔ یہ لفظ مفہوم کی درست ادائیگی کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح خدا کو مالک روز حشر و روز جزا ایک ہی مفہوم کی ادائیگی میں کرتے ہیں۔ وزن کو پورا کرنے کے لیے الفاظ کے اضافے شعری اعتبار سے جائز نہیں ہوتے۔

اسی طرح شائق ایزدی نے ''سب کے ساتھ'' ستائش واحد کا استعمال عالمین کے لیے مخلوقات کا لفظ استعمال کیا ہے تو یوم الدین کا ترجمہ ''مالک روزِ جزائے انس و جاں'' کیا ہے۔ ضرورت سے زیادہ لفظوں کا استعمال یا نامناسب الفاظ کی ادائیگی اس ترجمے کو کمزور کر دیتی ہے اور نظم کی شعریت جاتی رہتی ہے۔ کیف بھوپالی کا ترجمہ، تشریح و تفسیر زیادہ معلوم ہوتا ہے اور ترجمہ کم۔ جب کہ نظم اپنے اشاراتی اسلوب سے اپنا خمیر تیار کرتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ سیماب کے ترجموں کی یہی خاص بات ہے کہ وہ اپنے اشاراتی اور علامتی اسلوب سے مزین ہوتے ہیں۔ زبان پر عبور انھیں کہیں لفظوں کی ادائیگی کے لیے بھٹکنے نہیں دیتا اور نہایت مناسب ذخیرۂ الفاظ ترجمہ میں معاون بنتا ہے۔ سیماب کے ترجمہ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی متن پر ارتکاز کرتے ہوئے اسی کے عین مطابق اردو کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور زائد الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ جب کہ کیف بھوپالی کے ترجمے میں زائد الفاظ کی کثرت

نے نہ صرف یہ کہ شعریت کو مجروح کیا ہے بلکہ مناسب ترجمہ سے بھی بُعد پیدا ہو گیا ہے۔ اس فرق کا اندازہ بآسانی دونوں شعرا کے درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

کیا نہیں کھولا، تمہارا سینہ ہم نے (اے نبی) — اور تمہارا بوجھ تم پر سے اتارا (واقعی)

بار سے جس کے تمہاری ٹوٹی جاتی تھی کمر — اور تمہارے ذکر کو دیں رفعتیں (ہر ذکر پر)

ساتھ مشکل کے ہے آسانی یقیناً (اے نبی) — ساتھ دشواری کے آسانی بھی ہے بے شک (لگی)

جب فراغت ہو (تردد سے) ریاضت تم کرو — اور (دل سے) اپنے رب ہی کی طرف راغب رہو

سیماب

تجھے بخشی نہیں کیا وسعتِ قلب وجگر ہم نے — بتا کیا کم نہ کرڈالا ترا بار کمر ہم نے

کمر تیری جھکی جاتی تھی اتنا بوجھ تھا تجھ پر — زمانے سے نپٹ لینا بڑا دشوار تھا تجھ پر

محمدؐ دیکھ تیری بات کیا اونچی نہ کی ہم نے — زمیں سے آسماں تک تجھ کو عظمت بخش دی ہم نے

کوئی مشکل نہیں ایسی کہ جو آساں نہ ہوجائے — نہ گھبرائے مصیبت سے کبھی انساں نہ گھبرائے

بڑائی ذکر اس کی، سرفرازی پکار اس کی — اسی کا کام کرکے بندگی کر بار بار اس کی

کیف بھوپالی

سیماب کے ترجمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر آیت کا ترجمہ ایک مصرع یا اسی ایک شعر میں مکمل ہوجاتا ہے اور اس طرح اس میں ایک طرح کا نظم مضمون اور الفاظ اور اشعار میں ایک طرح کی تنظیم برقرار رہتی ہے اور ایک توازن کی سی کیفیت ترجمہ میں نمودار ہوجاتی ہے جو نظم کا خاصہ ہے۔ نیز اس احتیاط اور التزام سے ان کی عالمانہ بصیرت کا احساس بھی ہر گام پر ہوتا ہے۔

سیماب کے اس ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت سلاست، روانی اور اختصار و جامعیت ہے۔ یہ صفات قرآن پاک کے دوسرے تراجم میں موجود نہیں ہے، کہیں فارسی آمیز ترجمہ کی

کوشش ہے تو کہیں مناسب الفاظ درج نہیں ہیں۔ کہیں زبان کی غلطیاں ہیں تو کہیں حشو و زوائد موجود، کہیں ترجمہ کے بجائے تشریح و تفسیر ہے تو کہیں وزن اور قافیہ کی تنگی کا احساس۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار مختلف تراجم سے درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی   اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی

سیمابؔ

ہیں عبادت گزار تیرے ہی   چاہتے ہیں مدد بھی تجھ سے ہی

غضنفر علی

تیری ہی ہم بندگی ہیں کررہے   اور تجھی سے ہم مدد ہیں مانگتے

تجھ کو ہی کرتے ہیں عبادت ہم   اور تجھ سے ہی لیں اعانت ہم

شائق ایزدی

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری   تجھے آتی ہے اپنے آرزو مندوں کی دلداری

کیف بھوپالی

(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا   ان کا رستہ جن پر انعام (وکرم) تیرا ہوا

راستہ ان کا نہیں جس پر غضب (کی) ہے نگاہ   اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردہ راہ

سیمابؔ اکبرآبادی

راہ سیدھی ہمیں خدا بتلا   راہ ان کی کہ جس پہ فضل کیا

جن پہ غصہ ہوا نہ ان کی راہ   اور نہ ان کی جو ہوگئے گم راہ

غضنفر علی

تو چلا ہم کو براہِ راستی   راہ ان کی جس پہ بخشش تونے کی

پر نہ ان کی رہ غضب جن پر ہوا   اور نہ ان کی جو ہیں گمراہ ازہدیٰ

شائق ایزدی

کر ہدایت ہمیں وہ سیدھی راہ   کہ مراد اس سے ہے کتاب اللہ

راہ ان کی ہمیں ہدایت کر تو نے انعام کرلیا جن پر

عبدالسلام سلاؔم

خدایا ہم کو سیدھی راہ کی ہردم ہدایت کر دکھائے راہ ان کی، کی ہیں تونے رحمتیں جن پر

نہ ان لوگوں کی ہاں جس پر ہوا غیض وغضب تیرا نہ ان کی جو ہوئے گمراہ و کافر اور تجھے چھوڑا

فیضی

دکھادے ہم کو سیدھی راہ، سیدھی راہ پہ لے چل جنھیں تونے نوازا ہے انھیں کی راہ پہ لے چل

نہ ان کی راہ پر لے چل خدائی مار ہے جن پر تیری پھٹکار ہے جن پر تری دھتکار ہے جن پر

نہ ان کی راہ پر لے چل بھٹک کر رہ گئے ہیں جو ملمع کی طرح چمکے، چمک کر رہ گئے ہیں جو

کیف بھوپالی

یہاں وہ تمام خامیاں ذہن اور نظر کو کھٹکتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ عبدالسلام صاحب کے یہاں زائد الفاظ، کیف بھوپالی کے یہاں تشریح وتفسیر، غضنفر صاحب کے یہاں سلاست، روانی کے ساتھ ساتھ غیر ضروری اختصار ہے اور فیضی کا ترجمہ دیگر تراجم کی نسبت بہتر ہے۔ البتہ سیماب کا ترجمہ ان تمام اوصاف سے مزین ہے، منظوم ترجمہ جن کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کے یہاں سلاست، روانی اور سادگی کے ساتھ ساتھ اختصار و جامعیت ہے، زبان کا بہتر استعمال ہے، عربی مفہوم کی بہترین ادائیگی اردو نظم میں ڈھال دی گئی ہے۔ ردیف وقافیہ کی تنگی کا دور تک احساس نہیں ہوتا۔ اس طرح مجموعی اعتبار سے سیماب کا یہ منظوم ترجمہ اپنے فرائض کی پوری ادائیگی کرتا ہے۔ سیماب نے ترجمہ میں اسلاف کے مستند ترجموں کو لازمی قرار دیا ہے اور کہیں تجدد کی راہ اختیار نہیں کی۔ متن کے بہت قریب رہ کر انھوں نے قرآنی مطلب کو صحت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ''وحی منظوم'' جہاں ایک طرف شعریت ونظمیت کے ساتھ ساتھ عروض وبیان کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے اور سیماب کی استادانہ پختگی اور فنی مہارت کی مظہر ہے تو دوسری طرف ترجمانی قرآن کی صحت اور علمیت اور راست فکری کی آئینہ دار بھی ہے اور اس لحاظ سے

''وحی منظوم'' اردو ادب کا ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے اس منظوم ترجمے کے معیار اور عظمت کا اندازہ ان کے عہد کے عربی اور دینی علوم کے علما وفضلا کے ان بیانات اور تصدیق ناموں سے بھی ہوتا ہے جو سیماب نے اس ترجمہ کے ساتھ منسلک کیے ہیں۔

ان میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ سیماب کے ترجمے کی اہمیت واضح ہو سکے۔مولانا حفظ الرحمٰن ''وحی منظوم'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سیماب صاحب کی قدرتِ کلام حسن نظر وانسجام لطافت و سلاستِ زبان، ادائے مفہوم میں لفظی ترجمے کی رعایت کا التزام، ایسے امور ہیں جن کے پیش نظر اس کو مستند اور لائق اعتماد کہا جا سکتا ہے اور موصوف کی محنت وکاوش قابل تبریک وتحسین ہے''۔ (۷)

مولانا حسین احمد مدنی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں نے یہ ترجمہ حضرتِ سیماب کا بعض بعض مقامات سے دیکھا ماشاءاللہ نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتا ہے''۔ (۸)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ایڈیٹر'برہان' رقم طراز ہیں:

> ''خاکسار راقم الحروف نے قرآن مجید کا مفہوم ترجمہ از سیماب صاحب اکبرآبادی تقریباً از اول تا آخر تمام کا تمام دیکھا اور اب میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مترجم نے یہ ترجمہ بڑی احتیاط اور کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ کیا... جا بجا قوسین میں جو فقرے اور عبارتیں ہیں وہ سب توضیحی اور تشریحی ہیں جن سے ترجمے کے سمجھنے میں مدد ہی مل سکتی ہے۔ نہ کہ مفہوم قرآن میں کسی قسم کا ردو بدل واقع ہوا ہو۔ ترجمہ پر نظر کرنے کے بعد

بعض مقامات پر کوئی لفظ کھٹکا تو میں نے بے تکلف مولانا سے
عرض کر دیا اور مولانا نے منظور کر کے وہیں ترمیم و تنسیخ کر دی۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ منظوم ترجمہ قرآن اردو میں اپنی نوعیت
کا پہلا واحد کارنامہ ہے''۔ (۹)

مولانا عبدالنعیم صدیقی کے الفاظ میں:

''موصوف نے محض خدا کے فضل سے سات ماہ کی مسلسل
جدوجہد کے بعد قرآن کریم کا توضیحی ترجمہ نہایت شگفتہ بحر اور
دلآویز پیرایۂ بیان میں مکمل فرمایا، میں نے بعض مقامات کا
ترجمہ خود دیکھا اور مطمئن ہوں کہ حتی الامکان، اقوال کو اختیار کیا
گیا ہے''۔ (۱۰)

(ب) الہام منظوم

قرآن پاک کے ترجمہ ''وحی منظوم'' کے علاوہ سیماب اکبرآبادی نے ترجمہ کے فن میں ایک اور بڑا کارنامہ انجام دیا۔ مشہور مفکر اور فارسی کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معرکہ آرا تخلیق ''مثنوی معنوی'' یا ''مثنوی مولانا روم'' کا منظوم ترجمہ سیماب نے بہت دل جمعی، محنت، توجہ اور بھرپور فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اس مثنوی کے متعدد تراجم کیے گئے تھے جن میں درد کاکوروی، مولانا راسخ، مولانا یوسف علی شاہ کے منظوم اور قاضی سجاد حسین کا منثور ترجمہ خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ سیماب نے بھی قرآن پاک، مثنوی مولانا روم اور خطبات عزیزیہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس طرح بحیثیت مترجم بھی اردو شاعری میں سیماب کا اہم مقام ہے۔ فن شعر پر کامل عبور اور فارسی ادبیات و شاعری پر گہری نظر کا ہی نتیجہ تھا کہ موصوف نے کلام پاک کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مثنوی مولانا روم جیسے مشکل اور طویل شہ پارے کا ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ کام انھوں نے مولوی فیروز الدین،

مطبع فیروز سنز لاہور کی فرمائش پر کیا تھا۔ مولانا روم کی شاہکار مثنوی جو ''مثنوی معنوی'' کے نام سے بھی موسوم ہے، مولانا کی ایسی تصنیف ہے جسے کئی صدیوں سے فارسی زبان وادب ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بھی غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔ شاعری کے میدان میں ایسا زبردست کارنامہ انجام دے کر سیماب نے اس موضوع پر بھی اپنا امتیازی مقام حاصل کرلیا ہے۔ سیماب کی اس کاوش سے متعلق مولانا محی الدین قائد رقم طراز ہیں:

> ''لاہور کے زمانۂ قیام میں سیماب نے ایک ایسا کارِ عظیم انجام دیا ہے جسے اب تک عہد حاضر کا کوئی شاعر مکمل نہ کرسکا تھا۔ وہ کارِ عظیم مثنوی مولانا روم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ سیماب نے اپنی زندگی میں جہاں اور بہت سے کارِنمایاں کیے ہیں ان میں سب سے افضل کارنامہ یہی ہے جسے قیامت تک دنیا فراموش نہ کرسکے گی''۔ (۱۱)

اس وقت کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کی ملاقات سے پہلے بھی مولوی فیروزالدین نے اس ترجمہ کی ضرورت محسوس کی تھی اور اس کے لیے انھوں نے سب سے پہلے امیر مینائی سے رابطہ کیا۔ موصوف نے اس کام کو بے حد پسند کیا لیکن اپنی عمر کی درازی اور ضعیف اعضا کے سبب اس عظیم کام کی انجام دہی سے معذرت کرلی۔ اس کے بعد فیروزالدین مرحوم نے سیماب سے اس کام کی درخواست کی۔ سیماب کا شمار اس عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اس کام کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کیا بلکہ اس خدمت کو بہت احسن طریقہ سے انجام بھی دیا۔ نیز تین سال کی سخت محنت اور جاں فشانی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس کا نام ''الہام منظوم'' رکھا۔

علامہ سیماب کی خواہش تھی کہ ''مثنوی معنوی'' کے ترجمے میں فارسی متن جیسی اثر آفرینی قائم رہے۔ اسی خواہش کے تحت انھوں نے بارگاہِ رب العزت میں اس طرح التجا کی:

فی الحقیقت مثنوی کا ترجمہ
ترجمہ ہے وحی اور منظوم کا
گر تری توفیق ہوجائے رفیق
طے ہو اک پل میں یہ وادی عمیق

آگے چل کر وہ مزید دعا کرتے ہیں:

جو بھی جوہر آئینے کے ہوں عیاں
ان کی طلعت کا بنے یہ ترجماں
مقصد اور مضمون پورا کھول کر
ترجمہ ہو خوش بیانی سے مگر
ہر جگہ مقبول ہو اردو میں بھی
مثنوی معنوی مولوی
کام تھا یہ اک گروہ خاص کا
اور یہاں آسرا اخلاص کا

ترجمہ کی عمدگی سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ سیماب کی دعا کو بارگاہِ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل ہوا۔ انھوں نے بامحاورہ سلیس اور دلکش اردو زبان میں فارسی زبان کے مفاہیم کو ادا کیا۔ اس ترجمے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر جگہ فارسی زبان کے مفہوم کو بحسن وخوبی اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی کے پہلے دفتر سے بالکل ابتدائی اشعار یعنی آغاز مثنوی کا متن اور اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش

من بہر جمعیتے نالاں شدم جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من وز درونِ من نہ جست اسرا من

رومؔ

سن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری بس شکایت کررہی ہے ہجر کی
جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے مرد و زن روتے ہیں میرے شور سے
پارہ پارہ کردے سینہ جب فراق تب کہیں ہو شرح درد اشتیاق
جارہا ہو اصل سے جو اپنی دور اپنا عہد وصل ڈھونڈے گا ضرور
میں ہر اک مجلس میں فریادی ہوئی غم زدوں اور خوش دلوں کے منہ لگی
سب نے یاری مجھ سے کی حسبِ گماں پر نہ ڈھونڈے مجھ میں اسرا نہاں

سیماب

سیماب زبان دانی کے لحاظ سے بہت مستند شاعر تھے۔مثنوی مولانا روم کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے اس میں غزل کی سی نزاکت اور لطافت پیدا کر دی ہے۔ان کے اس ترجمے میں زبان کی سادگی وسلاست ،انداز بیان کی خوبی وروانی سب کچھ موجود ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ان کا دینی شغف اور روحانی بصیرت بھی ایسا عمدہ ترجمہ کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

علامہ سیماب نے ترجمہ ''الہام منظوم'' نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کیا اور الہامی افکار کو اس خوبی سے اردو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے کہ ان کی اس فنی نادرہ کاری کا اپنا الگ امتیاز قائم ہو گیا۔اردو میں صحت زبان کے ساتھ ساتھ صحت مفہوم کو واضح طور پر ادا کرنے کی کوشش سیماب نے نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔''الہام منظوم'' کی اہمیت وافادیت ادبی لحاظ سے تو ہے ہی ساتھ ہی مذہبی اور تبلیغی نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ ہے۔سیماب کے منظوم ترجمے پر اظہار خیال کرتے ہوئے محترمہ انجم صبحی نے لکھا ہے:

''مرشد مولانا روم کی مثنوی کو دنیا کے بین الاقوامی ادب میں جو

درجہ حاصل ہے وہ اظہر من الشّمس ہے ہمارے واعظ اور مبلغ دوران تقریر مثنوی شریف کے اشعار پڑھا کرتے ہیں......واعظ اور مبلغ جب مولانا روم کی مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں تو وہ خوب جھومتے ہیں۔ حضرت علامہ کی دوررس نگاہوں اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے والے دماغ نے یہ محسوس کیا اور پھر انھیں احساسات کے پیش نظر علامہ سیماب مثنوی شریف کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے اور کمال یہ کہ عوام تک مولانا نے اصل کی خصوصیت برقرار رکھنے کے علاوہ اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی اور اس قدر برجستہ اور شستہ ترجمہ پیش کیا کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے''۔ (۱۲)

فارسی زبان کے تمام مفاہیم کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مثنوی کا ترجمہ سیماب نے بامحاورہ، سلیس اور دلکش اردو زبان میں کیا، جس میں مثنوی کی اصل خصوصیت بھی برقرار رہی اور ان کی انفرادیت بھی قائم رہی۔ یوں تو اردو میں مثنوی مولانا روم کے کئی ترجمے کیے گئے ہیں مگر منظوم ترجمہ سب سے پہلے حضرت درد کاکوروی نے کیا۔۱۲۹۳ھ میں محمد یوسف علی شاہ نے ''پیراہن یوسفی'' کے نام سے کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی انتخابات کے ترجمے ہوئے ہیں۔ مثنوی معنوی باوجود یہ کہ علم کلام کا بہترین نمونہ ہے جہاں اخلاقیات کو حکایات کی شکل میں بیان کیا ہے۔ سیماب نے اپنی ذہانت وفطانت اور عروض وزبان پر قدرت کی وجہ سے اس مشکل پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اسی لیے سیماب نے لفظی ترجمے میں ایسے الفاظ تلاش کیے ہیں جو فارسی کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ صحت مضمون کے ساتھ ادا کرسکیں مثلاً وہ آگے اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

مرد غرقہ گشتہ جانے می کند دست را در ہر گیاہے می زند

تا کدامیں دست گیرد در خطر   دست و پائے می زند از سبزہ سر
دوست دارد دوست ایں آشفتگی   کوششِ بے ہودہ بہ از خفتگی

جب کہ قاضی سجاد حسین نے منثور اور مولانا راسخ نے جو منظوم ترجمہ کیے سیماب کا ترجمہ ان دونوں ترجموں سے بہتر ہے:

جیسے کوئی ڈوبتا جی چھوڑ کر   مارتا ہو ہاتھ ہردم گھاس پر
ہاتھ اس خطرے میں کوئی تھام لے   مارتا ہے دست و پا اس خوف سے
ہے پسند دوست یہ آشفتگی   کوشش بے کار سونے سے بھلی

سیمابؔ

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ڈوبنے والا جان توڑتا ہے ہر تنکے پر ہاتھ مارتا ہے تا کہ خطرے میں اس کی کوئی دست گیری کرے سر کے ڈر سے ہاتھ پیر مارتا ہے اس پریشان حالی کو دوست پسند کرتا ہے سونے سے لاحاصل کوشش بہتر ہے۔

مولانا راسخ نے اسی حصہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

ڈوبنے کی ہے یہ حالت سربسر   ڈالتا ہے ہاتھ برگ کاہ پر
تا کہ ہو اس وقت کوئی دستگیر   جاں ستاں ہے خوفِ دریائے خطیر
ہے پسند یار یہ آشفتگی   شغلِ بد سے بھی بری ہے خفتگی

سیماب نے ترجمہ کرتے وقت لفظی ترجمہ کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ مثلاً وہ ''جانے می کند'' کا ترجمہ ''جی چھوڑ کر'' کرتے ہیں، جو کہ مولانا راسخ کے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے شعر میں دست پائے میں زند کا ترجمہ بامحاورہ دست و پا مارنا کے کیا ہے۔ البتہ کتاب مرقوم میں مولانا راسخ نے اس کا ترجمہ جاستاں ہے۔ خوف دریائے خطیر ہے۔ تیسرے مصرعے میں مولانا راسخ نے کوشش بے ہودہ کو شغلِ بد بتلایا ہے، جب کہ سیماب

نے اسے کوشش بے کار کہا ہے۔ بہرحال آگے بھی سیماب اور راسخ کے ترجمہ میں کچھ اس طرح کا فرق ملتا ہے۔ مولانا قاضی سجاد اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں: سونے سے لاحاصل کوشش بہتر ہے۔

مثنوی مولانا روم کا ترجمہ ''پیراہن یوسفی'' کے نام سے مولانا یوسف علی شاہ نے کیا۔ ان کے ترجمے میں روانی اور برجستگی اس قدر تھی کہ خود سیماب کو بھی شروع شروع میں ان سے توارد پیدا ہو گیا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا یوسف کا ترجمہ سیماب کے پیش نظر رہا ہوگا اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں سیماب کے کیے ہوئے کچھ ترجموں کا مولانا یوسف کے منظوم اور قاضی صاحب کے منثور ترجمے کا موازنہ کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ خاص طور سے اس منظوم ترجمے میں سیماب کی عظمت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔ ''الہام منظوم'' کے پہلے دفتر سے درج ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مولانا یوسف ''پیراہن یوسف'' میں اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے   مرد و زن روتے ہیں میرے شور سے

ظاہر ہے اس شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو مولانا یوسف علی شاہ کا ہے۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اسی دفتر سے رومی کے اس شعر:

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

کا ترجمہ یوسف صاحب نے اس طرح کیا ہے:

پارہ پارہ کردے سینے کو فراق
تب کہوں میں شرح دردِ اشتیاق

سیماب اس کو غالباً توارد کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

پارہ پارہ کردے سینہ جب فراق
تب کہیں ہو شرح دردِ اشتیاق

پھر رومی کے ایک اور شعر:

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم

کا ترجمہ مولانا یوسف اس طرح کرتے:

میں ہر اک مجلس میں جانالاں ہوئی
نیک بختوں اور بدوں سے میں ملی
میں ہر اک مجلس میں فریادی ہوئی
غمزدوں اور خوش دلوں کے منہ لگی

سیماب کے یہاں دوسرا مصرع بلند ہے جبکہ سیماب نے یہاں منہ لگنا کہہ کر بانسری کی رعایت کو بھی ملوظ نظر رکھا ہے۔ اسی لیے ان کا دوسرا مصرع زیادہ پرزور ہو گیا ہے۔

یوسف صاحب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

آگ ہے آواز نائی، نے نوا آگ یہ جس میں نہ ہو وہ ہو فنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب نے یہاں بھی دوسرا مصرع پورا یوسف صاحب کا لے لیا ہے:

آگ ہے آواز نے، کب ہے ہوا آگ یہ جس میں نہ ہو وہ ہو فنا

پھر رومی کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا
بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

مولانا یوسف اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ہم زباں سے جو ہوا اپنے جدا
لاکھ ساماں رکھے پر ہے بے نوا

سیماب بھی پہلا مصرع بالکل وہی پیش کرتے ہیں جو مولانا یوسف نے پیش کیا ہے۔مثلاً

ہم زباں سے جو ہوا اپنے جدا
صدا نوا ہو کر بھی ہے وہ بے نوا

سیماب نے یہاں دوسرے مصرعے میں نوا اور بے نوا کے تضاد سے بڑی لطافت پیدا کردی ہے۔ بہرحال ترجمہ میں بامحاورہ، سلیس اور دلکش زبان ہے جو ان کے دوسرے دفتروں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔جلد سوم میں ایک جگہ وہ اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

آں یکے اللہ می گفتے شبے تا کہ شریں گردد از ذکرش لبے
گفت شیطانش خمش ای سخت رو چند گوئی آخر اے بسیار گو
ایں ہمہ اللہ گفتی اے عتو خود یکے اللہ را لبیک گو
(۱۳)

سیماب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

رات کو اللہ کہتا تھا کوئی ذکر سے تا ہونٹ پائیں چاشنی
بولا شیطان اس سے اے مردِ خدا کب تک اللہ اللہ بولے جائے گا
اللہ اللہ تو نے اے سرکش کہا اس سے کب لبیک کی آئی صدا

مولانا قاضی سجاد نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

ایک شخص رات کو اللہ اللہ کہتا تھا یہاں تک کہ ذکر سے اس کے ہونٹ میٹھے ہوئے تھے شیطان نے اس سے کہا اے سخت جاں چپ اے بت بنے آخر کب تک کہے گا یہ سب تو غرور سے اللہ اللہ کہتا ہے اللہ کی جانب سے ایک بھی لبیک کہا ہے۔ (۱۴)

مسجد جامع چلا اک شہریار مارتے جاتے تھے سب کو چوبدار
سرکسی کا توراتے تھے چوب زن پھاڑتا کوئی کسی کا پیرہن

ایک بے کس کے پڑیں دس لکڑیاں بے گناہ تھا بولے جاتا ہے کہاں
(سیمابؔ)

مندرجہ بالا مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیماب نے ردیف وقافیہ اور عروض کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنے ترجمے میں مفہوم کی وضاحت اور زبان کی سلاست کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ اس سے سیماب کے منظوم ترجمے کی زبان وبیان، الفاظ پر قدرت اور عربی وفارسی زبان پر ان کی دسترس ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے لکھا ہے:

> ''حقیقت بھی یہی ہے کہ ترجمے کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ ہونے کے باوجود ترجمہ معلوم نہ ہو اور ترجمہ میں کوئی بات اصل کی چھوٹنے بھی نہ پائے حضرت سیماب کے لیے یقیناً یہ سہولت تھی ... تاہم انھوں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ ان کی پرگوئی اور زودگوئی کے لیے بہت بڑی دلیل ہے''۔ (۱۷)

سیماب کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان کے سامنے یوسف صاحب کے منظوم تراجم موجود تھے اور ظاہر بھی ہوتا ہے کہ موصوف نے یوسف صاحب کے تراجم سے استفادہ کیا تھا، جس کے سبب بعض جگہ توارد یا مشابہت کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے اور یہ بہرحال یقینی ہے کہ ترجمہ کے وقت یہ تراجم ان کے پیش نظر تھے۔ لہٰذا سیماب کو بہتر ترجمہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس لیے ان کا جوہر اور زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔ وہ خوبیاں یا شاعرانہ حسن جو دیگر تراجم میں مفقود تھیں، سیماب کے ترجمہ کا حصہ بن گئیں۔ اچھے منظوم ترجمے کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ متن کا ترجمہ اپنے اصل سے قریب ہونے کے ساتھ شعریت، تاثیر، ترنم اور نغمگی سے بھی مزین ہو، جس کے لیے شاعر کے اندر زبان اور تخیل کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ شاعر مختلف رعایتوں کا استعمال کرتا ہے۔ لفظوں کا مناسب اور برمحل استعمال، تراکیب میں انوکھا پن

اور صوری و معنوی حسن پیدا کرنے کی خاطر صنعتوں کا استعمال کرتا ہے۔ سیماب استاد شاعر تھے اور ان کی زبان ان تمام خوبیوں سے آراستہ تھی۔ لہٰذا ان کے ترجمے میں بلا کی تاثیر اور خوبصورتی پیدا ہوگئی اور اس خاص شاعرانہ کیفیت کا بھرپور اثر ترجمہ میں نظر آتا ہے جن کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ کسی بھی متن کے ترجمہ میں اس وقت تک بے ساختگی اور فطری حسن نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ ترجمہ نگار کی ذہنی اور قلبی کیفیت متن یا تخلیق کار کے اس کارنمایاں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ سیماب اکبرآبادی کے یہاں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان میں یہ بھی خوبی تھی کہ وہ فارسی زبان کے تمام اسرار و رموز سے واقف تھے اور تصوف سے بھی ان کو خاص ربط تھا۔ ان کی پوری شخصیت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے اور بلا شبہ ترجمہ کرتے وقت ان کے ذہن و دل اس عظیم تخلیق میں پوری طرح محو نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منظوم ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہ جاتا بلکہ خود ایک شاہکار تخلیق کے روپ میں ڈھل جاتا ہے، جس میں بلا کی شعریت، معنویت اور کشش نظر آتی ہے اور یہی باتیں سیماب کے ترجمے کو دیگر تراجم کے مقابلے ممتاز بناتی ہیں۔

(ج) دیگر اصناف سخن

اردو کی شعری اصناف میں رباعی ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مشکل صنف شاعری ہے اور اس کی مشکلات کا اعتراف اس صنف کو برتنے والے متعدد باکمال شاعروں نے کیا ہے۔ دراصل ہر صنف کے اپنے شعری تقاضے، آداب اور پابندیاں ہوتی ہیں اور اس کی مخصوص ہیئتی اور جمالیاتی صورت ہوتی ہے۔ ان آداب اور پابندیوں سے عہدہ برآ ہوکر ہی کوئی شاعر اس صنف میں ارتقائی مراحل طے کر کے کمال کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ تخلیق شعر کی یہ پابندیاں جہاں کسی صنف سخن کی ہیئتی اور جمالیاتی صورت کی حفاظت کرتی ہیں، وہیں دوسری جانب شاعر کے جذباتی اور فکری ردعمل کی پیشکش میں رکاوٹ بھی بنتی ہیں۔ لیکن ایسا شاعر جو فکر رسا رکھتا ہو، زبان پر اسے ایسی ہی قدرت ہو کہ لفظوں سے کھیلے، لفظ اس کی فوج

میں شامل ہو جائیں اور تخلیقی وفور اس میں بدرجۂ اتم موجود ہو، تو وہ فن کی ان حدود کو نہ صرف بآسانی عبور کر جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ انھیں توڑ کر اور وسعت بھی دے دیتا ہے۔

رباعی میں چونکہ اشعار کی تعداد اور بحر متعین ہوتی ہے اس لیے شاعر کو دوسری اصناف کے مقابلے میں اس صنف میں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ رباعی صرف چار مصرعوں یعنی دو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور شاعر کو اپنی فکر یا خیال کو پوری طرح انہی چار مصرعوں میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس پر یہ بھی شرط ہے کہ تیسرا مصرع پر زور ہو، یعنی یہ قاری کے خیال اور جذبہ آہنگ کو ارتقائی سطح پر پہنچا دے اور چوتھے مصرعے میں اس بنیادی خیال، فکر اور جذبہ کو نمایاں کیا جائے جو شاعر کا مقصد ہے۔ ان قیود کی روشنی میں رباعی پر غور کریں تو اس کے پہلے دو مصرعے شاعر کے خیال یا فکر کی فضا پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مصرعے بنیادی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کسی شاعر کے لیے اس صنف پر عبور حاصل کر پانا تبھی ممکن ہے جب وہ اس فن کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو، اس کی نظر وسیع اور مشاہدہ عمیق ہو۔ اس کے علاوہ وہ زبان کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو اور اس کے تخلیقی استعمال پر قدرت رکھتا ہو تا کہ پوری قوت کے ساتھ وہ اپنا شعری اظہار کر سکے۔ جن شعرا نے رباعی میں طبع آزمائی کی ہے اور اچھا شاعر بن کر اپنی رباعیات کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں ان میں سے اکثر نے اس کے مشکل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ فارسی رباعی کے مشہور و مقتدر شاعر حکیم خیام نیشاپوری نے لکھا ہے:

> ''رباعی مشکل ترین اقسام شعر است، زیرا مشروط قیود کہ برائے آں نفر رشدہ بایں کہ چوں دو بیت بیشتر نیست۔ مجال سخن درآں تنگ است''۔ (۱۸)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیام جیسا باکمال اور زبردست شاعر جس نے فارسی

ادب میں صنف رباعی کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی اور جس سے اردو رباعی بھی ہمیشہ مستفید ہوتی رہی ہے، وہ اسے شاعری کی مشکل ترین اصناف میں شمار کرتا ہے اور اس کے اسباب میں بھی وہ مذکورہ بالا چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔

رباعی کے فنی تقاضوں اور اس کی مشکلات کے حوالے سے ''رباعیات محروم'' کے دیباچے میں جوش ملیح آبادی نے بھی چند باتیں کہیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنف پر قابو پانا شاعر کے لیے آسان نہیں۔ تجربے اور مشاہدے کی ایک طویل عمر گزارنے کے بعد ہی اس میں یہ اہلیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رباعی میں اپنے احساسات و خیالات کو بخوبی پیش کر سکے۔ ان کا بیان ہے:

> ''رباعی کا کہنا بڑا مشکل ہے۔ یہ وہ کم بخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی ہے جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس و مفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہیں''۔ (۱۹)

خود تلوک چند محروم رباعی لکھنے کے لیے مشق و مہارت اور پختگی عمر کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ امداد امام اثر نے رباعی کہنے کی دقتوں اور اس کے فنی مباحث پر گفتگو سے زیادہ اس کے موضوع پر کلام کیا ہے۔ اچھی اور کامیاب رباعی کے سلسلے میں وہ یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اس میں مضامین کی نوعیت حکیمانہ ہو یعنی ایسے مضامین جس میں شاعر نے کوئی اخلاقی یا مذہبی پہلو کو نظم کیا ہو یا پھر اس کے ذریعہ وہ کسی معاشرتی اور تمدنی مسئلہ کی جانب لوگوں کو متوجہ کرے۔ لیکن اگر شاعر کا رجحان ''پست مضامین'' کی طرف ہو تو اس کی رباعی میں تاثیر پیدا نہیں ہوگی۔ امداد امام اثر نے ''پست مضامین'' کی وضاحت اور نشاندہی نہیں کی ہے۔ البتہ ان کے اس قول میں حالی اور آزاد کے اصلاحی خیالات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعی گوشعرا کی تعداد بہت کم ہے۔اس صنف سخن کے مقابلے میں دیگر اصناف شعری مثلاً مثنوی، غزل، قصیدہ وغیرہ کا جائزہ لیں تو واضح طور پر ان میں شعرا کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ یہ صورت حال بھی رباعی کے مشکل صنف سخن ہونے کی ایک دلیل سمجھی جاسکتی ہے۔اردو رباعی کے سلسلے میں برج موہن دتا تریہ کیفی کا یہ خیال بہت معنی خیز ہے کہ:

''رباعی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔اسی وجہ سے عموماً اس کی طرف کم توجہ ہوتی ہے''۔ (۲۰)

اردو میں ایسے شاعر بہت کم گزرے ہیں جنھوں نے محض رباعی کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں امجد حیدرآبادی کا نام یقیناً لیا جاسکتا ہے، جنھوں نے صرف رباعیاں ہی کہی ہیں۔اردو کے جن دیگر شعرا کے یہاں رباعیات کے نمونے ملتے ہیں وہ بنیادی طور پر غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور نظم جیسی اصناف کے شاعر ہیں اور رباعیاں ان کی تخلیقی کاوشوں میں ثانوی درجہ رکھتی ہے۔فارسی رباعی کو جو ترقی ملی وہ اردو رباعی کو نصیب نہ ہوسکی۔ دراصل فارسی زبان میں شروع سے ہی اس کا رواج رہا ہے۔اسے دوبیتی بھی کہا جاتا تھا۔اس میں بڑے بڑے صوفیا اور درویشوں نے خوب خوب حصہ لیا۔ دیگر شعرا نے ثانوی صنف کی حیثیت سے اس میں اپنے فن کے جواہر پارے چھوڑے ہیں۔ چنانچہ صوفیا نے مذہب، تصوف پر اس صنف میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔اخلاق وفلسفہ کے مضامین کے تحت اس صنف میں اپنے فاضلانہ افکار پیش کیے اور اس صنف کو مالا مال کیا۔اردو زبان وادب کی عمر بھی کم ہے اس لیے بظاہر فارسی ادبیات سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔یہی حال رباعی کا بھی ہے۔یعنی عمر کے تناسب سے اس کی رباعیات بھی بہت کم ہیں۔

جدید شاعروں میں سیماب اکبرآبادی اپنی سیاسی وفکری شاعری میں انفرادی حیثیت

رکھتے ہیں۔شعروشاعری سے ان کو فطری شغف تھا جس کی دلیل ان کی بسیار گوئی ہے۔رباعی کو اردو میں ابھی وہ مرتبہ اور مقبولیت نہیں ملی تھی جو فارسی شعروادب میں اسے حاصل تھی۔اس پس منظر میں دیکھیں تو سیماب اکبرآبادی کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' اردو رباعیات کے ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔اس میں انھوں نے عصری زندگی کی ژولیدگیوں، ملکی وعالمی سیاسی مسائل کی پیشکش پر خصوصی توجہ کی ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے کلام کے مطالعہ کی طرف نظم گو کی حیثیت سے اگرچہ بعض ناقدین نے توجہ صرف کی ہے لیکن ان کی رباعیات کے حوالے سے کوئی قابل توجہ کام سامنے نہیں آیا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بسیار کلامی نے فنی لحاظ سے ان رباعیات کو کمزور کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان رباعیوں کا ایک خاص تاریخی اور سیاسی پس منظر بھی ہے اور ان کی معنویت انھیں حوالے سے قائم ہوتی ہے۔سیماب کی رباعیاں تاریخ کے ایک خاص حصہ یعنی دوسری عالمگیر جنگ کے حالات پر فوری ردعمل کی حیثیت رکھتی ہیں اور شاید اسی لیے ان میں فنی حسن کم سے کمتر ہے۔

سیماب نے اپنی رباعیوں میں مذہب، سیاست، جمہوریت، جنگ کی صورتِ حال، وطن پرستی، ہندوستان پر غیروں کے ظلم وجبر، مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں، ملکی اختلافات، سبھی پر اظہار خیال کیا ہے۔خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے سبب جس طرح کا انتشار، بدامنی اور غیر محفوظ زندگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ ان کی رباعیات میں بہت نمایاں ہے۔

سیماب کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔اس مجموعہ میں انھوں نے اواخر مئی ۱۹۴۰ سے اواخر دسمبر ۱۹۴۳ تک کے سارے حالات بالترتیب قلم بند کیے ہیں۔اس مجموعہ میں انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے وقت کے سیاسی حالات پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔یہ رباعیات اس وقت کی زندگی کی ایک مبسوط دستاویز بھی کہی جاسکتی

ہیں۔ سیماب دنیا کے اس انقلابی دور کا پورا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ خاص طور سے سیاسی صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس دور میں نہ تو امکان نشاط زندگی ہے اور نہ ہی ایسے پرخطر دور میں جمہوریت کا ارتقا ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود انھیں اس انقلاب سے صالح امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کی رباعیات کے مجموعہ ''عالم آشوب'' کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جنگ کے ہر پہلو اور ہر ہر موڑ پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ سیماب کی رباعیوں کے سلسلے میں مخمور اکبر آبادی لکھتے ہیں:

> ''سیماب صاحب کی رباعیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے فلسفے کے بجائے سیاست حاضرہ کو موضوع بنایا۔ جوش کی رباعیوں میں مذہب اور سماج پر طنز ہے تو سیماب نے اس پیکر میں حوادث کے دوش بدوش اکثر کرداروں کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ یہ ایک خوش آئند انحراف اور ایک مفید اضافہ ہے۔ سیماب کی رباعیات بلندئ فکر اور عمیق نظری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ماہ بہ ماہ ترتیب کے التزام سے اس مجموعہ میں ایک تاریخی تسلسل بھی پیدا ہو گیا ہے''۔ (۲۱)

یوروپ میں دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جس طرح انسانیت کا قتل ہوا اور انسانیت کو پامال کیا گیا اس پر سیماب کی حساس طبیعت بے چین ہو اٹھی۔ چنانچہ ان کی رباعیات کے مجموعے میں تقریباً ہر تیسری یا چوتھی رباعی اس صورت حال کے خلاف شاعر کا ردعمل پیش کرتی ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

دنیا کا یہ دور انقلاباتی ہے ہر چیز فنا ہوئی چلی جاتی ہے
آتے ہیں جو مغرب سے ہوا کے جھونکے جلتے ہوئے خون کی چراند آتی ہے

لندن میں وہ دورِ ارغوانی نہ رہا　　پیرس میں وہ ذوق نغمہ خوانی نہ رہا
یورپ میں ہوئی موت کی وہ ارزانی　　امکانِ نشاطِ زندگانی نہ رہا
دنیا کا یہ انتشار توبہ توبہ!　　انسان کی گیر و دار توبہ توبہ
یہ چاندنی رات اور یہ بمباری　　ہنگامۂ نور و نار توبہ توبہ

ان تینوں رباعیوں میں انسانی زندگی کی پامالی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ یقیناً دردناک ہے۔ محض سیاسی بالادستی کے لیے کروڑوں معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک طرف فطرت کا حسن ہے تو دوسری طرف انسان اور انسانیت کی تباہ کاریاں۔

پہلی رباعی میں سیماب دنیا کے اس انقلابی دور پر طنز کرتے ہیں جس میں انسان تعمیر وترقی کی منزلوں کی طرف بڑھنے کے بجائے تباہی اور فنا کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ خصوصاً مغربی زندگی میں انسانی زوال کا یہ عالم ہے کہ مغرب کی ہوا کے ہر جھونکے میں صرف جلتی ہوئی لاشوں کی بدبو محسوس ہوتی ہے۔ دوسری رباعی میں لندن اور پیرس کی پر کیف اور حسین زندگی کے تناظر میں زوال آمادہ یوروپ کی عصری زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری رباعی میں دنیا کی منتشر اور تباہ ہوتی زندگی، انسانوں کی دارو گیر کی صورت حال نمایاں ہوئی ہے۔ انسانی تباہی کی سب سے خوفناک تاریخ ہٹلر نے لکھی۔ نسلی بنیادوں پر اس نے نہ صرف غیر جرمن پر ظلم وستم کیا بلکہ یہودیوں کی ایک بڑی آبادی کو اس نے گیس چیمبر میں ڈال کر ہلاک کروایا۔ ہٹلر کے اس عمل سے دنیا پریشان ہو اٹھی اور حساس طبیعتیں اس غیر انسانی فعل کو برداشت نہیں کرسکیں۔ اس کی خودسری نے ساری دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ سیماب ہٹلر کی سفاکی کے پس منظر میں انسانی قدروں کو ترقی دینے کی بات کرتے ہیں تاکہ آئندہ ہٹلر جیسی شخصیت پیدا نہ ہو سکے۔

تہذیب و سکوں کا ہو وہ منظر پیدا　　انساں دل انساں میں کرے گھر پیدا
کردو انسانیت کو اس درجہ بلند　　پھر ہو نہ سکے جہاں میں ہٹلر پیدا

سیماب اپنے مخاطبین سے محبت، یگانگت، ہمدردی، غمخواری اور تہذیب وسکون کی وہ فضا

قائم کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے لیے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہو جائے۔

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ سیماب اکبرآبادی نے دوسری عالمی جنگ کے بہت سے واقعات کو ان کے تاریخی حوالوں کے ساتھ اپنے رباعیوں میں پیش کیا ہے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ کو اٹلی کے حکمراں مسولینی نے یونان پر حملہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ جنگ بہت آسانی سے ہفتے عشرے میں جیت لے گا کیونکہ البانیہ پر وہ پہلے ہی قابض ہو چکا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ یونانی فوج کے عزم وارادے بلند ہیں اور وہ اس سے سخت مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی تو اس کے بالکل برعکس تھا۔ یونان نے اٹلی کو ایک ہفتے میں البانیہ تک واپس ڈھکیل دیا اور پھر اٹلی کی فوج تین ماہ تک خود اپنی بقا کے لیے لڑتی رہی۔

سیماب نے یونانیوں کی بہادری اور حوصلہ کی ستائش کرتے ہوئے ایک رباعی میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے:

یونانیوں میں بلا کا جوہر نکلا ہر شخص اپنی جگہ دلاور نکلا
اٹلی کو نہ راستہ ملا بڑھنے کو یونان مگر سد سکندر نکلا

اسی طرح ایک دوسرے واقعہ کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔ جب یوگوسلاویہ نے جرمنی کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس سے متاثر ہو کر سیماب نے ہٹلر جیسے انانیت پرست اور خودسر شخص کی شکست پر خوشی کا اظہار کیا اور یوگوسلاویہ کے اس عزم کو مغرب کے محکوم ممالک کو اپنی آزادی و خودمختاری کے لیے جرأت مندانہ قوم قرار دیا۔ یہ بات درج ذیل رباعی کے متن کے داخل میں پوشیدہ ہے:

اب اور فضا ہے مغربی محشر کی مٹتی جاتی ہے خودسری خودسر کی
کی یوگوسلاویہ نے طاقت نہ قبول پہلی یہ شکست فاش ہے ہٹلر کی

عالمی جنگ کے زمانے میں سیماب اکبرآبادی کی نظر محض جنگ کے حالات پر ہی مرکوز

نہیں تھی بلکہ ان کی ہمہ گیر نگاہ حالات کے دیگر پہلوؤں پر بھی رہتی تھی۔اس زوال آمادہ دور میں انھیں سیاست، مذہب، سب مجہول دکھائی دیتے ہیں۔انھیں مغرب کے حکمرانوں کی دورنگی کا بھی ادراک ہے جو ظاہرداری کے لیے امن اور صلح کی باتیں کرتے ہیں مگر واقعتاً وہ جنگ کے حامی اور غاصب ذہنیت کے حامل ہیں۔ان کا مذہب جو بظاہر انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کو منظّم کرتا ہے، اس فساد وانتشار کے عہد میں وہ بھی بے معنی ہو چکا ہے۔ان تمام پہلوؤں کو سیماب اکبرآبادی نے ایک رباعی میں پیش کردیا ہے:

یہ دور فنا زدہ گراں ہے سب پر   یکساں ہے اثر سیاست و مذہب پر
گونجی ہوئی جنگ کی ہوا ہے سر میں   اور صلح کا نام کھیلتا ہے لب پر

ان کے نزدیک سائنس کی غیر متوازن اور انسانیت سے مبرا ترقی ہی عصری جنگ اور مذہب کی بے معنویت کا بھی سبب ہے۔ذیل کی رباعی میں سیماب نے مغرب کی مذہبی زندگی اور اس دور کی ذہنیت کو یوں نظم کیا ہے ۔

سائنس کا ہر اصول مرغوب ہے آج   ذکر مذہب حدیث معیوب ہے آج
پرشور تھا مغرب میں کلیسا کا جرس   وہ بھی طبل جنگ سے مغلوب ہے آج

دوسری جنگ عظیم میں ایک محاذ پر اٹلی، جرمنی اور اس کے ہمنوا ممالک تھے تو دوسرے محاذ پر فرانس، برطانیہ، روس اور اس کے حوارئین تھے۔اٹلی اور جرمنی کے قافلے میں جاپان نظریاتی طور پر شامل ہونے والا آخری ملک تھا۔اٹلی، جرمنی اور جاپان کے اتحاد سے بننے والا گروہ Axis Group کہلاتا تھا۔ہٹلر کی پالیسی سے جاپان کے نظریات الحاق کو سیماب اکبرآبادی نے شیر اور لومڑی کی دوستی سے تعبیر کیا ہے جس میں ہمیشہ نقصان لومڑی کا ہی ہوتا ہے:

جس قوم پہ وقت ابتلا آتا ہے   اس قوم پر ادبار ہی منڈلاتا ہے
ہے لومڑی شیر کی اُلش پر نازاں   جاپان بھی جرمن سے ملا جاتا ہے

سیماب نے جنگ کے تصور سے پیدا ہونے والے احساسات اور مختلف کیفیات کو اپنی

رباعی میں پیش کیا ہے۔اس جنگ سے جغرافیائی اعتبار سے محض کچھ انسانوں کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا وجود خطرے میں نظر آرہا تھا۔جنگ کا خوف لوگوں کے اعصاب پر اس طرح سوار تھا کہ خلوت و خواب میں بھی جنگ کے مناظر ہی دکھائی دیتے تھے۔سیماب نے اس سیاق وسباق میں جو رباعیات پیش کی ہیں ان میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں جن سے جنگ کی مختلف صورتوں کا ادراک ہوتا ہے:

اس شورش بے پناہ آتی ہے نظر دنیائے سکوں تباہ آتی ہے نظر
یوں جنگ تصورات پر طاری ہے خلوت میں بھی رزم گاہ آتی ہے نظر

یہ جنگ ہے نیستی کا حلیہ خالی کردے گی جہاں کا گوشا خالی
انسان کرے گا پھر حکومت کس پر؟ انسان سے ہوگئی جو دنیا خالی

جاری وہی چنگیز مآبی ہے ہنوز موجود فضا میں شعلہ تابی ہے ہنوز
آتی نہ کمی جذبۂ خونریزی میں اے خاک ترا رنگ گلابی ہے ہنوز

سیماب اکبرآبادی کی رباعیات میں خاصا بڑا حصہ ایسی رباعیوں کا ہے جن میں عالمی سیاست کے مختلف ابواب وا ہوتے ہیں۔جرمنی، روس، جاپان، برطانیہ، چین، فرانس کی باہمی آویزشوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔سیماب کی ایسی رباعیاں نیم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

در پردہ فریب اس کے آہنگ میں ہے نیکی کا مظاہرہ نئے رنگ میں ہے
کیا صلح میں کامیاب ہوگا جاپان مصروف ابھی چین سے خود جنگ میں ہے

ہٹلر نے جو روس سے نئی ٹھانی ہے اس طرز عمل سے سب کو حیرانی ہے

باطن کو تو دانائے حقیقت سمجھے ظاہر میں یہ اک صاف نادانی ہے

———

حاصل جرمن کا مدعا ہوجاتا اب تک تو کبھی کا فیصلہ ہوجاتا
برطانیہ روس کو نہ دیتی جو مدد بے شک رشیا کا خاتمہ ہوجاتا

مغرب میں جنگ اور انتشار کی صورتِ حال کے لیے سیماب مغرب کی مادہ پرست تہذیب کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ مادی ترقی نے انسان کے عیش و آرام کے لیے بہت سے وسائل پیدا کر دیے ہیں۔ چنانچہ انسان کا انحصار آہستہ آہستہ مصنوعی چیزوں پر بڑھتا گیا۔اس کا منفی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی میں محبت تعلقات اور جذبے کی اہمیت کم سے کمتر ہوتی چلی گئی۔ ایسے معاشرے میں مکروفریب، خودغرضی بھی پیدا ہوجاتی ہے جو ہر لمحہ اپنے فائدے کے لیے دوسرے انسانوں کو تہ تیغ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ سیماب اکبرآبادی اسی لیے مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہیں کہ اس نے تعمیر و ترقی کے مفہوم کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ مثلاً:

تہذیب نوی نے آگ پھیلا دی ہے مغرب کے لیے نوید بربادی ہے
بستی کو اجاڑ کر بنانا صحرا اس دور کی یہ بھی عالم ایجادی ہے

تیسرے اور چوتھے مصرعے سے سیماب کا نئی مغربی تہذیب پر طنز ظاہر ہے۔ ایک دوسری رباعی میں وہ یوروپی زندگی کے غیر جذباتی پہلو کو بہت صاف صاف نظم کرتے ہیں ؎

یورپ میں سکون و صلح کا رنگ نہیں جذبات محبت سے ہم آہنگ نہیں
فطرت کا نظام توڑنے والوں سے فطرت کا یہ انتقام ہے، جنگ نہیں

درج بالا رباعی کے آخری شعر میں سیماب نے فطرت کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ قابل قدر ہے۔ غیر جذباتی زندگی کا فروغ مادہ پرست انسانوں نے کیا جو فطرت کے نظام کے یقیناً خلاف ہے۔ اس لیے انسان ہی نہیں ہر جاندار میں فطرت نے محبت، ہمدردی اور یگانگت کا جذبہ رکھا ہے۔ فطرت ایک حد تک اپنے نظام کے توڑنے والوں سے درگزر کرتی ہے،

مگر جب صورتِ حال انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ خود اپنا انتقام لیتی ہے۔ فطرت کے متعلق یہ باتیں وہ سائنس داں بھی کہتے ہیں جو ماحولیات اور فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنگ اور تخریب کی تصویروں سے سیماب کی حساس طبیعت جب پریشان ہو جاتی ہے اور جب وہ موجودہ صورت حال کو یکساں قائم دیکھتے ہیں تو فطرت اور خدا سے استفہام کے لہجے میں ایسے انقلاب کی گزارش کرتے ہیں جو اس منظر نامے کو تبدیل کر دے اور کبھی دوسروں کو بھی اس تصور سے تسکین قلب پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کب سطوتِ باطلہ کو زک پہنچے گی؟ کب قہر الٰہی کی کمک پہنچے گی

کیا ظلمتِ بیداد میں ہوگی نہ کمی کیا رات یہ صبح حشر تک پہنچے گی

فطرت پہ نظر خاطر آزاد رہے اس کا بھی خیال اے ستم ایجاد رہے

طوفاں کی گرج کو قولِ فیصل نہ سمجھ فطرت ابھی خاموش ہے یہ یاد رہے

پرشور رہے گی بربریت کب تک؟ انسان کو پہنچے گی اذیت کب تک

شورش کدۂ دہر میں ہے حشر بپا خاموش یوں ہی رہے گی فطرت کب تک

آخری رباعی میں سیماب فطرت کی خاموشی پر جہاں سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں وہیں اس سوال میں اس کا اثبات بھی ہے کہ فطرت زیادہ عرصہ تک خاموش نہیں رہتی۔

سیماب اکبر آبادی کی نگاہ عمیق صرف ملکی سیاست کی طرف مرکوز نہیں تھی بلکہ انھوں نے اپنی رباعیوں میں قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو بھی پیش کیا ہے کہ جب تک قوم پرست ملکی عوام کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ ہے تب تک کسی بھی قوم کا وجود دنیا سے نہیں مٹ سکتا اور وہ قوم مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکتی۔ اس ضمن میں ان کی تین رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

دبنے سے دبانے سے نہیں مٹ سکتی یا خون بہانے سے نہیں مٹ سکتی

جس قوم کو احساس ہو قومیت کا　　وہ قوم مٹانے سے نہیں مٹ سکتی

مرنا جینا، ہو ملک و ملت کے لیے　　لازم ہے یہ وصف آدمیت کے لیے
ان سب پہ مرا سلام پہنچے تاحشر　　جو لوگ فنا ہوئے محبت کے لیے

اب جنگ میں بیکار ہیں تیر اور تلوار　　ہے جذبۂ قومی ہی بڑا اک ہتھیار
جس قوم میں قومیت کا احساس نہیں　　اس قوم کا غلبہ ہے یقیناً دشوار

مذکورہ بالا رباعیات میں سیماب نے قومیت کے احساس کو اجاگر کر کے قوم کے اندر حب الوطنی کے جذبہ کو بیدار کیا ہے۔ یعنی اگر مرنا اور جینا ہو تو ملک وملت کے لیے ہونا چاہیے۔ جو لوگ اپنے ملک وملت کے لیے فنا ہوتے ہیں یا ہوئے ہیں ان پر سلام ہو۔ دراصل وہی اپنے وطن کے سرپرست اور قوم ووطن کے سچے رہبر ہیں۔ ان کے دلوں میں قومیت اور وطنیت کا پاس ہے اور یہ جذبۂ قومیت ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ہندوستان کی عظمت وبلندی اس بات میں مضمر ہے کہ کرشن اور گوتم نے حیات ابدی بھی یہیں پائی ہے اور اس کی یہی عظمت انگلینڈ کے دل میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

انگلینڈ وفا کیش اسے کہتا ہے　　رشیا بھی خوش اندیش اسے کہتا ہے
عظمت ہے مرے وطن کی سب کے دل میں　　جاپان گرودیش اسے کہتا ہے

یہ ہند جو ایشیا کی جنت ہے　　انوار بدوش مشرق عظمت ہے
ہر شام اک اندیشۂ فردا ہے یہاں　　ہر صبح اک انقلاب کی دعوت ہے

ایشیا میں سب سے مقدس سرزمین ہندوستان ہے اور یہ ایشیا کی جنت ہے۔ چونکہ یہاں کی ہر شام ایک نئے آنے والے دن کے لیے نئی سوچ وفکر کا پیغام دیتی ہے اور مشرق کی سمت

سے ہر روز نور کا اجالا ہوتا ہے اسی لیے ہمارے وطن کی ایشیا میں بہت عظمت ہے۔

سیماب نے قومیت و وطنیت کے جذبے کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف و انتشار کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے ایسے افراد کی ذہنیت پر طنز کیا ہے جو فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں اور مشکل وقت میں قوم کی بہتری کے متعلق غور و فکر کرنے کے بجائے فرقہ واریت کا زہر پھیلاتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ جن افراد کو اپنے ہمسایوں کے خون کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی ہے اور جن کو وطنی محبت کا ذرا سا بھی پاس و لحاظ نہیں ہوتا ہے وہ اپنے وطن کو کیا بچا سکتے ہیں۔ سیماب کہتے ہیں کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ہندوستان میں بھی زبردست خونریزی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ مثلاً:

لائے تو سہی رنگ، دورنگی ہی سہی　　میداں نہ سہی دلوں کی تنگی ہی سہی

آثار ہیں ہند میں بھی خون ریزی کے　　کچھ اور نہیں تو خانہ جنگی ہی سہی

غرض سیماب کے مجموعۂ رباعیات ''عالم آشوب'' میں اس دور کے عالمی سیاسی منظر نامے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات اور دوسری جنگ عظیم کے نتائج و اثرات سے متعلق بہت عمدہ رباعیاں لکھی ہیں۔ ان رباعیوں کا اردو ادب میں ایک اہم مقام ہے۔ معاصرین سیماب نے جہاں رباعیوں کے موضوعات کے فلسفے، سماج پر طنز اور پند و نصائح تک محدود رکھا وہیں سیماب نے اسے اختراعی مزاج دے کر اس میں ایک اور زندگی کے تمام موضوعات کو سمو یا ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ رباعیاں وقتی اور ہنگامی موضوع اور سپاٹ پن کے سبب دلفریبی، ادبی لطافت و چاشنی سے محروم ہیں۔ اس کے باوجود اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

سیماب کے منظوم کلام کا ایک اہم اور قابل ذکر حصہ ان کی عزائی شاعری پر مشتمل دو مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ ان کے نام ''سرود غم'' اور نفیر غم'' ہیں جو ۱۹۴۳ میں منظر عام پر آئے۔ یہ مجموعے سیماب کی انسان دوستی، مذہب پسندی، فرقہ وارانہ اور مسلکی بے تعصبی، مظلوم سے ہمدردی اور اعلیٰ وارفع انسانی اقدار کے فروغ کی کوششوں کے مظہر اور فنی واسلوبی خوبیوں کا نمونہ ہیں۔ سیماب نے اپنے نظمیہ مجموعوں نے ستاں، کار امروز اور ساز و آہنگ کی نظموں کے کثیر الجہت اور رنگا رنگ موضوعات کے علاوہ ان دو مجموعوں میں مخصوص، عظیم اور مقدس موضوع یعنی واقعۂ کربلا اور عظمت امام حسین پر اپنا پر زور و پر جوش کلام پیش کیا ہے۔ ان مجموعوں کے مندرجات سے سیماب کے حضرت امام حسین اور تمام حضرات اہل بیت سے قلبی تعلق اور عقیدت ومحبت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان میں انھوں نے عزائی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور رباعیوں پر مشتمل ان مجموعوں کا سلسلہ نظم جدید کے آغاز سے ہوتا ہوا اپنے ماضی کی طرف پہنچ کر میر انیس و مرزا دبیر تک جا ملتا ہے جنھوں نے مذکورہ اصناف شعری کو اپنے عہد کی لاجواب اور قابل قدر اصناف کا درجہ عطا کیا تھا۔

مرثیے کی روایت دنیا کی کم وبیش تمام زبانوں میں موجود ہے، لیکن فارسی اور اردو زبانوں میں اس سے ایک خاص قسم کی شاعری مراد لی جاتی ہے۔ اردو میں بطور خاص مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں واقعات کربلا کے تحت حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی یزیدی فوج سے جنگ اور بالآخر شہادت اور ان کے دردو غم کے احوال بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اردو میں شخصی مرثیوں کی روایت بھی موجود ہے۔ چنانچہ اردو کے متعدد شعرا نے جن میں حالی اور اقبال بھی شامل ہیں شخصی مرثیے لکھے۔ مثلاً مرثیہ غالب اور مرثیہ داغ وغیرہ اور انھیں شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

اردو میں مرثیہ نگاری نے ادب کے افق کو بہت بلند اور وسیع کیا۔ اس کے سبب جہاں

شاعری میں موضوعات کا اضافہ ہوا اور فکر میں ترفع پیدا ہوا، وہیں ادب میں فنی وسعت بھی پیدا ہوئی۔ اس میں رزمیہ اور المیہ عناصر کی شمولیت کے ساتھ منظرنگاری اور جذبات نگاری کے نہایت اعلیٰ نمونے داخل ہوئے۔ منظرنگاری مرثیہ کا بہت نمایاں جوہر ہے۔ صبح کے حسین مناظر، دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ، جنگ کا دردناک نظارہ، شام کا المناک منظر، گھوڑے اور تلوار کی جزئیات پر مبنی صفات، حضرت حسینؑ اور ان کے رفقا کی دلیرانہ شجاعت، ان کی شہادت کی جزئیات، شہادت کے بعد اہل بیت کی کیفیت، یہ اور اس کی طرح کے لاتعداد مناظر کی جزئیات نگاری کے ساتھ تصویرکشی اور دیگر فکری و فنی حسن کی آمیزش نے مرثیے کو ادب عالیہ میں شامل کر دیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، ۱۸۵۷ کے انقلاب کے بعد اردو ادب کی مختلف اصناف میں نئے نئے تجربات کیے گئے دیگر اصناف ادب کی طرح مرثیے نے بھی نیا رنگ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں سیماب اکبرآبادی نے بھی متعدد مرثیے، سلام اور رباعیاں لکھیں اور مرثیوں کو نئی شکل بھی عطا کی۔ انھوں نے مرثیوں کے توسط سے حضرت امام حسینؑ اور تمام اہل بیت سے بھرپور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے غم حسین میں جذباتی شرکت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سودا کی طرح سیماب نے بھی مرثیہ کی فنی حیثیت برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے مرثیوں کو محض غم والم کے اظہار اور رونے رلانے کا وسیلہ بنانے کے بجائے حضرت امام حسین کی اتباع کرتے ہوئے اس صنف کے ذریعہ حق پرستی، جرأت، مردانگی اور سرفروشانہ زندگی کے پیغام کو پیش کیا اور حضرت امام کے اوصاف حمیدہ و خصائل پاکیزہ کے بیان سے اصلاح اخلاق کا سبق دیا۔ چنانچہ ''پیغام بزبان شہید'' میں سیماب نے یہ پُرزور و پُرجوش اشعار کہے:

ہے کوئی جس نے یہ درس حریت ہم سے لیا؟
ہے کوئی جس نے یہ ذوق معرفت ہم سے لیا؟

ہے کوئی جس نے ریاوکبر کی تردید کی؟
ہے کوئی جس نے ہمارے کام کی تجدید کی؟
جادۂ صبر و رضا میں ہم نے کی پیغمبری
ہے کوئی جس نے ہماری کی حقیقی پیروی؟
ہے کوئی اتنا غیور و باحمیت ہے کوئی؟
جیتے جی واپس خدا کو جس نے کردی زندگی
ہے کوئی قاتل کو دی ہو جس نے خود بڑھ کر صدا؟
ہے کوئی جو کٹ گیا لیکن نہ سجدے سے اٹھا؟

سیماب نے اپنے مرثیوں میں حضرت امام حسینؑ کی شخصیت اور ان کے کردار کو بہت نمایاں شکل میں پیش کیا ہے اور ان کی زندگی سے پیغام اخذ کر کے مسلمانوں کو انھیں اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے:

ایثار و تحمل و قناعت سیکھو
صبر و تسلیم اور شجاعت سیکھو
سیرت سے حسینؑ ابن علیؑ کی لوگو!
جوش اور اولوالعزمی وجرأت سیکھو

ایک اور مقام پر انھوں نے مسلمانوں کو براہ راست مخاطب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تمہارے اندر حسین کے بازوؤں کی قوت ہے تو پھر مخالف سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر تمہارے اندر اتباع حریت کی صفت نہیں پائی جاتی اور حسینؑ کی خو بو نہیں تو پھر پیروِی اسلام کے باطل دعوے چہ معنی دارد؟ یا تو حسینؑ کی ہمت وجرأت اختیار کرو اور باطل کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ یا پھر جھوٹا دعوی اسلام چھوڑ دو:

اے مسلماں جب ہے تجھ میں زور بازوئے حسینؑ
پھر مخالف کی تنومندی سے کیوں ڈرتا ہے تو؟
اور اگر تقلید حریت نہیں تیرا شعار!!
پھر یہ باطل دعویِ اسلام کیوں کرتا ہے تو؟

سیماب نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ مسلمانوں کو حوصلہ مندی کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ مسلمان چونکہ رسول ہاشمی سے تعلق رکھتے ہیں اور رسول اللہؐ نہایت جری اور بہادر تھے اس لیے ان کی قوم کے افراد کو بھی اس سے وابستہ ہونا چاہیے اور جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ حضرت حسینؑ نے بے کسی اور بے طاقتی کی حالت میں بھی جرأت کا مظاہرہ کیا اور جبر کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ شاعر مسلمانوں سے بھی اسی رویے کا مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہے:

حوصلہ رکھو رسولؐ ہاشمی کی قوم ہو!
کام لو غربت میں ہمت سے، جری کی قوم ہو
بے کسی میں جڑ ہلا دی جس نے استبداد کی
تم اسی بے کس حسین ابن علی کی قوم ہو

سیماب اکبر آبادی حضرت حسینؑ کی شہادت کو ایک درس کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس میں اہل بصیرت اور اہل فکر کے لیے نصیحت کے پہلو ہیں۔ ان کے نزدیک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی سینہ کوبی اور صرف رونے اور رلانے کے لیے نہیں ہے۔ مسلمان کو غیر ضروری سینہ زنی کے بجائے روزانہ قرآن پاک پڑھ کر حضرت امام کو ثواب پہنچانا چاہیے۔ اس طرح سیماب نے اصلاحی رویہ بھی اختیار کیا ہے اور لوگوں کو صحیح روش اختیار کرنے کی تلقین کی ہے:

رو رو کے داستانِ شہادت نہ کر بیاں　　خاموش نوحہ خواں
برپا عزا کدے میں ہوا شور الاماں　　خاموش نوحہ خواں
دل میں غم حسین علیہ السلام کر　　خوشیاں حرام کر

قرآن پڑھ کے روز تو پہنچا انھیں ثواب خاموش نوحہ خواں
سینہ زنی ہے شیوۂ اسلام سے بعید ہرگز نہیں سعید
مقبول بارگاہ نہیں سینہ کوبیاں خاموش نوحہ خواں

گذشتہ اوراق میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لیا جاچکا ہے کہ نظم کی ہیئت میں نت نئے تجربات کرنے میں سیماب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ سیماب کی عزائی شاعری بھی ان ہیئتی تجربات اور اعلیٰ فنی محاسن سے معمور ہے۔ منقولہ بالا اشعار سے ان کے ہیئتی تجربے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ سیماب کا کہنا ہے کہ عرصۂ دراز سے اسلام پر جمود طاری ہے اور مسلمانوں کی حالت پریشان کن ہے۔ ان غم انگیز حالات کے پس منظر میں شاعر کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر کوئی حسینؓ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟

وہ جو کہتے ہیں شہادت ہر زمانے میں ہے عام
''جذبۂ صادق'' سے ہوسکتا ہے اس کا انصرام
پوچھتا ہوں اُن سے تیرہ سو برس سے آج تک
کیوں نہ انسان نے لیا اس جذبۂ صادق سے کام
کیوں خدا کی راہ میں دیتے نہیں یہ اپنی جاں
آج بھی لاکھوں مجاہد ہیں کروڑوں ہیں امام
روح ہے اسلام کی، مدت سے مرجھائی ہوئی
جوش میں آتا نہیں کیوں ان کا خون لالہ فام
ہر طرف اسلام پر طاری ہے اک گونہ جمود
سرفروشانہ یہ کیوں کرتے نہیں کچھ انتظام

ان سوالوں کے بعد پھر شاعر خود ہی جواب دیتا ہے:

سب زبانی ہیں یہ باتیں بے حقیقت بے دلیل
منصب ابن علیؓ کا ہوچکا ہے اختتام

شہادت امام حسینؓ کے حوالے سے مسلمانوں میں جو سینہ کوبی اور دیگر غیر ضروری اور غیر متعلق چیزیں شامل ہوگئی تھیں، سیماب نے انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا اور ردعمل کے طور پر خود بھی ملامت کے شکار ہوئے۔ مثلاً ماہ محرم کی عزاداریوں اور ماتمی جلسے اور جلوسوں میں جہاں خالص سوگوار ماحول ہوتا ہے، بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں انھیں انحرافات اور رویوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سیماب نے ان کی اصلاح کی کوشش کی ہے تاکہ اس عظیم یادگار کا تقدس و پاکیزگی برقرار رہے:

یہ رنگیلے پیرہن، آنکھیں نشیلی، ہونٹ لال
پان کلّے میں جبیں پر مغربی فیشن کے بال
عورتوں کی بھیڑ مردوں کا ہجوم و اژدہام
یہ محرم کا مہینہ عید کی سی دھوم دھام!
یہ فریبِ نفس جھوٹا بانکپن بازار میں
گھر میں فاقہ دعوتِ کام و دہن بازار میں
یہ زیارت کے بہانے یہ نظارہ بازیاں
قومیت سازی کے پردے میں زمانہ سازیاں

سطور بالا میں سیماب کے مراثی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے ذہنی وفکری رویوں اور پختہ اور ترقی یافتہ ادبی وفنی شعور کے تحت انھوں نے اپنے مرثیوں میں جدت پیدا کرنے اور انھیں نیا رنگ وآہنگ عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیماب نے ان دونوں مجموعوں میں متعدد سلام بھی شامل کیے ہیں۔ دراصل سلام بھی اردو کی ایک صنف سخن ہے جو عزائی شاعری میں شامل ہے۔ اس کی ہیئت غزل کے مماثل ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر الگ الگ مضمون کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح سلام میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غزل کی طرح سلام میں بھی مسلسل واقعات کو قطعات کی شکل میں نظم

کیا جاتا ہے۔سلام کے مضامین شہدائے کربلا کے غم انگیز واقعات سے اخذ کیے جاتے ہیں اور اس میں دردوغم کے مضامین کے پہلو بہ پہلو پندوموعظت ،صبروتوکل،ایثاروقناعت اور مذہب واخلاق کے مضامین بھی شامل کیے جاتے ہیں۔لیکن جو چیز اس کوغزل کی صنف سے الگ کرتی ہے وہ اس کی تمکنت ووقاراور جزالت ومتانت ہے۔

اردو میں مرثیہ کی طرح سلام کو بھی میرانیس ومرزادبیر نے ترقی کی بلندیوں تک پہنچایا۔ اس میں انھوں نے اپنے مذہبی معتقدات اور فلسفۂ حیات کو پیش کیا۔بعد کے بعض شعرا نے بھی اگرچہ اس جانب توجہ کی،لیکن وہ اسے مزید فروغ دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ کام سیماب نے بہت عمدگی سے انجام دیا ہے۔

ان کے مجموعوں ''سرودِغم'' اور'' نفیرِغم''میں بھی سلام شامل ہیں جن کی تعداد چوبیس ہے۔ سیماب کے سلام بھی ان کے مرثیوں کی طرح جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ اورنئی طرز وانداز کے ہیں۔انھوں نے بلندی تخیل اور ندرت اسلوب کے سہارے ان میں انفرادیت اور توانائی پیدا کی ہے:

ایک دور سلامی دنیا کا صدیوں میں ایسا آتا ہے
جب کوئی پیمبر اٹھتا ہے یا کوئی شہادت پاتا ہے
جب نوحہ کعبے والوں کا رو رو کر کوئی سناتا ہے
سینہ میں روح لرزتی ہے جینے سے جی گھبراتا ہے
تسلیم ورضا کی منزل میں ہر گام پہ لاکھوں خطرے ہیں
دریا سے آگ ابلتی ہے بادل شعلے برساتا ہے
ہے زندگی جاوید کہاں یہ زندگی اس کو ملتی ہے
جنگل کی تپتی ریتی پر جو اپنا خون بہاتا ہے

نزدیک قیامت آ پہنچی کیا صبح شہادت آ پہنچی
اے صبح کے تارے کچھ تو بتا کیوں پھیکا پڑتا جاتا ہے

زمین کربلا ہے لالہ خیز وخوں فشاں اب تک
ہیں اک افسانۂ خونیں کی باقی سرخیاں اب تک
وہی ظلم اور مظلومیت سیماب کیا کہیے
کسی کا منتظر ہے، انقلابِ آسماں اب تک

سیماب اکبرآبادی نے سلاموں میں اہل بیت سے گہری عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے اور حضرت امام حسینؑ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شہادت کے فلسفے کو بہت بلندی تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ سیماب کے نزدیک حضرت حسینؑ کی شہادت، حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تعبیر ہے۔ حضرت اسماعیلؑ گو ذبح نہیں ہوئے مگر حضرت ابراہیمؑ نے جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا اور حضرت امام حسینؑ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے:

بالیقیں سیمابؔ یہ ذبح عظیم   خواب ابراہیمؑ کی تعبیر ہے

اس کے بعد شاعر پورے واقعہ، اس کے محرکات ونتائج کے سلسلے میں مکالماتی واستفہامیہ انداز اختیار کرتا ہے اور تخریب کے ذریعہ تعمیر نو کی بات کرتا ہے۔ اہل کربلا کی دردناک شہادت بظاہر تخریب ہی ہے، لیکن تعمیر نو کے لیے تخریب کی ضرورت پیش آتی ہی ہے۔ اہل کربلا نے اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دے کر دنیا کی نئے سرے سے تعمیر کی راہ ہموار کی۔ یہ ایک ایسی مشیت الٰہی تھی جس کا حقیقی علم اللہ کے پاس ہی ہے۔ شاعر اس کو جاننے کا آرزومند ہے:

تخریب سے جہاں کی تعمیر ہو رہی ہے   تیری مشیتوں کا یا رب یہ رنگ کیا ہے

حضرت امام حسینؑ کی عظمت کو وہ اس طرح پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

سر کہاں ہوگا اگر دوش نبیؐ پر پاؤں تھے
عظمت کونین پاسنگِ سر شبیر تھی

واقعۂ شہادت کو وہ فقید المثال کارنامہ سمجھتے ہیں:

تھی شاید کربلا ہی آخری منزل شہادت کی
کہیں دنیا میں اب کیوں سانحہ ایسا نہیں ہوتا

واقعہ شہادت کربلا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔اس کے نقوش گہرے ہیں۔اہل کربلا نے اپنی عظیم قربانی کے طفیل خود کو زندۂ جاوید بنالیا اور وہ خود شہید ہو کر اسلام کو بھی دائمی زندگی بخش گئے:

شہیدان وفا پابند قسمت کے نہیں ہوتے
یہ اپنے حسب مرضی خود بنالیتے ہیں تقدیریں

حضرت حسین کی شخصیت صبر و رضا، فنا و خود سپردگی، حریت و شجاعت اور ضبط و ایثار نفس کا اعلیٰ نمونہ تھی۔انھوں نے روز شہادت اپنی شخصیت کے جوہر دکھائے اور اپنی جان کو رب عظیم کے لیے قربان کر دیا:

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

راضی برضا جو ہیں ان کی محرومی کیا نومیدی کیا
تسلیم و رضا کے مسلک میں پابند تمنا کوئی نہیں

سیماب کے سلاموں میں منظر نگاری کی بھی عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔اگرچہ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن جہاں جہاں انھوں نے اس جانب توجہ کی ہے، وہاں اشعار بلند اہمیت کے حامل بن گئے ہیں:

تپتی ریتی جلتی زمیں اور اس پہ شہیدوں کی لاشیں

یہ آگ میں سیج بچھائی ہے، یہ سونا ہے انگاروں میں

——

صبح عشرہ صبح محشر شام عشرہ شام محشر

میداں میں پڑا ہے سناٹا یا دنیا تھی یا کوئی نہیں

——

میدان سے خیمے تک لاشیں اور کوئی نہیں رونے والا

آنکھوں سے دامن تک آنسو اور پونچھنے والا کوئی نہیں

سیماب اکبر آبادی کے سلاموں میں بلاغت کے منفرد نمونے متعدد جگہ ملتے ہیں جو ان کے کلام میں حسن پیدا کرتے ہیں:

وحدت کے پرستاروں کی جبیں جھکتی ہے تو پھر اٹھتی ہی نہیں

جن کو ادراک سجدہ ہے وہ ایک ہی سجدہ کرتے ہیں

——

معصوم و جواں مرنے والے ہوتے ہیں میرے تصور میں

جب چاند گہن میں آتا ہے جب تارے ڈوبا کرتے ہیں

——

سجاد اسیر جور ہوئے صد حیف کسی نے یہ نہ کہا

یہ پاؤں ستون کعبہ میں زنجیر کسے پہناتا ہے

——

دھوکا ہے نشاط وعیش جہاں کس خواب میں الجھا ہے ناداں

دنیا اور دنیا والوں سے اک رات بسے کا ناتا ہے

——

اے نہرِ فرات! اے نہرِ فرات! افسوس کر اپنی قسمت پر
کوثر کا ساقی آج ترے ساحل سے پیاسا جاتا ہے

غرض سیماب نے اپنی عمومی شاعری سے قطع نظر ''سرودِ غم'' اور ''نفیرِ غم'' کے تحت لکھے ہوئے اپنے مرثیوں اور سلاموں میں بدلتے زمانے کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے حد درجہ ندرت اور انفرادیت پیدا کی ہے۔ انھوں نے تخیل کی بلندی اور فکر کی ندرت وجدت کے ساتھ ساتھ منظر نگاری، بلاغت، صنائع و بدائع اور دیگر شعری وسائل کے استعمال اور زبان واسلوب کی تازہ کاری سے اپنی عزائیہ شاعری کو امتیازی درجے پر پہنچا دیا ہے۔ ان جدت ومہارت نے مذکورہ اصناف کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ترجمہ کافن اور روایت، ڈاکٹر قمر رئیس ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۱، ص ۱۳۷

(۲) ایضاً: ص ۱۵۳

(۳) ہماری شاعری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۴۷

(۴) وحی منظوم، سیماب اکبر آبادی، پرچم پرنٹنگ پریس، کراچی، سن ندارد، ص ۱۰

(۵) وحی منظوم کا ادبی ولسانی مرتبہ، عبدالرحمٰن پرویز اصلاحی، مشمولہ ماہنامہ شاعر، بمبئی، شمارہ ۱۹۷۶، ص ۴۱

(۶) ایضاً، ص ۴۱

(۷) وحی منظوم، سیماب اکبر آبادی، پرچم پرنٹنگ پریس، کراچی، سن ندارد، ص ۵۴

(۸) ایظاً: ص ۵۴

(۹) ایضاً: ص ۵۴

(۱۰) ایضاً: ص ۵۶

(۱۱) شاعر، آگرہ، اسکول نمبر، ۱۹۳۷، ص ۹۰

(۱۲) مولانا سیماب کے ادبی سرمائے پر ایک نظر، محترمہ انجم صبح، الوارث سیماب نمبر، ۱۹۴۹، ص ۱۳۱

(۱۳) الہام منظوم، سیماب اکبر آبادی، جلد سوم، دین محمد پریس، بل روڈ لاہور، ص ۲۵

(۱۴) الہام منظوم، سیماب اکبر آبادی، جلد چہارم، ص ۱۳۶

(۱۵) ادبی جائزے، غلام مصطفیٰ خاں، الکتاب آرام باغ روڈ، کراچی، ۱۹۶۵، ص ۱۷۱

(۱۶) رباعیات حکیم عمر خیام نیشاپوری، ابوالفتح غیاث الدین عمر بن ابراہیم نیشاپوری، انتشارات سفیر صبح، تہران، ۲۰۰۰، ص ۹

(۱۷) رباعیات محروم،تلوک چندمحروم(دیباچہ از جوش ملیح آبادی)رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ،نئی دہلی ، باردوم،۹۵۴، ص ۱۳

(۱۸) رباعیات محروم، ازتلوک چندمحروم(دیباچۂ طبع ثانی از دتاتریہ کیفی)رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ،نئی دہلی ، باردوم،۱۹۵۴،ص ۱۷

(۱۹) عالم آشوب، سیماب اکبرآبادی (پیش لفظ،مخمور اکبرآبادی) مکتبہ قصرالادب ،آگرہ ص ۔س

باب چہارم
سیماب اکبرآبادی اور اصلاح سخن

فصیح الملک داغ دہلوی کے تقریباً ڈیڑھ ہزار شاگرد تھے۔ان میں سے علامہ اقبال اور سیماب اکبرآبادی شہرتوں کے جن مقام پر فائز ہوئے وہ دیگر شاگردوں کے نصیب میں نہیں آئے۔شاگردوں کے معاملے میں خود سیماب اپنے استاد سے بھی بہت آگے نکل گئے۔ سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ کی صحیح تعداد کا تو پتا نہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق ان کی کل تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔ غالباً تلامذہ کی اتنی بڑی تعداد اردو شاعری میں کسی استادفن کو نصیب نہیں آئی۔ان کے شاگرد صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ کثیر تعداد میں بیرون ملک بھی مقیم تھے۔ بیشتر تلامذہ بذریعہ خط و کتابت فیض یاب ہوتے تھے۔خود سیماب کا یہ عالم تھا کہ خطوط کے جواب اور اصلاحِ کلام میں کبھی تاخیر نہیں کرتے تھے۔

سیماب اکبرآبادی کے سب سے پہلے شاگرد امیرالدین نظرا کبرآبادی تھے، پھر تو یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ ایسے کئی شعرا نے ان سے اصلاح لی جن کے نام بعد میں اساتذہ کی فہرست میں شمار ہوئے اور کئی بے حد مقبول ہوئے۔

اصلاح سخن کوئی آسان کام نہیں ہے، ایک غزل یا ایک نظم کی اصلاح میں اتنی ہی قوت و صلاحیت خرچ ہوتی ہے جتنی ایک نظم یا غزل کہنے میں۔ سیماب کے تلامذہ میں بہت سے خود استادِ سخن ہوئے۔کئی شعرا بہت مشہور ہوئے اور آج بھی تلامذہ سیماب سے فیض یاب ہونے والے تلامذہ کی بڑی تعداد موجود ہے۔ان چراغوں سے کئی چراغ روشن ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔عموماً تلامذۂ سیماب خود کو'سیمابی' لکھتے تھے۔ان کے نامور شاگردوں میں نازش پرتاپ گڑھی، اعجاز صدیقی، راز چاندپوری، بسمل سعیدی، شفا گوالیاری، قمر نعمانی، سہسرامی، طرفہ قریشی، الم مظفرنگری، ساغر نظامی، مختار صدیقی، مخمور جالندھری، سراج الدین ظفر، الطاف مشہدی، صبا متھراوی، خموش سرحدی، شہ زور کاشمیری، لطیف انور، ضیا فتح آبادی، محمد صادق ضیا، آغاز برہان

پوری، رونق دکنی، منظر صدیقی، نثار اٹاوی، ابوالمجاہد زاہد، نور بجنوری، طالب کاشمیری، افسر احمد نگری، اثر اکبرآبادی، ارمان آفریدی، حسامی مانک پوری، ابد سرہندی، جسونت رائے رعنا، علیم اختر مظفر نگری، احمد شجاع پاشا، مبشر علی صدیقی، بلقیس جہاں شیریں، نشاط کشتواری، عبدالرزاق سعید، حبیب اشعر، نعمان تاثیر، جالب مظاہری، میر احدی اجمیری، شفق تاثیر صحرائی، خنداں جہلمی، مفتوں کوٹوی، نذیر کوٹی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اس دور میں اردو شاعری اور خصوصاً غزل تفریح محض ہو کر رہ گئی تھی۔ سیماب اکبرآبادی نے نہ صرف خود بلکہ اپنے ہزاروں شاگردوں کے ذریعے 'شعر مہذب' کو رواج دیا، غزل میں فحش نگاری، لفظوں کی بازی گری، گل وبلبل، ہم جنسیت، چھیڑ چھاڑ اور دیگر اخلاق سوز موضوعات کی مخالفت کرتے ہوئے فکر، فلسفہ، نفسیات اور احوال واقعی کو جگہ دی، یہ جدید شاعری کے ابتدائی نقوش تھے، بعد میں زبان وادب کو اس سے کیا فیض پہنچا یہ الگ موضوع ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایتی تفریحی شاعری کے شیدائیوں اور فرسودگی سے جونک کی طرح چپکے ہوئے اس عہد کے اساتذۂ سخن کو یہ سب کچھ ہضم نہیں ہوا اور سیماب اور ان کے تلامذہ کے خلاف ایک محاذ بن گیا۔ اس مخالفانہ لہر کا سیماب کی شخصیت پر تو کوئی اثر نہیں ہوا لیکن ان کے بعض تلامذہ سستی شہرتوں کی لالچ میں اپنے اساتذہ سے بدظن بھی ہوگئے۔ بہر کیف استاد خود کبھی اپنی معنوی اولاد سے بددل نہیں ہوئے۔

(الف) سیماب کا طریقۂ اصلاح

سیماب اکبرآبادی ابتدا میں تو (جب چند ہی شاگرد تھے) اپنے تلامذہ کی پوری پوری بیاضوں پر اصلاح فرمادیتے تھے لیکن جب شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہوگئی تو انھوں نے پابندی لگادی کہ ایک وقت میں صرف ایک غزل یا ایک نظم ہی بطور اصلاح بھیجی جائے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں، اول تو یہ کہ شاگردوں کی کثیر تعداد تھی، پھر خود ان کے اپنے تخلیقی کاموں پر بھی توجہ

دینی تھی، گھر کی کفالت بھی کرنی تھی اور قلم چلا کر ہی روپیہ کمانا تھا۔شاگردوں سے مالی منفعت برائے نام ہی رہی ہوگی، وقتاً فوقتاً ان کے مالی حالات خراب ہوئے بھی تو اس کی کئی وجوہ میں ایک وجہ ان کے شاگرد بھی تھے۔۲۳/مارچ ۱۹۳۵کو انھوں نے ایک مکتوب میں خود ضیا فتح آبادی کولکھا:

> ’’...مجبور ہوں کہ قصرالادب ہندوستان میں ایک مستند مرکزیت حاصل کر چکا ہے۔تلامذہ کا مرجوعہ بڑھتا جارہا ہےاور اسی کے ساتھ میری پریشانیاں بھی۔ اس لیے کہ تمام وقت اصلاح ومشورت ہی میں ختم ہوجاتا ہے۔اصلاح کے علاوہ ادبی استفسار اس قدر آتے ہیں کہ شاید کسی مفتی اعظم کے پاس مذہبی فتوے بھی اتنے نہ آتے ہوں۔ان واقعات کے ماتحت اقتصادی حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیا کرنا چاہیے‘‘۔ (۱)

مکتبہ قصرالادب سے بیک وقت تین چار رسائل واخبارات شائع ہوتے تھے جن پر توجہ دینا بھی ان کے لیے ضروری تھا،لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہر شاگرد پر اپنی مصروفیات کے سبب کم توجہ کرتے تھے بلکہ اگر کسی شاگرد کا کوئی دیوان یا مجموعہ مرتب ہوتا تو وہ اسے کامل طور پر دیکھتے اور ضرورت کے مطابق اصلاحیں بھی کرتے۔

عموماً وہ شعر کی اصلاح کے ساتھ توجیہ نہیں لکھتے تھے۔اس میں ان کی بے پناہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ شاگرد اصلاح کی وجہ پر غور کرے اس طرح ان کے تلامذہ زبان،لغت اور اساتذہ کے دواوین سے استفادے کے عادی ہوجاتے تھےاور روح اصلاح پر غور کرنے سے ان کی ذہنی تربیت ہوتی تھی ۔مزے کی بات یہ کہ شاگردوں کی اصلاح کا یہ طریقہ اس وقت عجیب سا لگتا ہوگا لیکن آج اسکولوں اور کالجوں میں اسی طرح تعلیم دی جاتی

ہے۔ ہاں شاگردوں کی ذہنی تربیت کے لیے فنی نکات، صحت زبان اور اساتذۂ ماضی کی اصلاحوں پر توجیہات باقاعدہ 'پیمانہ' اور 'شاعر' میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور پھر 'رازِ عروض' اور 'دستورالاصلاح' جیسی کتابوں کے ذریعے سیماب اکبرآبادی نے تلامذہ کے لیے ایک طرح کا 'نصاب شاعری' تحریر کردیا تھا۔

ان کا طریقۂ اصلاح بھی دیگر اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ صرف لفظوں کے ہیر پھیر سے شعر کو بامحاورہ موزوں یا بامعنی بنانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ شعر کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے، عموماً غیر مہذب یا رسمی اشعار کو یکسر قلم زد کردیتے اور اصلاح کے وقت اس بات کا خصوصاً خیال رکھتے تھے کہ ان کی اصلاح شاگرد کی علمی اور ذہنی سطح سے مطابقت رکھتی ہو۔

اس زمانے میں عموماً اساتذہ مشاعروں میں اپنے شاگردوں کی پوری بٹالین کے ساتھ شریک ہوتے، چاہے شاگردوں کو مدعو کیا گیا ہو یا نہیں۔ سیماب نے یہ تو نہیں کیا البتہ جب ان کے پاس کسی مشاعرے کا دعوت نامہ آتا تو کوشش کرتے کہ منتظمین مشاعرہ ان کے دو چار شاگرد کو بھی مدعو کریں اور وہ بھی پورے احترام والتزام کے ساتھ اور اس دستور کو بھی غالباً ان ہی نے رواج دیا۔ اس طرح شاگردوں کا ادبی تشخص بھی بنتا تھا اور احترام بھی۔ پھر دوران مشاعرہ بھی اپنے شاگرد کی کامیابی کے لیے فکرمند اور کوشاں رہتے۔ مثال کے طور پر افتخار امام صدیقی کی تحریر کے ایک اقتباس کے ساتھ اپنی بات ختم کررہا ہوں۔ وہ اپنے مضمون 'آگرہ اسکول: ایک تعارف' (مطبوعہ: شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر ۱۹۹۷) میں تحریر کرتے ہیں:

> ''... وہ ساغر نظامی جو اپنے وقت کے مشاعروں کے کامیاب
> ترین مترنم شعرا میں سے بھی تھے۔ حفیظ اور ساغر کے ترنم
> اور مشاعروں میں کامیابی کی کہانیاں اب بھی لوگوں کو معلوم ہیں
> اور یہ واقعات بھی کہ اگر کسی مشاعرے میں ساغر صاحب سے

پہلے حفیظ جالندھری یا کسی اور شاعر نے اپنی غزل کے پہلے مطلع
ہی سے چھتیں اڑانا شروع کردی ہیں تو ساغر صاحب اپنے
استادمحترم کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کررہے ہیں کہ میں
مشاعرہ نہیں پڑھوں گا۔غزل کا مطلع دوسرا ہونا چاہیے اور ادھر
استادِمحترم نے سگریٹ کی ڈبیہ سے پنی نکالی اس پر ایک اور مطلع
لکھا اور اپنے شاگرد عزیز کی طرف بڑھا دیا۔ساغر صاحب نے
مطلع پر نگاہ کی، چہرہ کھل اٹھا، اپنی باری آنے پر جب ترنم سے
نیا مطلع پڑھا تو داد کے ڈونگرے برسے اور آہ وواہ سے پنڈال
میں قیامت بپا پائی''۔ (۲)

وقت اصلاح

سیماب اکبرآبادی کے یہاں وقت اصلاح کی کوئی پابندی نہ تھی۔نہ صبح کی قید تھی، نہ شام کی، نہ تنہائی کا پاس تھا نہ مجمع کا خیال، مقامی شاگردوں میں جس وقت جس کو موقع ملتا وہ اصلاح لے لیتا تھا لیکن عام طور پر شام کے وقت سیماب اکبرآبادی اصلاح دیتے تھے۔اسی وقت باہر سے اصلاح کی غرض سے آنے والے کلام کی بھی اصلاح کیا کرتے تھے۔

مرتبۂ اصلاح

اس کے متعلق ہر شاگرد کی شاعری کی قابلیت کا اندازہ وہ ضرور کیا کرتے تھے۔کہنہ مشق اور عمدہ کہنے والوں کی معمولی غلطیاں اور ذرا ذرا سی باتیں بھی پکڑی جاتی تھیں۔نومشق اور بے پروا کہنے والوں کو موٹی موٹی باتوں سے آگاہی دی جاتی تھی۔

طرز اصلاح

اس میں سیماب اکبرآبادی شاگردوں کی قابلیت اور مرتبے کا لحاظ کیا کرتے تھے۔عام طور پر کلام میں زیادہ تر مختصر لفظی تغیر و تبدل کیا کرتے تھے اور اگر کسی اچھا کہنے والے نے کوئی

معمولی شعر کہا تو وہ شعر قطعاً کاٹ دیا کرتے اور "قلم زد" لکھ دیا کرتے تھے۔ شاگرد کے مضمون کا پاس ضروری ہوتا تھا۔ کوشش کی جاتی تھی کہ وہی مضمون رہنے دیا جائے بلکہ اکثر اوقات لفظ بھی وہی رہنے دیے جاتے، صرف لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر مکمل کر دیا کرتے تھے۔ اچھا استاد وہی سمجھا جاتا تھا جو کم سے کم لفظوں میں شعر درست کر دیتا ہو۔ مضمون کی تبدیلی کی ضرورت بہت کم آتی، وہ بھی اس صورت میں جب شاگرد حجت کرتا۔ اصلاح عام طور پر سرخ روشنائی سے دیا کرتے تھے۔ جس شعر میں اصلاح کی گنجائش نہ ہوتی اسے جوں کا توں رہنے دیا جاتا جو شعر پسند آجاتا اس پر تعریفی کلمات مثلاً خوب، اچھا شعر ہے وغیرہ لکھ دیتے تھے۔

اصول اصلاح (برائے اساتذہ)

سیماب اکبرآبادی نے اصلاح دینے کے کچھ اصول مقرر کیے تھے، اپنی کتاب "دستورالاصلاح" میں لکھتے ہیں:

(۱) اصلاح دینے والے کے ذہن میں اتنا ظرف ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے شاگردوں کے مختلف اور گونا گوں خیالات کی اصلاح کر سکے اصلاح دینا تخت حکومت پر بیٹھ کر مختلف الحال وخیال طبقات انسانی پر حکومت کرنا ہے اصلاح دینے والے کے سامنے ہر قسم کی نظمیں اور غزلیں آتی ہیں اختلافِ خیالات سے اسے کبیدہ نہ ہونا چاہیے۔ میرے شاگرد کانگریسی بھی ہیں اور لیگی بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ سکھ بھی، عیسائی بھی اور آتش پرست بھی ہیں۔ ان سب کے کلام پر ان ہی کے معتقدات کے مطابق اصلاح دیتا ہوں اصلاح دینے والے کا مشرب بہت وسیع ہونا چاہیے اور اس کے خیالات میں اتنی رواداری ہونی چاہیے کہ وہ ہر شخص کا فکری رجحان سمجھنے کے بعد اس کی رہنمائی کر سکے۔

(۲) اصلاح کا لطف یہ ہے کہ شاعر کے خیالات علیٰ حالہٖ قائم و باقی رہیں اور شعر میں جو فنی،

لسانی یا علمی اغلاط ہوں وہ دور ہو جائیں۔ اس لیے اصلاح دینے والے کے مبلغ علم وکمال بہ اعتبارِ عروض وعلوم مروجہ اور بہ اعتبار زبان دانی مسلّم ومکمل ہونا چاہیے جن لوگوں کو زبان اور اس کے محاوروں پر علم عروض اور علم قافیہ پر اور تمام مروجہ زبانوں پر کافی عبور نہ ہو وہ اصلاح نہیں دے سکتے۔ علوم وفنون پر کافی عبور ہونے سے بھی کام نہیں چلتا۔ اصلاح دینے والے میں اجتہادی قوتوں، قادرالکلامی اور خلاقانہ ذہنیت کی بھی ضرورت ہے ورنہ اس کی اصلاح سے اصلاح لینے والوں کی ترقی نہیں ہوسکتی اور نہ وہ ہر جہتی اصلاح کرسکتا ہے۔

(۳) اصلاح دینے والے کا خزانہ معلومات اتنا معمور ہونا چاہے کے باوجود تقسیم خیالات کبھی خالی نہ ہوسکے۔

(۴) جس رنگ میں کسی کی غزل وصول ہو اسی رنگ میں اصلاح بھی دینی چاہیے بعض لوگوں کا اسلوبِ سخن بلیغ ہوتا ہے اس لیے اصلاح میں بھی شان بلاغت قائم رہنی چاہیے۔

(۵) شاگردوں کی غزل میں پورے پورے شعر اپنی طرف سے بڑھا دینا ان کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ جب وہ اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں تو ان کا جی یہی چاہتا ہے کہ استاد اپنے قلم سے غزل میں کچھ شعر بڑھا دیا کریں لیکن یہ چیز شاگردوں کی راہ ترقی میں رفتہ رفتہ ایک حائلہ بھی بن جاتی ہے اس لیے کسی کی غزل میں کبھی کوئی شعر نہ بڑھانا چاہیے۔

(٦) اصلاح دیتے وقت شاگرد کی عمر، علم اور مشاغل ورجحانات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے مثلاً ایک شخص کی عمر ۱۴ سال ہے مشغلہ تعلیم ہے اور رجحانات صرف معمولی موضوعات غزل کی طرف ہیں ایسے شخص کے کلام میں پیرانہ سالی کے جذبات، یا درس و پیام اور خطابت کا اضافہ نہ ہونا چاہیے۔ البتہ جب وہ خود اپنے رجحانات میں ترقی کر لے اور اس کا ذہن بالغ بلند مضامین خود پیدا کرنے لگے تو اصلاح کا پیرایہ بھی بلند کیا جاسکتا ہے۔

(۷) جب غزل بہت زیادہ قابل اصلاح ہو اور شعر پست نظر آتا ہو تو ایسی غزل پر اصلاح دینے سے اس کا واپس کر دینا بہتر ہے تاکہ وہ بعد فکر و غور پھر لکھی جائے اور چست کرنے کے بعد اصلاح کرنے کے لیے بھیجی جائے غزل جتنی چست ہوتی ہے اصلاح بھی اتنی چست ہوتی ہے بے شک سست غزل کو چست کر دینا ایک استاد کا کمال ہے لیکن نہ اس طرح کہ پوری غزل مطلع سے مقطع خود ہی لکھنی پڑے اصلاح جستہ جستہ ہوتی ہے پیوستہ نہیں ہوتی۔

(۸) جب کوئی شعر رکیک، مبتذل، پست اور بازاری ہو تو وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ اسے کاٹ دینا چاہیے اصلاح میں رعایت کرنا ایک غیر مدبرانہ طرف داری ہے جو شاگردوں کے مستقبل کو خراب کرتی ہے۔

(۹) اگر کوئی شعر محتاج اصلاح نہ ہو مگر اصلاح دینے والے کے خیال میں کسی نہ کسی وجہ سے معیوب ہو تو ایسے شعر کو 'نظری' کر دینا چاہیے اور دونوں مصرعوں کے درمیان 'نظر' بنا دینا چاہیے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ شعر نظر انداز کر دیا گیا ہے اسے غزل میں نہ رکھیے۔

(۱۰) شاگردوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ اچھا اور دل نشیں شعر کیسا ہوتا ہے۔ مصرعوں کے مابین ''ص'' بنا دیا جاتا ہے جس کے معنی صحت شعر کے علاوہ صحت خیال بھی ہوتے ہیں مگر ''ص'' بنانے میں زیادہ کشادہ دلی سے کام نہ لینا چاہیے کہ اس طرح اکثر اصلاح لینے والوں کو اپنے متعلق غلط فہمی ہو جاتی ہے۔

(۱۱) جو لوگ شعر موزوں نہ کہہ سکیں انھیں یہ تعلیم نہ دیجیے کہ وہ گنگنا کر یا گا کر شعر کا وزن دیکھ لیا کریں۔ یہ عادت بہت بُری ہے ایسے شاگردوں کو ہدایت کیجیے کہ وہ باقاعدہ شعر کی تقطیع کرنا سیکھیں۔ دو چار مرتبہ تقطیع کر کے بتا دینے سے تقطیع کرنا آجاتا ہے۔ جن کی طبیعت فطرتاً موزوں ہو انھیں بھی طریقۂ تقطیع سے بے نیاز نہ رہنا چاہیے۔

(۱۲) جب کئی غزلوں کی اصلاح کے بعد بھی کسی شاگرد کا اسلوب بیان اور رنگ کلام بلند نہ ہو تو مایوس نہ ہونا چاہیے رفتہ رفتہ استاد کا رنگ شاگرد پر غالب آ ہی جاتا ہے۔

(۱۳) جس شعر میں املا یا انشا کی غلطیاں ہوں اس پر بہت زیادہ تنبیہ کی ضرورت ہے ایسے لوگوں کو شعر کہنے سے زیادہ مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلانی چاہیے۔

(۱۴) جب کسی کی غزل اصلاح کے لیے آئے تو پہلے اسے مطلع سے مقطع تک پڑھ لیجیے اگر قابل اصلاح ہو تو اصلاح دیجیے ورنہ از سرنو غزل کہنے کی ہدایت کر کے واپس کر دیجیے۔

(۱۵) توجیہ اصلاح نہایت ضروری چیز ہے اس سے وجہ اصلاح سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن توجیہ صرف ان کے لیے آسان ہے جن کے پاس غزلیں اصلاح کے لیے کم آتی ہیں انھیں چاہیے کہ وہ حاشیہ پر اصلاح کی توجیہ ضرور کر دیا کریں۔ مجھ جیسے کثیر التلامذہ شاعر کے لیے یہ بات ہمیشہ نا قابل عمل رہی تاہم بعض ضروری ہدایات یا توجیہات حاشیہ غزل پر میں بھی لکھ دیتا ہوں مگر یہ ضرورت صرف ان غزلوں میں زیادہ پیش آتی ہے جو ابتدائی زمانہ مشق میں کہی جاتی ہیں پھر تو اصلاح لینے والا خود ہی سمجھ لیتا ہے کہ اصلاح کیوں دی گئی ہے اور جب یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے تو رفتہ رفتہ ضرورت توجیہ خود بخود کم ہو جاتی ہے۔

(۱۶) میں نے بعض معاصرین کو دیکھا ہے کہ جب وہ اصلاح دیتے ہیں تو اصلاح اصل لفظ کے اوپر اس طرح لکھ دیتے ہیں۔

تمہارے راہو کے پھر انساں / کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

یہ طریقۂ اصلاح میری دانست میں غلط ہے۔ انسان کو اس طرح 'انساں' کاٹ دینا چاہیے پہلی صورت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ مصرع میں 'انساں' رہنے دے یا 'کوئی' بنا لے یہ شک اور تذبذب میں ڈالنے والی بات ہے۔

اس سے شاگرد کا خیال کسی ایک لفظ پر قائم نہیں ہوسکتا اصلاح دینے والے کی اصلاح فیصلہ کن ہونی چاہیے جس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہ رہے۔

(۱۷) جوغزل خراب یا شکستہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہو یا پنسل سے لکھی ہو یا اسلوب تحریر گنجلک ہو اسے بغیر اصلاح واپس کر دینا بہتر ہے۔ اس سے شاگرد کی بدذوقی کا پتہ چلتا ہے اور بدذوق شاگرد کسی طرح اس کا اہل نہیں کہ اسے اصلاح دی جائے۔

(۱۸) اصلاح دینے کے طریقوں میں ہمیشہ اسی کا اتباع اور تقلید کرنی چاہیے جس سے اصلاح لی ہو۔

(۱۹) کسی غزل پر حکّ واصلاح کے بعد نظر ثانی ضرور ڈال لی جائے۔

(۲۰) بغیر ضرورت کسی شعر پر اصلاح نہ دی جائے۔ بعض اساتذہ اپنا رعب استادی قائم رکھنے کے لیے بے ضرورت بھی شعر میں اصلاح دے دیتے ہیں۔ یہ طریقہ خود نمائی بہت معیوب ہے۔ اگر کوئی شعر زبان، محاورہ، چستی بندش، تناسب الفاظ اور سلجھے ہوئے خیال کا حامل ہوتو اسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے۔

(۲۱) اصلاح کی خوبی یہ ہے کہ جب استاد کسی شعر پر اصلاح دے اور پھر لفظاً اور معناً اس سے بالاتر ترقی کا کوئی درجہ شعر میں نظر نہ آئے۔

(۲۳) ان شاگردوں کے کلام پر نہایت غور سے اصلاح دینی چاہیے جو بلند مبلغ علم رکھنے کے ساتھ ساتھ استاد کے صحیح مشوروں سے صحیح فائدہ اٹھانے کے بعد ترقی کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ اکثر اصلاح کا سہارا ایسے شعر کہنے والوں کی تعداد بڑھا دیتا ہے جو ادب میں کوئی گراں مایہ اضافہ نہیں کر سکتے اور سال باسال شعر کہنے کے بعد بھی ان میں شعر کہنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی گویا ان کی شاعری استاد کی اصلاح کے سہارے زندہ رہتی ہے اور جب یہ سہارا زندہ نہیں رہتا تو ان کی شاعری بھی ختم ہو جاتی ہے ایسے

مصنوعی شعرا کی تعداد بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ایک شاعر کامل یا اصلاح دینے والے کو سلیم الفطرت، عظیم الفکر، صحیح الطبع، جید الرویہ اور دقیق النظر ہونا چاہیے۔ (۳)

اصول اصلاح (برائے تلامذہ)

جہاں اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ اصلاح دیتے وقت ان اصولوں کی پاس داری کریں وہاں شاگردوں کے لیے بھی کچھ اصول مقرر کیے گئے جن کی پابندی ان کے لیے لازم ہے گویا جس طرح اصلاح دینے کا طریقہ ہوتا ہے اسی طرح اصلاح لینے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے اس ضمن میں کچھ اصول مقرر کیے ہیں جن پر عمل کرنا ان کے خیال میں شاگرد کے لیے ضروری ہے۔ سیماب اپنی کتاب ''دستور الاصلاح'' میں رقمطراز ہیں:

(۱) جب موزوں اشعار کہنے پر طبیعت قادر ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ ذوق شعر و شاعری فطری ہے تو اساتذۂ وقت کے کلام کا بہ نگاہِ عمیق مطالعہ کیا جائے ان میں سے جس کا کلام طبیعت پر اثر انداز ہو اور جس کی طرف طبیعت فطرتاً مائل ہو اس کا شاگرد ہو جانا چاہیے مگر یہ ضروری ہے کہ جس کی شاگردی اختیار کی جا رہی ہے وہ کہنہ سال ہو، کہنہ مشق ہو اور مشاہیر شعرائے عہد میں استاد فن تسلیم کیا جا چکا ہو۔

(۲) اصلاح کے لیے غزل بھیجنے سے پہلے اسے چار پانچ مرتبہ خود دیکھ لینا چاہیے اور جہاں ضرورت ترمیم محسوس ہوتی ہو وہاں خود ترمیم کر دینی چاہیے جب آپ کے خیال میں غزل بالکل مکمل اور نا قابل ترمیم و تنسیخ ہو جائے اس وقت اصلاح کے لیے بھیجئے حقیقتاً وہی غزل یا نظم قابل اصلاح ہوتی ہے جو ایک شاگرد کی نظر میں نا قابل اصلاح ہو۔

(۳) غزل صاف اور نفیس کاغذ پر ایک طرف اس طرح لکھئے کہ بین السطور (سطروں

کا درمیانی فاصلہ)واضح رہے اور اصلاح دینے کے لیے کافی جگہ موجود ہو۔

(۴) حاشیہ بھی ضرور چھوڑے تا کہ اگر ضرورت ہو تو اصلاح کی توجیہ کی جا سکے۔

(۵) واپسی کے لیے ایسے الفاظ لکھے جن میں حکم وامر نہ پایا جائے۔

(٦) خیال رکھے کہ لفافے اور خط سے آپ کی نفاست اور لطافت طبع کے خلاف کوئی رائے قائم نہ کی جا سکے۔

(۷) ہر شعر خود ہی پورا لکھے ایک مصرع لکھ کر دوسرا مصرع استاد سے نہ مانگیے۔ اگر آپ کا مصرع کمزور ہوگا تو خود بدل دیا جائے گا۔

(۸) جب غزل بعد اصلاح واپس آئے تو اصلاح پر بار بار غور کیجیے اور سمجھئے کہ اصلاح کیوں دی گئی؟ جس ترکیب یا محاورے میں اصلاح ہوا سے ہمیشہ یاد رکھیے اور پھر اس کے خلاف کبھی نہ لکھے۔

(۹) غزل کی واپسی کے لیے ٹکٹ لگے ہوئے لفافے پر اپنا پتہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر غزل کے ساتھ رکھ دیجیے۔ اس طرح اصلاح دینے والے کو لفافے اور وقت کی بچت ہوگی۔

(۱۰) اصلاح شدہ غزلوں کو پورے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھیے اور فرصت کے اوقات میں ان پر ایک نظر ضرور ڈال لیا کیجیے۔

(۱۱) اصلاح لینے سے پہلے علم عروض کی دو چار کتابیں ضرور دیکھ لیجیے اور بحور واوزان یاد کر لیجیے تا کہ آپ کا کوئی شعر وزن سے خارج نہ ہو۔

(۱۲) متروکات سے ہمیشہ احتراز کیجیے۔

(۱۳) یوں تو استاد کی زندگی تک اس کا کوئی شاگرد خود کو فارغ الاصلاح نہیں سمجھ سکتا لیکن آپ کی کوشش ہمیشہ یہ ہونی چاہیے کہ آپ کی غزل پر اصلاح بہت کم ہو اور رفتہ رفتہ بالکل نہ ہو۔

(۱۴) اصلاح کے لیے بیک وقت صرف ایک غزل یا نظم بھیجئے اس لیے کہ استاد کے اور بھی شاگرد ہیں اور ان کی غزلیں بھی آتی رہتی ہیں استاد کو صرف ایک آپ ہی کی غزل دیکھنی نہیں ہے اس کا بہت قیمتی ہے اس طرح ہر مہینے آپ جتنی غزلیں بھیج سکیں، بھیجے مگر ایک خط میں ایک سے زیادہ نہ ہو۔

(۱۵) اپنے استاد کا رنگ اپنی غزل میں بھرنے کی پوری کوشش کیجیے۔

(۱۶) جس بات سے ایک بار منع کر دیا جائے اس کا اعادہ کبھی نہ کیجیے۔

(۱۷) بغیر اصلاح لیے کوئی غزل کسی کو نہ سنایئے نہ مشاعرے میں پڑھیے خواہ آپ اس سے کتنے ہی مطمئن کیوں نہ ہوں۔ اگر مشاعرے کے وقت تک غزل واپس نہ پہنچ سکے تو مشاعرے میں شرکت نہ کیجیے ممکن ہے غزل میں کوئی ایسی غلطی ہو جو آپ کے جمے ہوئے اعتبار کو زائل کر دے۔

(۱۸) ہمیشہ ایک استاد کا دامن تھام کر 'یک در گیر و محکم گیر' پر عمل کیجیے اور اپنے استاد کو سب سے برتر و افضل سمجھئے آپ کی عقیدت، خدمت اور محبت ہی آپ کی ترقی و تکمیل کی ضامن ہے۔

(۱۹) تکمیل مشق کے لیے حتی الامکان روز کچھ شعر ضرور کہہ لیا کیجیے یہ ضروری نہیں کہ آپ رطب و یابس جو کچھ کہیں وہ اصلاح کے لیے بھی بھیج دیں اصلاح کے لیے مکمل بہتر نظم یا غزل بھیجنی چاہیے۔

(۲۰) اپنے استاد کا کلام روزانہ کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لیا کیجیے اور دوسرے مشاہیر شعرا کا کلام بھی اپنے مطالعہ میں رکھیے۔

(۲۱) ہر صنف کلام میں شعر کہنے کی کوشش کیجیے۔

(۲۲) بلند معیار اردو لٹریچر ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھیے۔

(۲۳) جب آپ پہلی غزل اصلاح کے لیے بھیجیں تو اپنی عمر و مشاغل کی توضیح بھی کر دیجیے
تا کہ اصلاح کے وقت آپ کے طبعی حالات پر نگارہ رکھی جائے اور آپ کو بتایا جائے کہ
آپ کے لیے موضوعات شاعری میں کون سا موضوع نامناسب اور کون سا مناسب
ہے۔ (۴)

جہاں تک سیماب کی اس بات کا تعلق ہے کہ شاگرد کو اپنے استاد کا رنگ اپنی غزل میں بھرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس طرح تو شاگرد کا ستاد کے رنگ میں ڈھل جائے گا اور اس کا انفرادی رنگ کبھی اجاگر نہ ہوگا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اصلاح سخن کی روایت پر بھی یہی الزام ہے کہ اس نے تقلیدی شاعر پیدا کیے۔ گو اس کا اطلاق اس روایت سے وابستہ تمام شعرا پر نہیں کیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے سیماب کے دور میں یہ بات معیوب نہ رہی ہو مگر آج ضرور معیوب ہے۔

(ب) تلامذہ کے کلام پر سیماب اصلاحوں کا تجزیاتی مطالعہ

سید عنایت علی آغاز حسنی الحسینی کی نظم پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

''کیف دوشیں''

سید عنایت علی آغاز ؎

وہ ساقی ازل وہ دور بادۂ الست کا　　　　وہ اجتہادِ لطف و کیف ہر فضائے مست کا

اصلاحِ سیماب ؎

وہ ساقی ازل وہ دور بادۂ الست کا　　　　وہ انتشار لطف و کیف ہر فضائے مست کا[1]

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر کا مفہوم دوبالا ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ ساقی، دور بادہ اور انتشار میں معنوی طور پر بہت مناسبت اور ربط ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'لطف و کیف' اور 'فضائے مست' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بادہ نوشی کے بعد خواہش نفس کا بڑھنا اور لطف و سرور کی فضا قائم ہونا فطری امر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ اس شعر کا تعلق عشق حقیقی سے ہے۔ 'ساقی ازل' اللہ تعالیٰ ہے اور 'الست' سے اشارہ قرآن کریم کی آیت 'الست بربکم' کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ نے ارواح کی تخلیق کے بعد فرمایا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اس کے جواب میں سبھی نے کہا کیوں نہیں یا اللہ؟ آپ ہمارے رب ہیں۔ 'فضائے مست' کی مناسبت سے 'انتشار' کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔ فضا کی ایک صفت چیزوں کو منتشر کرنا اور انتشار پھیلانا بھی ہے اور 'فضائے مست'، 'لطف و کیف' کا انتشار کر رہی ہے۔ یہی بات زیادہ درست ہے۔ اس سے کلام کی معنویت بڑھ گئی ہے۔

آغاز ؎

وہ عالم طلوعِ صبح، میکدہ بدوش تھا　　　　فضائے جزو کل تھی اور مستیوں کا جوش تھا

اصلاح سیماب ؎

وہ عالم طلوعِ صبح ، میکدہ بدوش سا فضائے جزو کل میں پاک مستیوں کا جوش سا ۲؎

'تھا' کے مقام پر 'سا' کی تبدیلی سے شعر کے مفہوم میں وسعت پیدا گئی ہے اور زمانے کی تخصیص ختم ہوگئی ہے۔ وہیں لفظ 'پاک' کے اضافے نے عشق حقیقی کو مزید واضح کر دیا ہے۔

آغاز ؎

وہ دورِ کیف آفریں شرابِ خانہ ساز کا وہ جرعے جرعے میں خمار لطفِ حق نواز کا

اصلاح سیماب ؎

وہ دورِ کیف آفریں شرابِ خانہ ساز کا وہ جرعے جرعے میں خمار کیفِ دل نواز کا ۳؎

سیماب اکبرآبادی نے شاید 'شراب' کی مناسبت سے 'لطف حق نواز' کو 'کیف دل نواز' سے بدل دیا ہے کہ لفظی اور معنوی دونوں مناسبت پیدا ہو جائے۔

آغاز ؎

وہ روح روح اک جہانِ سرخوشی لیے ہوئے وہ مستیوں میں جوشِ کیفِ سرمدی لیے ہوئے

اصلاح سیماب ؎

وہ روح روح اک جہانِ سرخوشی لیے ہوئے وہ سرخوشی، کہ جوشِ کیف سرمدی لیے ہوئے ۴؎

اصلاح کے بعد دونوں مصرعوں میں ربط پیدا ہو گیا ہے اور 'سرخوشی' کی نوعیت بھی واضح ہوگئی ہے تو دوسری طرف پڑھنے میں بھی روانی اور سلاست آ گئی ہے۔

آغاز ؎

وہ دورِ آفتاب اپنے دور کی سبیل میں شرابِ حسنِ ڈھل رہی تھی ساغرِ جمیل میں

اصلاح سیماب ؎

وہ دورِ آفتاب التہاب کی سبیل میں شرابِ حسنِ تیز تیز ساغر جمیل میں ۵؎

'دور' کی تکرار معیوب لگ رہی تھی، تکرار سے کسی قسم کا صوری یا صوتی حسن یا معنوی پیش

رفت نہیں ہورہی تھی۔ لہٰذا ایک جگہ سے ختم کر کے 'التہاب' کا لفظ لانا مناسب تھا اور دوسرے مصرعے میں 'التہاب' کے معنوی انسلاکات کے پیشِ نظر 'تیز تیز' کا لفظ لانا بھی بہتر اصلاح ہے۔ 'تیز تیز' میں ڈھلنے کا معنی بھی آ جاتا ہے۔

آغاز ؎

امنگ، امنگ کیف زا خرابیاں لیے ہوئے وہ رنگ رنگ، احمریں گلابیاں لیے ہوئے

اصلاح سیماب ؎

امنگ، امنگ کیف جوانیاں لیے ہوئے وہ رنگ رنگ، احمریں گلابیاں لیے ہوئے [6]

'خرابیاں' کو 'جوانیاں' سے بدل کر سیماب اکبرآبادی نے شعر میں جامعیت پیدا کر دی ہے کیونکہ 'خرابیاں' کا لفظ مصرع میں بے کار اور برائے بیت تھا۔ 'خرابیاں' میں امنگ کا صرف ایک پہلو تھا جب کہ 'جوانیاں' میں دونوں پہلو یعنی اچھائیاں اور خرابیاں شامل ہوگئی ہیں۔ اس لیے کہ جوانی کی امنگیں صرف منفی نہیں ہوتیں مثبت بھی ہوتی ہیں۔

آغاز ؎

وہ بزمِ دوش اور شورِ ناؤ نوش اب کہاں وہ عالم سرور وہ صلائے جوش اب کہاں

اصلاح سیماب ؎

" " " " " وہ دعوت سرور وہ صلائے جوش اب کہاں [7]

'ناؤ نوش' کی مناسبت سے 'دعوت' لفظ نہایت موزوں ہے۔ 'دعوتِ سرور' میں رعایت بھی ہے جس سے ایہام کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔

آغاز ؎

وہ ذوقِ لطف و کیف پھر بقدر ہوش چاہیے ازل کا جرعہ نوش ہوں میں کیفِ دوش چاہیے

اصلاح سیماب ؎

ازل کا جرعہ نوش ہوں، نشاط دوش چاہیے ۸؎

سیماب اکبرآبادی کی بہت اچھی اصلاح ہے۔ کیونکہ 'کیف' کی تکرار غیر ضروری تھی۔ دوسرے مصرعے میں 'ہوں' کی وجہ سے 'میں' حشو تھا۔ 'میں کیف' کی جگہ 'نشاط' کا لفظ رکھنے سے حشو اور تکرار دونوں عیب نہیں رہے۔

مولوی نور الدین انور انصاری بھوپالی کی غزل پر سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

انور انصاری ؎

نہ ہے منھ میں زباں میرے نہ کوئی گفتگو میری　　　چمن کی پتی پتی ہے زبانِ آرزو میری

اصلاح سیماب:

جہاں چاہو وہاں گلشن میں سن لو گفتگو میری　　　چمن کی پتی پتی ہے زبانِ آرزو میری ۹؎

انور انصاری کے مصرع میں ایک اشتباہ ہے اور وہ یہ کہ جب منھ میں زبان نہیں ہے تو ظاہر ہے گفتگو بھی آپ کی نہیں ہوگی۔ تو چمن کے پتوں کو آپ کی آرزوؤں کا پتہ کیسے چلا۔ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد یہ بات ختم ہوگئی ہے اور لفظی مناسبت کے ساتھ معنوی مطابقت پیدا ہوگئی ہے کہ چمن میں جہاں چاہو میری گفتگو سن لو اس لیے کہ چمن کا ہر پتا اور بوٹا میری کیفیت سے واقف ہے۔ اصلاح کے بعد دونوں مصرعے معنوی طور پر مربوط ہو گئے ہیں۔ اصلاح سے قبل پہلا مصرع بے معنی تھا۔

انور انصاری ؎

رگ و پے میں نہ جانے کون سی شے دوڑتی پھرے ہے　　　مجھی میں کر رہا ہے کوئی شاید جستجو میری

اصلاح سیماب ؎

رگ و پے میں کوئی شے دوڑتی پھرتی ہے ہر ساعت　　　مجھی میں کر رہا ہے کوئی شاید جستجو میری ۱۰؎

براہ راست کہی گئی بات میں زیادہ وزن ہوتا ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

جامع وہی جملے ہیں جن میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔ 'نہ جانے کون سی' کے مقام پر صرف 'کوئی' سے مصرعے میں جامعیت آ گئی ہے اور مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے۔ سلاست اور روانی آ گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ 'کوئی' میں 'نہ جانے کون سی' کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے اور انشائیہ لہجہ بھی برقرار ہے۔

انور انصاری ؎

مگر وارفتۂ رفتار ہوں دشتِ محبت میں　　　　کہ میری جستجو میں کھو گئی خود جستجو میری

اصلاح سیماب ؎

مگر وارفتۂ رفتار تھا میں دشتِ الفت میں　　　　کہ میری جستجو میں کھو گئی خود جستجو میری [11]

پہلی بات دوسرے مصرعے میں حادثے کا تعلق ماضی کے کسی عمل سے تھا لہٰذا اصلاح سے دونوں مصرعے مربوط ہو گئے۔ وہیں دوسری طرف سیماب اکبر آبادی کی اصلاح کے بعد مصرعے میں موجود سکتہ ختم ہو گیا ہے اور شعر کا مفہوم بھی وسیع ہو گیا ہے۔ 'دشت محبت' کے بجائے 'دشت الفت' میں زیادہ معنویت ہے زمانے کی تبدیلی سے بھی شعر جامع ہو گیا ہے۔

انورؔ انصاری ؎

رسائی ہر کس و ناکس کی انورؔ غیر ممکن ہے　　　　فلک سے بھی بہت اونچی ہے بام آرزو میری

اصلاح سیماب ؎

〃　〃　〃　〃　〃　　　　فلک سے بھی بہت اونچی ہے بزمِ آرزو میری [12]

سیماب اکبر آبادی کی اصلاح درست ہے کیونکہ 'بام' مذکر ہے۔ 'بزم' کا لفظ رکھنے سے آرزوؤں کی تعداد بڑھ گئی۔ آرزو کے لحاظ سے 'بزم' مناسب لفظ ہے اور شعر کے معنوی حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

مولوی بشارت علی خاں ارمانؔ آفریدی کی غزل پر سیماب اکبر آبادی کی اصلاح

ارمانؔ آفریدی

آہ کا اسلوب نوایجاد ہونا چاہیے　　　　سانس کی بھی نیند سے آزاد ہونا چاہیے

اصلاح سیمابؔ

"　　　"　　　"　　　"　　　سانس کی الجھن سے بھی آزاد ہونا چاہیے ۱۳؎

'سانس' کی رعایت سے 'الجھن' کا لفظ نہایت مناسب ہے۔اصلاح سے پہلے جو تعقید تھی وہ بھی دور ہوگئی ہے اور مصرع زیادہ رواں ہوگیا ہے۔

ارمانؔ آفریدی

پھر ضرورت ہے کہ کروٹ لے نظامِ انقلاب　　　　یعنی مجھ کو مائلِ فریاد ہونا چاہیے

اصلاح سیمابؔ

پھر ضرورت ہے کہ لے کروٹ نظامِ انقلاب　　　　یعنی مجھ کو مائلِ فریاد ہونا چاہیے ۱۴؎

سیماب اکبر آبادی کی اصلاح کے بعد مصرع رواں ہوگیا ہے اور تعقید بھی ختم ہوگئی ہے۔

ارمانؔ آفریدی

ہر خلش میں ٹیس ہر رگ میں خلش کی بستیاں　　　　اک جہانِ دل نیا آباد ہونا چاہیے

اصلاح سیمابؔ

ہر خلش میں ٹیس ہر رگ میں خلش نشتر فروش　　　　اک جہانِ دل نیا آباد ہونا چاہیے ۱۵؎

بہت عمدہ اصلاح ہے۔ پہلے مصرع میں 'نشتر فروش' رکھنے سے خلش کی ٹیس کو جواز مل گیا۔

ارمانؔ آفریدی

میری بربادی کے ہر قصے سے اک دنیا بسے　　　　ہاں مجھے اس شان سے برباد ہونا چاہیے

اصلاح سیمابؔ

خاک کے ذرّوں سے میری اک نئی دنیا بنے　　　　مجھ کو ایسی شان سے برباد ہوناچاہیے ١٦

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح درست ہے کیونکہ 'برباد' کی تکرار بھلی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے مصرعے میں 'خاک کے ذروں' کی اصلاح سے بربادی بلیغ ہوگئی ہے۔ شعر کا مفہوم وہی ہے جو شاگرد نے کہا ہے۔ کیونکہ برباد ہونے کی شان یہ ہونی چاہیے کہ خاک کے ہر ذرے (یعنی بربادی کے ہر قصے کا مفہوم پوشیدہ ہے) سے اک نئی دنیا بسے۔

مولوی محمد اسحاق آلم مظفرنگری کی غزل پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

آلم مظفرنگری

بن کے اک شورشِ آہنگ رگِ ساز کبھی　　　　ہو مغنّیٔ ازل زمزمہ پرداز کبھی

اصلاح سیماب

بن کے پھر شورش آہنگ رگِ ساز کبھی　　　　ہو مغنّیٔ ازل زمزمہ پرداز کبھی ١٧

عاشق کے لیے معشوق کی طرف سے ملنے والی ہر چیز کا بار بار ہونا یا مسلسل ہونا زیادہ اہم ہے۔ پہلے مصرع میں اصلاح کے بعد یہ بات پیدا ہوگئی ہے۔ 'اک' میں مطالبہ پایا جاتا ہے جب کہ 'پھر' سے یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ واقعہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور اس میں عاشق کو لطف آتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے دہرانے کا متمنی ہے۔ اس لیے سیماب کی اصلاح درست ہے۔

آلم مظفرنگری

تھا تصور ترا دل کا مرے ہمراز کبھی　　　　حیرتِ آئینہ تھی آئینہ پرداز کبھی

اصلاح سیماب

تھا تصور بھی تمہارا مرا ہمراز کبھی　　　　حیرتِ آئینہ تھی آئینہ پرداز کبھی ١٨

'تیرا' سے زیادہ 'تمہارا' فصیح ہے۔ سیماب کی اصلاح کے بعد مصرع میں روانی آ گئی ہے۔ ساتھ ہی مفہوم بھی واضح ہوگیا ہے۔ 'راز' کا تعلق دل سے ہے اس لیے اگر لفظ 'دل' کا

استعمال نہ ہوتب بھی بات سمجھ میں آجائے گی۔شاید اسی لیے سیماب اکبرآبادی نے ’دل‘ کو مصرع سے نکال دیا ہے۔اس سے جہاں مصرع میں ثقالت کم ہوئی ہے وہیں سلاست میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

آلم مظفرنگری

طعن صیاد نہ کر بے پروبالی یہ مری | لے اڑے گی مجھے یہ جوششِ پرواز کبھی

اصلاح سیماب

طعن صیاد نہ دے بے پروبالی یہ مری | لے اڑے گی مجھے یہ کاہشِ پرواز کبھی ۱۹

’طعن دینا‘مستعمل ہے’طعن کرنا‘نہیں۔البتہ طعنہ کسنا استعمال ہوتا ہے۔دوسرے مصرعے میں ’جوشش‘ کے بجائے ’کاہش‘ کا استعمال ’بے پروبالی‘ کی مناسبت سے ہے۔ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح سے شعر بامعنی ہوگیا ہے۔

آلم مظفرنگری

دوست تو دوست عدو بھی کسی امید میں ہے | ان کی محفل کا بدلتا نہیں انداز کبھی

اصلاح سیماب

دوست تو دوست ہے دشمن بھی نہیں ناامید | ان کی محفل کا بدلتا نہیں انداز کبھی ۲۰

’عدو‘ میں عربیت ہے۔پڑھنے میں بھی ثقیل ہے اور سمجھنے میں بھی۔’دوست‘ کے ساتھ ’دشمن‘ کا استعمال فصیح اور بلیغ کے ساتھ عام فہم بھی ہے۔اس کے علاوہ ’کسی امید‘ میں وہ بات نہیں جو ’نہیں ناامید‘ میں ہے۔سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد مصرع واضح، سلیس اور بلیغ ہوگیا ہے۔

آلم مظفرنگری

مرگیا قیدی زنداں ہوئی تکمیلِ جنوں | اب نہیں آئے گی زنجیر کی آواز کبھی

اصلاح سیماب

" " " " " <u>ہاں نہ اب</u> آئے گی زنجیر کی آواز کبھی ۲۱

'ہاں نہ اب' میں 'اب نہیں' کی بہ نسبت زیادہ تاکید ہے۔ 'اب نہیں' میں مایوسی کی جھلک ہے جبکہ 'تکمیل جنوں' میں فخریہ انداز سے جو عاشق کا مقصود ہوتا ہے۔ ہاں نہیں میں پکار کی آہٹ بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی پیچھے سے پکار کر کچھ کہہ رہا ہے اور اس کا جواب اثبات میں ہے کہ نہیں آئے گی اور پھر اس کے بعد بھی تاکیداً کہا جا رہا ہے کہ اب نہیں آئے گی۔

آلم مظفرنگری

سچ ہے کیونکر قلقِ ہجر کی ہو تم کو خبر　　　میرے نالوں کی بھی آتی نہیں آواز کبھی

اصلاح سیماب

" " " " " میرے نالوں کی <u>سنی ہی</u> نہیں آواز کبھی ۲۲

'نالے' اور 'آواز' کی مناسبت سے 'سننا' زیادہ بہتر ہے۔ پہلے مصرعہ میں بھی 'قلق ہجر' کی خبر کی بات کی جارہی ہے اس مناسبت سے بھی 'سننا' فصیح ہے۔ اصلاح سے قبل مصرعے میں تاکید کے دو الفاظ تھے اصلاح کے بعد ان میں سے ایک حذف ہو گیا ہے جس سے روانی آ گئی ہے۔

جناب فضل الدین آثر بی اے اکبر آبادی کی غزل پر سیماب کی اصلاح

فضل الدین آثر

تیری محفل ترے آئینے مبارک ہوں تجھے　　　شمع فطرت تھا میں خاموش ہوا جاتا ہوں

اصلاح سیماب

" " " " " <u>میں کہ اک شمع تھا</u> خاموش ہوا جاتا ہوں ۲۳

دراصل 'شمع فطرت' کہنے کے لیے کوئی جواز نہیں تھا۔ شاگرد جو کہنا چاہتا ہے وہ 'شمع'

سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے 'فطرت' کا لفظ شعر سے ہٹا کر زیادہ چست کر دیا ہے اور حشو و زوائد سے بھی پاک کر دیا ہے۔ اصلاح بالکل درست ہے۔

فضل الدین آثر؎

بجلیاں کوند کے دیتی ہیں سزائے وحشت		بے خودی میں کوئی چلمن جو اٹھا جاتا ہوں

اصلاح سیماب؎

بجلیاں کوند کے دیتی ہیں سزائے جرأت		بے خودی میں کوئی چلمن جو اٹھا جاتا ہوں ۲۴

سزا 'جرأت' کو دی جاتی ہے نہ کہ 'وحشت' کو، اس لیے اصلاح کے پہلے مصرع میں 'جرأت' کا لفظ ہی زیادہ مناسب اور درست ہے۔ دوسری بات 'بجلیوں کے کوندنے' کو 'سزا' سے تعبیر کیا گیا ہے اور سزا جرأت کو دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ چلمن اٹھانے سے آنکھیں چار ہوئیں اور آنکھوں کی چمک کو بجلی کی چمک کہا گیا ہے۔ آنکھیں بجلیاں گراتی ہیں جو کہ رسومیات میں سے ہیں۔ اس لیے سیماب کی اصلاح بالکل برمحل ہے۔

فضل الدین آثر؎

آؤ رومانِ غمِ عشق مکمل کر دیں		تم بنو شمع، میں پروانہ بنا جاتا ہوں

اصلاح سیماب؎

آؤ رومانِ غمِ عشق مکمل کر لیں		تم بنو شمع، میں پروانہ بنا جاتا ہوں ۲۵

'کر دیں' کے بجائے 'کر لیں' میں معشوق سے زیادہ اپنا پن کا اظہار ہے اور ظاہر ہے 'رومان غم عشق' کی تکمیل تنہا نہیں ہو سکتی اس لیے 'کر دیں' کو بدل کر 'کر لیں' کر دینے سے شعر میں غزلیہ عنصر بڑھ گیا ہے۔ سلاست اور روانی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اعجاز صدیقی کی غزل پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

اعجاز صدیقی؎

کرتا ہوں ہر مقام پہ سجدے بایں امید　　شاید کہ مل ہی جائے ترا سنگِ در کہیں

اصلاح سیماب

〃　〃　〃　〃　〃　〃　شاید سر آشنا ہو ترا سنگِ در کہیں۲۶

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد مصرعہ ثانی فصیح اور بلیغ ہو گیا ہے 'سنگ در' کا 'سر آشنا ہونا' تغزل کی انتہا ہے۔

اعجاز صدیقی

ہنس تو رہے ہو سن کے مرا قصۂ الم　　رونا پڑے پھر اب نہ تمہیں عمر بھر کہیں

اصلاح سیماب

ہنس تو رہے ہو سن کے مرا قصۂ حیات　　رونا پڑے مگر نہ تمہیں عمر بھر کہیں۲۷

'قصۂ الم' کو 'قصۂ حیات' میں بدل دینا انتہا درجے کی استادی ہے اس لیے کہ 'الم' زندگی کا صرف ایک پہلو ہے اور 'حیات' میں پوری زندگی ہے جس میں سے ایک 'الم' بھی ہے۔ اصل شعر کے دوسرے مصرعے میں 'پھر اب' سے ایسا لگ رہا ہے کہ گویا رونے کا عمل پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اصلاح کے بعد اس کی جگہ 'مگر' لانے سے فعل آئندہ زمانے پر موقوف ہو گیا ہے اور انتباہ کا لہجہ پیدا ہو گیا ہے، یہی مناسب بھی ہے۔

اعجاز صدیقی

ڈر میرے پچھلی رات کے نالوں سے ہم نشیں　　چھو لے نہ بابِ عرش کو آہِ سحر کہیں

اصلاح سیماب

ہاں میرے پچھلی رات کے نالوں سے احتیاط　　چھو لے نہ بابِ عرش کو آہِ سحر کہیں ۲۸

'احتیاط' میں 'ڈر' کی بہ نسبت زیادہ بلاغت ہے۔ عاشق کا مقصود معشوق کو خوف زدہ کرنا نہیں کہ عشق میں اس کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس کو راضی کرنا ہے۔ اس لیے وہ احتیاط کی تلقین

کرتا ہے۔غزل میں عاشق مظلوم ہوتا ہے اور مظلوم کے نالے براہ راست عرش سے ٹکراتے ہیں۔

اعجاز صدیقی

دیر وحرم فریب ہیں اہل نگاہ کو ایسے میں ہو بھی جائیں وہ اب جلوہ گر کہیں

اصلاح سیماب

دیر وحرم سے یاس ہے اہل نگاہ کو کیا ہو اگر وہ ہونے لگیں جلوہ گر کہیں ۲۹

'دیر وحرم کا فریب ہونا' مستعمل نہیں ہے اور نہ ہی یہ عادت ہے۔'دیر وحرم سے یاس' اور آس وابستہ ہیں، اس لیے سیماب اکبر آبادی نے 'فریب' کو 'یاس' سے بدل دیا ہے کہ یہاں سے تو ناامیدی ہے۔اگر آپ کی جلوہ گری ہو تو شاید کچھ بات بن جائے۔

جناب بابو محمد صغیر آثر صدیقی اکبر آبادی کی غزل پر سیماب اکبر آبادی کی اصلاح

آثر صدیقی

چھپ کے پردے میں جو چمکا رخ روشن ان کا دیکھتی رہ گئی منھ آج تو چلمن ان کا

اصلاح سیماب

" " " " " متحیر ہوئی منھ دیکھ کے چلمن ان کا ۳۰

'دیکھتے رہ جانا' اور 'متحیر ہونا' میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔تحیر دونوں میں ہے۔البتہ غزل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سیماب اکبر آبادی نے 'دیکھتی رہ گئی' کو 'متحیر ہونا' سے بدل دیا ہے۔دوسری بات اصلاح کی اصل وجہ 'آج تو' ہے۔'آج تو' کی وجہ سے مفہوم یہ نکل رہا ہے کہ معشوق نے آج پہلی بار پردہ کیا یا پردے کا سامنا کیا۔دوسرا یہ کہ معشوق کے رخ روشن میں آج کوئی نرالی بات تھی۔یہ دونوں ہی باتیں معشوق کے درجے کے منافی تھیں۔سیماب کی اصلاح سے دونوں ہی باتیں ختم ہوئیں۔

آثر صدیقی

راز جلووں کا ذرا طور سے پوچھوں تو سہی　　　کچھ بتا دے گی پتہ وادیٔ ایمن ان کا

اصلاح سیماب

ان کی خلوت ہے کہاں طور سے پوچھوں تو سہی　　　کچھ نہ کچھ دے گی پتہ وادی ایمن ان کا ۳۱

'طور' اور 'وادی ایمن' سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف ہے۔ اس واقعہ کو جس انداز میں بھی پیش کر سکتے ہیں مگر حقیقت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیے اور شان کبریائی میں گستاخی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے طور پر موسیٰ علیہ السلام کے لیے جو جلوہ نمائی کی اس کا راز طور سے پوچھنا ایک شاعرانہ انداز ہو سکتا ہے اور اسے شاعر کا تخیل کہہ سکتے ہیں لیکن ان کے وجود کو طور سے دریافت کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔ اللہ رب العالمین کے لیے نہ خلوت ہے، نہ جلوت، ان کا وجود ہر جگہ اور ہر مقام پر ہے وہ خلوت میں بھی ہے اور جلوت میں بھی ہے۔ اس لیے صرف خلوت کے بارے میں سوال مناسب نہیں، چاہے وہ شاعر کا تخیل ہی کیوں نہ ہو اس لیے پہلے مصرع میں اصلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ دوسرے مصرعے میں اصلاح سے خوبصورتی آ گئی ہے۔

آثر صدیقی

آرزو یہ ہے کہ یوں جاؤں میں پیش داور　　　لب پہ کلمہ ہو مرے ہاتھوں میں دامن ان کا

اصلاح سیماب

آرزو یہ ہے کہ یوں حشر میں فریاد کروں　　　لب پہ ہو نام خدا ہاتھ میں دامن ان کا ۳۲

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح اپنی جگہ درست ہے۔ یہاں دامن سے مراد معشوق کا دامن ہے، بلکہ معشوق کا دامن ہاتھ میں لینے کی بات ہے۔ معشوق نے دنیا میں جو ظلم کیا ہے اسی کی فریاد میدان حشر میں خدا سے کی جائے گی۔

آثر صدیقی

رات کالی ہے کہ ہے زلفِ سیہ کا سایہ مہِ انور ہے کہ ہے عارضِ روشن ان کا

اصلاح سیماب

عالم شب ہے کہ ہے زلفِ سیہ کا سایہ مہِ انور ہے کہ ہے عارضِ روشن ان کا ۳۳

یہاں پر 'زلف سیہ' کے سائے کو 'رات کالی' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رات کہنے سے کام چل جاتا ہے۔ رات چاندنی بھی ہوتی ہے۔ لیکن جب زلف کی بات آ گئی تو رات کے لیے 'کالی' کا اختصاص ضروری نہیں تھا۔ اس لیے اس شعر میں کالی محض برائے بیت اور حشو ہے۔ اور سیماب نے 'عالم' کا لفظ رکھ کر مصرعے کو بلیغ بنا دیا ہے۔ 'عالم شب' لاجواب اصلاح ہے۔ دوسری بات کالی رات اب اور بھی لایعنی ہے 'زلف سیہ' چہرے پر ہوتی ہے اور معشوق کے عارض یا چہرہ 'مہ انور' ہوتا ہے، روشن ہوتا ہے۔ اب زلف اور عارض کے ایک ساتھ نظارے پر جو سماں بنے گا وہ 'عالم شب' کا ہی ہوگا۔ عالم شب میں بدر کامل، مہ انور، ستاروں، سیاروں اور سیاہی سبھی کی گنجائش ہے جبکہ 'کالی رات' میں ان سب کی گنجائش نہیں ہے۔

آثر صدیقی

حور کا لطف آثر ملتا ہے زانو سے مجھے مجھ کو جنت کی ہوا دیتا ہے دامن ان کا

اصلاح سیماب

نیند آ جائے آثر کیوں نہ ہمیشہ کے لیے مجھے دیتا ہے ہوا خلد کی دامن ان کا ۳۴

سیماب نے اصلاح بجا طور پر دی ہے۔ حور کا لطف معشوق کے زانو پر ملنے لگے یہ معشوق کی توہین ہے۔ اور غزل کی رسومیات و آداب کے بھی خلاف ہے۔ اس میں تو حوریں بھی ٹھکرا دی جاتی ہیں۔ بھلا حور کیا معشوق کے آگے۔

سید محمد موسیٰ اخگر سہسرامی کی غزل پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

اخگر سہسرامی

جو ذرّہ قسمتوں سے پائمالِ ناز ہوتا ہے   زمانے کی نگاہوں میں وہی ممتاز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

مقدر ہے جو ذرّہ ناز ہوتا ہے   زمانے کی نگاہوں میں وہی ممتاز ہوتا ہے ۳۵

مقدر اور قسمت ایک ہے البتہ قسمت کا بطور جمع استعمال کھٹک رہا ہے، شاید اسی لیے سیماب اکبرآبادی نے 'قسمت' کو 'مقدر' سے بدل دیا ہے۔

اخگر سہسرامی

مری وحشت طرازی پر ابھی ہنستے ہیں ہنسنے دو   وہ کیا جانیں جنوں میں دل کا کیا انداز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

مری وحشت پر اہلِ ہوش اگر ہنستے ہیں ہنسنے دو   وہ کیا جانیں جنوں میں دل کا کیا انداز ہوتا ہے ۳۶

'وحشت طرازی پر ہنسنے والا واضح نہیں تھا کہ کیوں ہنستا ہے۔ اصلاح کے بعد اس کی وضاحت ہوگئی۔ دوسری بات یہ کہ 'ابھی' کو 'اگر' سے بدل دینے سے مصرع سلیس ہوگیا ہے اور روانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے شعر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا ہے اور مفہوم واضح ہوگیا ہے۔

اخگر سہسرامی

فضائیں کاروانِ برق سے معمور ہوتی ہیں   تبسم ریز جب ان کا لب اعجاز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

فضائیں پارہ ہائے برق سے معمور ہوتی ہیں   تبسم ریز جب ان کا لب اعجاز ہوتا ہے ۳۷

'برق' کی مناسبت سے 'پارہ' کا استعمال خوب ہے۔ 'کاروانِ برق' کچھ خاص نہیں۔ فضاؤں میں پارہ کا بھرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ 'کاروانِ برق' سے فضاؤں کا بھرنا خلاف عادت معلوم ہوتا ہے۔ سیماب کی اصلاح کے بعد مصرع میں لفظی اور معنوی مطابقت بھی

پیدا ہوگئی ہے۔

اخگر سہسرامی

گلے میں طوق، کڑیاں ہاتھ میں، پاؤں میں زنجیریں ترے وحشی کا زنداں میں بڑا اعزاز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

گلے میں طوق، کڑیاں ہاتھ میں، اور پاؤں میں بیڑی ترے وحشی کا زنداں میں بڑا اعزاز ہوتا ہے ۳۸

طوق، کڑی، زنجیر اور بیڑی سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ 'زنجیر' کو 'بیڑی' سے بدلنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اخگر سہسرامی کا مصرع تین ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا۔ 'زنجیریں' جو جمع استعمال ہوا تھا اسے 'بیڑی' سے بدل دیا گیا جو واحد ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زنجیریں دیوانوں کو بھی پہنائی جاتی ہیں لیکن دیوانے زنداں میں نہیں ڈالے جاتے اور قیدیوں کو بیڑی ڈالی جاتی ہے اور قیدی زنداں میں ڈالے جاتے ہیں۔ لہٰذا 'زنداں' کی مناسبت سے 'بیڑی' کا لفظ خوب ہے۔

اخگر سہسرامی

مری دل سوز آہیں حاصلِ صد کیف ہوتی ہیں کوئی بیٹھا ہوا جب دل میں نغمہ ساز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

ترنم پھوٹ پڑتا ہے مری دل سوز آہوں سے کوئی بیٹھا ہوا جب دل میں نغمہ ساز ہوتا ہے ۳۹

بات اگر سیدھے طور سے کہی جائے تو اس میں بلاغت زیادہ ہوتی ہے اور مفہوم بھی واضح ہوجاتا ہے۔ اخگر سہسرامی کا مصرع براہ راست نہیں تھا۔ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد مصرع تو بدل دیا گیا ہے مگر مفہوم وہی ہے اور یہ صاحب اصلاح کی ایک بڑی خوبی ہے۔

اخگر سہسرامی

بہت ملتے ہیں ساتھی یوں تو دنیا میں مگر اخگر مصیبت میں نہیں اپنا کوئی دم ساز ہوتا ہے

اصلاح سیماب

مصیبت میں کسی کا کوئی کب دم ساز ہوتا ہے ؎ ۴۰

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح سے مصرع میں عمومیت آ گئی ہے۔ اپنے بیگانے کی قید ختم ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے شعر کسی خاص شخص یا مقام کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ وقت اور زمانے کے قید سے پرے ہوتا ہے اور یہ بات اسی وقت آئے گی جب اس کے الفاظ اور بندش میں عمومیت ہو' کسی کا کوئی کب' زیادہ فصیح ہے' اپنا کوئی' کے مقابلے میں۔ دوسری بات اصل شعر میں' اپنا' سے مراد متکلم ہے۔اور اگر' اپنا' بمعنیٰ' بیگانہ' کی ضد لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو' اپنے' نہیں' بیگانے' ہوں وہ' دم ساز' ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے' مصیبت' میں کمی آئے گی اور دنیا اتنی ظالم یا بے درد نہیں ہوگی جتنا کہ شاعر کو مقصود ہے۔ لہٰذا' کسی کا کوئی' کی اصلاح نے شعر کے معنوی حسن میں اضافہ کیا اور بلیغ بھی بنا دیا۔ مفہوم بھی وہی ہے جو شاگرد کہنا چاہ رہا تھا۔

سیٹھ عبدالکریم صاحب اختر کی غزل پر سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

عبدالکریم اخترؔ

اچھے لوگوں کی ہوا کرتی ہے عادت اچھی   کچھ سکھا دیتی ہے انسان کو صحبت اچھی

اصلاح سیمابؔ

کچھ بنا دیتی ہے انسان کو صحبت اچھی ؎ ۴۱

صحبت میں بننا، بگڑنا زیادہ فصیح ہے اور زیادہ مستعمل بھی ہے۔ شاید اسی وجہ سے سیماب نے' سکھانے' کو' بنانے' سے بدل دیا ہے۔ اصلاح کے بعد شعر میں لفظی اور معنوی مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔

عبدالکریم اخترؔ

قدر ہر ایک کو ہوتی ہے خوشی کی غم میں   رنج کے بعد میسر ہو وہ راحت اچھی

اصلاح سیمابؔ

رنج کے بعد جو حاصل ہو وہ راحت اچھی ۴۲

دراصل عشق میں رنج وغم اور پریشانی کو خوشی اور راحت پر برتری حاصل ہے کیونکہ اس میں عاشق کو لطف آتا ہے۔اس میں خود بخود مل جانے والے غم کی بہ نسبت معشوق کی طرف سے ملنے والے غم کو زیادہ اہمیت ہے کہ اس میں عاشق پر لذت راحت اور سکون دل ہے۔اس لیے سیماب اکبرآبادی نے 'میسر' کو 'حاصل' میں جو بھی اور جتنا بھی کا پہلو غالب ہے، جبکہ عشق میں ایسا نہیں ہے۔

عبدالکریم اختر

مثل شمع نہیں کہتا ہوں میں کچھ حالتِ دل خاموشی میں ہی مجھے ملتی ہے راحت اچھی

اصلاح سیماب

شمع کی طرح میں کہتا نہیں کچھ حالتِ دل خامشی میں مجھے مل جاتی ہے راحت اچھی ۴۳

اپنی حالت کو شمع سے تعبیر کرنا خوبصورت تشبیہ ہے۔شعر میں روانی اور سلاست کی کمی تھی جو اصلاح کے بعد دور ہوگئی ہے۔

عبدالکریم اختر

رنج و راحت میں ہیں ہم صابر و شاکر اختر فضلِ حق سے ہے ملی ہم کو طبیعت اچھی

اصلاح سیماب

فضلِ خالق سے ملی ہم کو طبیعت اچھی ۴۴

دوسرے مصرعے میں 'ہے' زائد تھا جس کی وجہ سے مفہوم واضح نہیں ہو رہا تھا اور پڑھنے میں بھی رکاوٹ آرہی تھی۔سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد مصرع میں روانی آگئی اور ایک عیب بھی دور ہوگیا۔

جناب اکبر اسمٰعیل اکبر مدنی کی غزل پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

اکبر مدنی

کیوں نہ میخواروں کو بھائے میکدہ　　　کیف آور ہے ہوائے میکدہ

اصلاح سیماب

کیوں نہ دلکش ہو فضائے میکدہ　　　ہو گئے دل سے فدائے میکدہ[۴۵]

اصلاح سے قبل پہلے مصرع میں خوبصورتی اور دلکشی کی کمی تھی۔ دونوں مصرعے میں لفظی ارتباط نہیں تھا اصلاح کے بعد لفظی اور معنوی دونوں طرح کا ربط پیدا ہو گیا ہے۔ ایک اور پہلو جو قابل غور ہے وہ یہ کہ شاعر نے میکدے کی فضا کو 'میخواروں' کے لیے 'کیف آور' بتایا تھا جبکہ اصلاح کے بعد عمومیت آ گئی ہے اور ظاہر ہے شرابیوں کے لیے 'دلکش فضا'، 'میکدہ' میں ہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے میخواروں کو تو 'میکدہ' بھائے گا ہی، لیکن میکدے کا امتیاز تو اس وقت قائم ہوگا جب یہ فضا انہیں بھی بھائے جو مے خوار نہیں، زاہد و پارسا ہیں۔

اکبر مدنی

سن کے مفتی ذکر ہائے میکدہ　　　ہو گئے دل سے فدائے میکدہ

اصلاح سیماب

سن کے مفتی نعرہ ہائے میکدہ　　　ہو گئے دل سے فدائے میکدہ[۴۶]

ذکر سے ذہن ذکر خدا اور ذکر رسولؐ کی جانب جاتا ہے اور اگر مفتی کے ساتھ ذکر کا استعمال ہو تو بجا طور پر یہی سمجھا جائے گا۔ اسی لیے سیماب اکبر آبادی نے 'ذکر ہائے میکدہ' کو 'نعرہ ہائے میکدہ' میں بدل دیا ہے تا کہ ذکر خدا اور ذکر رسول کا تقدس پامال نہ ہو۔

اکبر مدنی

کیا چلی ایسی ہوائے میکدہ　　　جس کو دیکھو ہے فدائے میکدہ

اصلاح سیماب

چل گئی ایسی ہوائے میکدہ   میکدہ خود ہے فدائے میکدہ ۴۷

'کیا چلی ایسی' کی ترکیب درست نہیں۔اس سے مصرع میں سقم لازم آ رہا تھا اس لیے اصلاح ضروری تھی۔میکدہ کا میکدہ پر ہونا کیا خوب ترکیب ہے۔حالانکہ 'چل گئی' کے بعد اگر دوسرا مصرع اپنے حال پر برقرار رہتا تب بھی شعر درست ہوتا اور مفہوم بھی واضح تھا۔

اکبرمدنی

میں وہ میکش ہوں کہوں گر العطش   اٹھ کے اپنی جا سے آئے میکدہ

اصلاح سیماب

حوض کوثر بن کے آئے میکدہ ۴۸

اصلاح کی اصل وجہ 'العطش' ہے۔اور 'العطش'، 'میکش' کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔میں یہاں یہ بات بھی واضح کردوں کہ یہاں میکدے کو حوض کوثر سے تشبیہ نہیں دی گئی ہے بلکہ حوض کوثر کو میکدہ تصور کیا گیا ہے۔دراصل یہاں کچھ اس قسم کی بات ہے۔

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اکبرمدنی

مطرب و ساقی جو دیں تحریک تو   مست ہو کر جھوم جائے میکدہ

اصلاح سیماب

مطرب و ساقی جو ہوں گرم نوا   مست ہو کر جھوم جائے میکدہ ۴۹

اکبرمدنی

نور کی جب چھا گئی زریں گھٹا   جگمگا اٹھی فضائے میکدہ

اصلاح سیماب

جب اڑی مینائے زرّیں سے شراب   مست ہو کر جھوم جائے میکدہ ۵۰

اصلاح سے قبل پہلا مصرع 'نور کی زریں گھٹا' محض لفاظی تھا۔اور جب نور کی گھٹا چھا

رہی ہے تو دوسرے مصرعے میں محض 'فضائے میکدہ' کیوں جگمگا رہی ہے؟ اور اگر یہ نور کی گھٹا صرف میکدہ پر محیط ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ مصرعوں میں ربط بالکل نہیں ہے۔اب سیماب کی اصلاح پر غور کرتے ہیں۔شراب میں چمک، روشنی اور نور کا پایا جانا مسلمات میں سے ہے۔شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شعر ملاحظہ ہو:

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی

اس لیے اصلاح بالکل درست اور ضروری تھی۔

جناب عبدالحمید صاحب برق صدیقی فتح پوری کی غزل پر سیماب کی اصلاح

برق صدیقی

اے تجلی ازل رہنے دے بے پردا نہ ہو فائدہ ہی کیا جب ارماں دید کا پورا نہ ہو

اصلاح سیماب

اے تجلی نہاں رہنے دے بے پردا نہ ہوا، جلوہ بے معنی جب ارماں دید کا پورا نہ ہو

'دید' کی مناسبت سے 'جلوہ کا استعمال خوب ہے' فائدہ' ذرا ہلکا لفظ ہے اور اس میں دنیوی لذت کے معنی پنہاں ہیں اس لیے اصلاح ضروری تھی۔ دوسری بات یہ کہ معشوق کا پردے میں رہنا ہی عشق کی زندگی ہے اور عاشق کے لیے لذت حاصل کرنے کا ذریعہ۔وصل یا دید انتہائے عشق ہے اس لیے اس کی تمنا عاشق نہیں کرتا بلکہ اس کو ہمیشہ کل پر ٹالتا رہتا ہے اور یہ عشق جب حقیقی ہو تو چاہت اور بڑھ جاتی ہے اور بندہ حصول عشق کی خاطر اس کے ہر حکم کو بجا لانے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اس کی تکمیل ہو سکے اس لیے 'تجلی ازل' کے بجائے 'تجلی نہاں' زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

برق صدیقی

بادیہ پیما ہوتو کیا خاک ہو پائے جنوں   جب بحدّ شوق وحشت وسعتِ صحرا نہ ہو

اصلاح سیمابؔ

بادیہ پیمائی کا کیا لطف اے پائے جنوں   جب بحدّ شوق وحشت وسعتِ صحرا نہ ہو۵۲؎

برقؔ صدیقی کا پہلا مصرع ذرا پیچیدہ تھا۔ اصلاح کے بعد اس میں سلاست اور روانی آ گئی ہے۔ 'بادیہ پیما' کے بجائے 'بادیہ پیمائی' میں زیادہ بلاغت ہے۔

برقؔ صدیقی

احتیاطاً نذر کو کچھ لے کے چلنا چاہیے   پوچھ بیٹھیں وہ کہ کیا لائے کہیں ایسا نہ ہو

اصلاح سیمابؔ

احتیاطاً خاک دل کی لے چلیں ہم بہرِ نذر   وہ کہیں کیا ساتھ لائے ہو کہیں ایسا نہ ہو۵۳؎

کبھی کبھی اصلاح کے بعد شعر کا مفہوم زمین سے آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ سیماب کی اصلاح کے بعد اس شعر میں ایسا ہی ہوا ہے۔ برقؔ صدیقی کا شعر مبہم تھا اس میں کیا لے کر جائیں گے اس کی وضاحت بھی نہیں تھی۔ اصلاح کر کے اس کی وضاحت کر دی گئی اور بہت بہتر طریقے سے کی گئی ہے۔ عشق میں دل کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ اس لیے معشوق کے حضور میں 'خاک دل' سے بڑا انذرانہ نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ کہ برقؔ صدیقی نے 'لے کر چلنا چاہیے' کی بات کر رہے تھے جب کہ اصلاح کے بعد 'لے چلیں' کی تاکید ہے۔ یعنی خاک دل ہی لے کر چلیں۔ اس میں اگر مگر کی کیفیت نہیں ہے اور نہ ہی کیا کا سوال ہے۔

جناب عبدالحفیظ ثمرؔ صدیقی چھپروی بی اے کی غزل پر سیماب کی اصلاح

ثمرؔ صدیقی

جوز ورآور کبھی انسان کی تقدیر ہوتی ہے   معاً بیٹھے بٹھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

اصلاح سیمابؔ

نشاط انگیز جب انسان کی تقدیر ہوتی ہے   تو خود بیٹھے بٹھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے ۵۴

اصلاح کے بعد شعر میں سلاست آ گئی ہے۔ 'تقدیر کا زور آور' ہونا بہت کم مستعمل ہے حالانکہ 'نشاط انگیز' بھی محل نظر ہے۔ مگر یہ 'زور آور' سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'معاً' کا استعمال غیر فصیح تھا۔ اس لیے اسے 'خود' سے بدل دیا گیا ہے۔

ثمر صدیقی

حصول مدعا میں رائیگاں تدبیر ہوتی ہے   امور دنیوی کی کارکن تقدیر ہوتی ہے

اصلاح سیماب

〃 〃 〃 〃 〃   یہ دنیا ہے یہاں تو کارکن تقدیر ہوتی ہے ۵۵

'امور دنیوی' کے مقام پر 'یہ دنیا ہے' بہت بہتر استعمال ہے۔ اس سے مفہوم بالکل واضح اور صاف ہو گیا ہے۔

ثمر صدیقی

جہاں کو سوزِ فرقت سے جلا کر خاک کر دیتا   محبت ہی مگر رہ رہ کے دامن گیر ہوتی ہے

اصلاح سیماب

جہاں کو سوز سے اپنے جلا کر خاک کر دیتا   مگر اک مصلحت رہ رہ کے دامن گیر ہوتی ہے ۵۶

'سوز سے جلا کر خاک کر دینا' بہت خوبصورت فقرہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'محبت' کے بجائے 'مصلحت' کا استعمال انتہائی بلیغ ہے۔

ثمر صدیقی

جہاں کے ذرہ ذرہ کو جو دیکھو چشم بینا سے   نہاں ہر شکل وصورت میں کوئی تقدیر ہوتی ہے

اصلاح سیماب

جہاں کا ذرہ ذرہ عکس ہے ذات الٰہی کا   بہر صورت ہر اک صورت میں اک تصویر ہوتی ہے ۵۷

اصلاح کے بعد شعر نہایت فصیح اور بلیغ ہو گیا ہے۔ سلاست اور روانی آ گئی ہے۔ جہاں کے ہر ذرہ کو دیکھ پانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح ضروری تھی تا کہ لفظی اور معنوی مناسبت پیدا ہو سکے۔

جناب شہزادہ آغا زاحمد سیر صاحب حیرتؔ درّانی کی غزل پر سیماب کی اصلاح

حیرتؔ درّانی

پھر دل ہوا ہے سلسلہ جنبان آرزو   پروردگار تو ہے نگہبان آرزو

اصلاح سیماب

پھر دل ہے اور شورش طوفان آرزو   پروردگار تو ہے نگہبان آرزو۵۸؎

سیماب اکبرآبادی نے بہت عمدہ اصلاح کی ہے۔ پورا مصرعہ بدلنے کے بعد بھی مفہوم وہی ہے۔ اصلاح سے قبل مصرعہ جتنا بوجھل تھا اصلاح کے بعد اتنا ہی ہلکا اور آسان ہو گیا ہے۔ دراصل شعر میں اضافت کا کثرت استعمال شعر کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ اس سے شعر کی خوبصورتی تو کم ہوتی ہی ہے، پڑھنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ 'سلسلہ جنبان آرزو' اس کی ایک مثال ہے۔

حیرتؔ درّانی

اب ہم ہیں اور سکون کی پر کیف راحتیں   کیا ترک آرزو ہی تھا درمانِ آرزو

اصلاح سیماب

〃 〃 〃 〃   تھا آرزو کا ترک ہی درمانِ آرزو۵۹؎

اصلاح ضروری تھی اس لیے کہ دوسرے مصرعے میں تعقید تھی جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ختم ہونے کے بعد مصرعے میں بلاغت اور فصاحت دونوں آ گئی ہے۔ مصرع سلیس ہو گیا ہے اور مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے۔ دوسری بات اصل شعر میں 'کیا' بے موقع

تھا۔ جبکہ اصلاح شدہ شعر میں 'آرزو کے ترک' کی قطعیت ہی مطلوب ہے۔

حیرتؔ درّانی

مشقِ تصورات جمالِ لطیف سے روشن ہوئی ہے میری شمع شبستانِ آرزو

اصلاح سیماب

مشقِ تصورات کی لو سے شبِ فراق روشن ہوئی ہے شمع شبستانِ آرزو ۶۰

'مشقِ تصورات کی لو سے شب فراق' بہت خوبصورت مصرع ہے۔ اصلاح سے قبل کا مصرع کچھ خاص نہیں تھا۔ بہت ہلکا اور معمولی تھا۔ اصلاح کے بعد ہر اعتبار سے مصرعے میں وزن پیدا ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھی لفظی اور معنوی دونوں مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ لو، روشنی، شمع، شبستان مراعات النظیر کی عمدہ مثال ہے۔

حیرتؔ درّانی

پھر دل میں لے رہا ہے مرے چٹکیاں کوئی اٹھنے کو ہے مگر کوئی طوفانِ آرزو

اصلاح سیماب

" " " " " " " پھر ہو رہی ہے بارش طوفانِ آرزو ۶۱

اصلاح سے قبل دوسرے مصرعے میں تعقید تھی۔ اصلاح کے بعد مصرع سلیس ہو گیا ہے اور مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے۔

مولوی نصیر الدین حیدرؔ کی غزل پر مولانا سیماب اکبر آبادی کی اصلاح

نصیر الدین حیدرؔ

جزاک اللہ قاتل نے کیا سر کو جدا تن سے خوشا بخت رسا ہلکا ہوا کچھ بار گردن سے

اصلاح سیماب

" " " " " " خوشا بخت رسا اترا یہ بھاری بوجھ گردن سے ۶۲

استاد استاد ہوتا ہے۔ وزن اور بحر دونوں ٹھیک مفہوم بھی واضح ہے مگر لفظوں کی معمولی تبدیلی نے شعر کو لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اصلاح سے قبل اصل شعر میں تن پر سر ایک بوجھ تھا۔ جب قاتل نے سر کو تن سے جدا کر دیا تو بوجھ تو پورا اتر گیا۔ پھر ہلکا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ ہلکا ہونے کا تو یہ مطلب ہوا کہ ابھی کچھ بوجھ گردن پر ہے۔ جبکہ سر الگ ہو چکا ہے تو بوجھ تو سرے پر رہا ہی نہیں۔ سیماب اکبر آبادی کی اصل اصلاح کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے، نہ کہ کم زیادہ استعمال۔ بوجھ ہلکا ہونا اور بوجھ اترنا دونوں بامحاورہ ہیں مگر محل استعمال جدا جدا ہے۔ یہاں 'اترنے' کا محل ہے۔

نصیر الدین حیدرؔ

محبت غالباً پیدائشی انساں میں ہوتی ہے بیاں کرتے ہیں مجنوں عاشق لیلیٰ تھا بچپن سے

اصلاح سیمابؔ

محبت غالباً پیدائشی جوہر ہے انساں کا روایت ہے کہ مجنوں عاشق لیلیٰ تھا بچپن سے۶۳؎

محبت اور نفرت انسان کی فطرت ہے۔ انسانی شعور میں بالیدگی کے ساتھ ان میں بھی اضافہ ہوتا ہے یا کمی آتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے جو جاری رہتا ہے۔ سیماب اکبر آبادی کی اصلاح کے بعد مصرعے میں بیان کا جوہر نکھر کر سامنے آ گیا ہے اور اپنے انداز پیش کش کی وجہ سے ایک معمولی سی بات بڑی معلوم ہو رہی ہے۔

نصیر الدین حیدرؔ

مسلسل برق باری سے میں پہنچا اس نتیجہ پر سوائے سعی لاحاصل نہیں حاصل ہے خرمن سے

اصلاح سیمابؔ

〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 نہیں حاصل بجز بے حاصلی کچھ اور خرمن سے۶۴؎

'خرمن' پر مسلسل 'برق باری' سے یہ نتیجہ نکالنا کہ 'بے حاصل' کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا

ایک شاعرانہ تخئیل ہے۔ اصلاح سے قبل مصرع بہت بوجھل اور پڑھنے میں ثقیل تھا اصلاح کے بعد سلیس اور بلیغ ہو گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو شاگرد کا دوسرا مصرع زیادہ رواں ہے مگر اس میں عیب یہ تھا کہ ردیف 'سے'، 'ہے' میل نہیں کھاتی اور 'سعی' کا لفظ بھرتی کا لفظ ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سیماب کی اصلاح کے بعد یہ عیب دور ہو گئے۔

نصیرالدین حیدرؔ

سمجھ کر خون جس کو دھو رہے ہیں مرے دامن سے　　　　یہی دھبے حیات عشق کی ساری کمائی ہے

اصلاح سیماب

سمجھ کر خون جس کو دھو رہے ہو مرے دامن سے ۶۵　　　　یہی دھبے حیات عشق کی کچھ یادگاریں ہیں

'حیات عشق کی ساری کمائی' کو 'عشق کی یادگار' سے تعبیر کرنا انتہائی بلیغ ہے۔ اصلاح سے مصرع کے ساتھ شعر کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اور دوسرے مصرعے سے مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ 'دھبے' نشان کو کہتے ہیں اور کسی چیز کی نشان یادگار ہو سکتی ہے اسے کمائی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

نصیرالدین حیدرؔ

جو ٹکڑا رہ گیا تھا ہاتھ میں یوسف کے دامن سے　　　　زلیخا سے کوئی پوچھے کہ کیا قسمت سمجھتی تھی

اصلاح سیماب

جو ٹکڑا رہ گیا تھا ہاتھ میں یوسف کے دامن سے ۶۶　　　　زلیخا سے کوئی پوچھے کہ وہ اس کی کیا بہا سمجھی

اصل میں پہلے مصرع میں 'قسمت' بھلا نہیں معلوم ہو رہا۔ یہ 'قسمت' کا محل بھی نہیں۔ ہاتھ میں رہ جانے والا ٹکڑا معشوق کے دامن کا ہے۔ لہٰذا یہاں عاشق کے نزدیک اس ٹکڑے کی قدر و قیمت کا سوال پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا 'بہا' کا لفظ نہایت مناسب ہے جس کی وجہ سے شعر بھی چست اور بڑی بلندی پر پہنچ گیا۔

نصیرالدین حیدرؔ

موحد ہیں خدا کو ہر جگہ ہم ڈھونڈ سکتے ہیں　　　ہمیں کیا واسطہ ہے قصۂ شیخ و برہمن سے

اصلاح سیمابؔ

موحد ہیں خدا کو ہر جگہ ہم ڈھونڈ لیتے ہیں　　　ہمیں کیا واسطہ ہے قصۂ شیخ و برہمن سے ۶۷؎

'موحد ہیں' تو پھر 'سکتے' کا استعمال کیوں؟ اس لیے اصلاح ضروری تھی۔ 'سکتے' کو 'لیتے' سے بدل دینے سے مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے اور موحد کا ایمان بھی سلامت رہ گیا ہے۔

منشی غلام محی الدین خادمؔ بھڑوچی کی غزل پر سیماب کی اصلاح

خادمؔ

برق کو شوق ہے جلانے کا　　　ہے خدا حافظ آشیانے کا

اصلاح سیماب:

〃 〃 〃 〃　　　اب خدا حافظ آشیانے کا ۶۸؎

خادمؔ کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرے آشیانے کا حافظ خدا ہے۔ 'برق کو جلانا ہے تو جلائے' سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اب تک آشیانے کا حافظ میں تھا۔ جب بجلیاں جلانے جا رہی ہیں تو میں اس کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ جب کہ ہر کسی کا حافظ اور مالک حقیقی ہمیشہ اللہ ہے اور رہے گا۔

کبھی کبھی خدا حافظ کا استعمال ناامیدی کے لیے بھی ہوتا ہے یعنی کسی سامان سے ہاتھ دھو لینے یا اس کے چھن جانے کا جب خوف بالیقیں ہو جاتا ہے تو ہم خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ مذکورہ اصلاح شدہ شعر میں یہ مفہوم بھی نکل کر سامنے آتا ہے۔

خادمؔ

کیا کہوں حال ہم نشیں تجھ سے　　　دفعتاً دل کسی پہ آنے کا

اصلاح سیماب؎

آہ وہ لمحہ، آہ وہ منظر　　دفعتاً دل کسی پہ آنے کا ۶۹؎

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر کا وزن بڑھ گیا ہے اور جذبے میں بلندی آ گئی ہے۔

خادمؔ؎

ایک بوسہ ہی کاش مل جاتا　　مجھ کو جاناں کے آستانے کا

اصلاح سیماب؎

آسمان وزمیں کا چکر ہے　　ایک طواف ان کے آستانے کا ۷۰؎

خادمؔ؎

رنج واندوہ و یاس سے لبریز　　ہر ورق ہے مرے فسانے کا

اصلاح سیماب؎

دفترِ کائناتِ رنگارنگ　　اک ورق ہے مرے فسانے کا ۷۱؎

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ 'فسانے' کو 'دفترِ کائنات' سے تشبیہ دینا شاعر کا کمال ہے۔ خادمؔ کے مصرعے میں اختصاص تھا، رنج اندوہ، یاس، مگر سیماب اکبرآبادی نے اسے عام کر دیا۔ 'رنگارنگ' میں سبھی باتیں شامل ہو گئی ہیں اور اس پر کمال یہ کہ 'ہر ورق' کے بجائے اسے 'اک ورق' قرار دیا ہے۔

خادمؔ؎

نہیں مخصوص حسن پر خادمؔ　　ہے عجب ڈھنگ دل کے آنے کا

اصلاح سیماب؎

منحصر حسن پر نہیں خادمؔ　　ہے عجب ڈھنگ دل کے آنے کا ۷۲؎

یہ بات سچ ہے کہ دل کے آنے کا مدار صرف حسن نہیں ہے۔ دل کسی پہ بھی آ سکتا ہے۔
ایک شاعر کا شعر ہے:

محبت امتیاز حسن کی خوگر نہیں ہوتی	نظر میں جو سما جائے وہی محبوب ہوتا ہے

'نہیں مخصوص' کو 'منحصر' سے بدل دینے سے شعر میں خوبصورتی آ گئی ہے۔

محمد احمد صاحب رسوا وارثی سہارنپوری کی غزل پر سیماب کی اصلاح

رسوا وارثی

بکھرا ہے تار عالم ہستی کے ساز کا	اللہ حفیظ ہے نفسِ جانگداز کا

اصلاح سیماب

ٹوٹا ہے تار عالمِ ہستی کے ساز کا	حافظ ہے اب خدا نفسِ جانگداز کا[۳]

'اللہ حفیظ' کے بجائے 'اللہ حافظ' فصیح و بلیغ ہے۔ حالانکہ معنوی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ پہلے مصرع میں 'تار کا بکھرنا' اُتنا بلیغ نہیں جتنا 'تار کا ٹوٹنا' بلیغ ہے اور اس کی تائید دوسرے مصرعے میں مستعمل 'خدا حافظ' سے ہوتی ہے اس لیے کہ 'خدا حافظ' تبھی کہتے ہیں جب انسان کی اپنی تدبیر ناکام ہوتی نظر آتی ہے۔

رسوا وارثی

اٹھا ہی تھا حجاب نگہ امتیاز کا	رسوا جمال ہو گیا نظارہ ساز کا

اصلاح سیماب

اٹھا حجاب کیوں نگہ امتیاز کا	رسوا جمال ہو گیا نظارہ ساز کا[۴]

'اٹھا ہی تھا حجاب' کے بجائے 'اٹھا حجاب کیوں' سے مفہوم زیادہ واضح ہو رہا ہے اور شعر میں بھی روانی آ گئی ہے۔

رسوا وارثی

جز یک نفس نہیں مری ہستی کا گو وجود   سر بستہ راز ہوں میں حقیقت کے راز کا

اصلاح سیماب

"   "   "   "   "   لیکن میں راز ہوں کسی محبوب راز کا۵؎

'لیکن میں راز ہوں کسی محبوبِ راز کا' بہت عمدہ اصلاح ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا   میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اصلاح کے بعد مصرعے میں پہلے سے زیادہ روانی آ گئی ہے اور مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے۔

رسوا وارثی

عنوانِ صبح وصل ہے، تمہید شام غم   پردہ جہانِ حسن پہ زلفِ دراز کا

اصلاح سیماب

"   "   "   "   پردہ اس انجمن پہ ہے زلفِ دراز کا ۶؎

مصرع اولیٰ کی مناسبت سے 'انجمن' کی تشبیہ مناسب ہے۔ 'جہاں' کو 'انجمن' سے تعبیر کرنا انتہائی بلیغ ہے۔ اصلاح سے قبل مصرعے میں کچھ حد تک ابہام تھا جو اصلاح سے دور ہو گیا۔

رسوا وارثی

ہاں تجھ سے پوچھتا ہوں میں اے شانِ بے نیاز   یہ بھی کوئی جواب ہے میرے نیاز کا

اصلاح سیماب

ہاں تجھ سے پوچھتا ہوں میں اے جشنِ بے نیاز   کیا ناز ہی جواب ہے میرے نیاز کا ۷؎

رسوا کے شعر کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں نکل رہا تھا۔ بس لفظوں کا ایک خوبصورت مجموعہ تھا۔ سیماب کی اصلاح کے بعد اس میں مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ 'ناز' اور 'نیاز' کا بہت

خوبصورت استعمال ہوا ہے۔

رسوا وارثی۔

منہ دیکھتا ہے آئینہ آئینہ باز کا　　　لو، اٹھ گیا حجاب نگہِ امتیاز کا

اصلاح سیماب۔

منہ دیکھتا ہے آئینہ آئینہ ساز کا　　　لو، پردہ اٹھ گیا نگہِ امتیاز کا ۸ے

پہلے مصرع میں 'آئینہ باز' غیر مستعمل اور اس میں رکاکت ہے۔ 'آئینہ ساز' مستعمل اور فصیح ہے اور دوسرے مصرعے میں 'پردہ اٹھنا' زیادہ فصیح ہے 'حجاب اٹھانے' کے مقابلے میں۔ سیماب اکبرآبادی کی یہی وجہ اصلاح ہے۔

غلام احمد صاحب سلیم قریشی کی غزل پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

سلیم قریشی۔

مبتلا آپ کا محرومِ وصال اچھا ہے　　　اس کو تم سے بھی ترا حزن و ملال اچھا ہے

اصلاح سیماب۔

تیرا شیدا ہے محرومِ وصال اچھا ہے　　　اس کو تجھ سے بھی ترا حزن و ملال اچھا ہے ۹ے

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے مستحکم ہو گیا ہے۔ پہلے مصرع میں 'مبتلا آپ کا' مبہم تھا اسے 'تیرا شیدا' سے بدل دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں 'تم' کو 'تجھ' سے بدل کر 'ترا' سے مناسبت پیدا کر دی گئی ہے۔

سلیم قریشی۔

رحم آجائے انہیں بھی کہیں شاید آئیں　　　یہ نہ ہو عام کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اصلاح سیماب۔

رحم آجائے انہیں وہ کہیں شاید آجائیں　　　یہ نہ چرچا ہو کہ بیمار کا حال اچھا ہے ۸۰ے

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح درست ہے۔ کیوں کہ 'آئیں' کے بجائے 'آجائیں' زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'عام ہونا' سے زیادہ 'چرچا ہونا' میں بلاغت ہے۔ اصل میں 'چرچا' میں مثبت اور منفی دونوں پہلو شامل ہے اس لیے اسے 'عام' سے بدل دیا گیا ہے۔

سلیم قریشی؂

کر سکے ان کو نہ مائل ترے اشعار سلیم　　　　خاک جانیں کہ ترا طرز مقال اچھا ہے

اصلاح سیماب؂

〃　〃　〃　〃　〃　　کیا یقیں ہو کہ ترا طرز مقال اچھا ہے۸۱؎

مقطع کے آخری مصرعے میں 'خاک جانیں' کو 'کیا یقیں ہو' سے بدل دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے پہلے مصرع میں مطابقت ہوگئی ہے۔ اصلاح سے قبل دونوں مصرعے الگ الگ معلوم ہو رہے تھے۔

مہر لال صاحب سونی ضیاؔ فتح آبادی کی غزل پر سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

ضیاؔ فتح آبادی؂

کہوں کس سے کوئی سنتا نہیں جب داستاں میری　　　　مثالِ شمع محفل ہوں، نہیں کھلتی زباں میری

اصلاح سیماب؂

〃　〃　〃　〃　〃　　مثال شمع محفل بند رہتی ہے زباں میری۸۲؎

سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بعد شعر میں روانی اور سلاست آ گئی ہے۔ 'زبان کا بند رہنا' ایک محاورہ ہے جس سے مصرع میں خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے اور مفہوم پہلے سے زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

ضیاؔ فتح آبادی؂

شباب جاوداں میرا نہ دنیا جاوداں میری　　　　کسی دن گل کھلائیں گی یہی نادانیاں میری

اصلاح سیماب

جوانی جاوداں میری نہ دنیا جاوداں میری　　　　کسی دن مجھ کو کھودیں گی فنا سامانیاں میری ۸۳

'شباب' اور 'جوانی' حالانکہ ہم معنی ہیں۔مگر 'جاوداں' کے ساتھ 'جوانی' کی خوب مناسبت ہے۔ یہ سیماب اکبرآبادی کی ایک عمدہ اصلاح ہے۔اس شعر میں پہلے مصرعے اور دوسرے مصرعے میں معنوی طور پر مناسبت نہیں تھی۔ اصلاح کے بعد یہ کمی دور ہوگئی اور دونوں مصرعے آپس میں مربوط ہوگئے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں 'یہی نادانیاں' کون سی نادانیاں؟ شباب کا جاودانی نہ ہونا اور دنیا کا بھی جاوداں نہ ہونا، نادانی تو نہیں ہے۔ یہ تو انسان کے اختیار میں بھی نہیں۔ یہ تو دراصل 'فنا سامانی' ہے

گوربخش سنگھ صاحب مخمور جالندھری کی غزل پر سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

مخمور جالندھری

نہ روتے ہی کبھی دیکھا نہ ہنستے ہی کبھی پایا　　　　الٰہی آگ لگ جائے دلِ افسردہ ساماں میں

اصلاح سیماب

نہ رونا اس کا رونا ہے نہ ہنسنا اس کا ہنسنا ہے　　　　الٰہی آگ لگ جائے دلِ افسردہ ساماں میں ۸۴

بہت عمدہ اصلاح ہے۔ سیماب اکبرآبادی کی اس اصلاح نے ایک سپاٹ مصرع کو بامحاورہ بنادیا ہے۔'دل' اور 'افسردہ' کی مناسبت سے 'رونا' اور 'ہنسنا' کی ترکیب بہت خوب ہے۔

مخمور جالندھری

لگادیں آگ عالم میں تڑپ کر جو کبھی نکلیں　　　　وہ نغمے، اے مغنی! جذب ہیں سازِ رگِ جاں میں

اصلاح سیماب

لگادیں آگ عالم میں اگر بے پردہ ہوجائیں　　　　وہ نغمے، اے مغنی! جذب ہیں سازِ رگِ جاں میں ۸۵

'تڑپ کر نکلنے' کے بجائے 'بے پردہ ہونے' میں زیادہ تغزل ہے اور بیان کے اعتبار سے بھی بامحاورہ اور فصیح و بلیغ ہے۔ اس طرح اصلاح نے مصرع کو ہر اعتبار سے بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ دونوں مصرعوں میں باہمی ربط بھی پیدا ہو گیا ہے اور لفظی و معنوی مناسبت بھی۔

مخمورؔ جالندھری ؎

وہ نالہ کر کے اف میرا رہا ہونا قیامت تھا   کہ اک لرزش سی ہے اب تک در و دیوار زنداں میں

اصلاح سیماب ؎

فغاں کرتے ہوئے میرا رہا ہونا قیامت تھا   کہ اک لرزش سی ہے اب تک در و دیوار زنداں میں ۸۶؎

بہت خوبصورت اصلاح ہے۔ اس اصلاح نے مصرع میں چار چاند لگا دیا ہے۔ 'نالہ' اور 'فغاں' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ استعمال میں فرق ہے۔ مصرع میں اصلاح سے یعنی 'نالہ' کو 'فغاں' سے بدلنے سے مصرع خوبصورت ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ 'اُف' زائد معلوم پڑتا تھا مصرع سے خارج ہو گیا۔ اس سے شعر میں عمدگی آ گئی ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) مکاتیب سیماب اکبرآبادی: (ترتیب) ضیافتح آبادی، کلر پرنٹنگ پریس، دہلی، باراول ۱۹۸۱،ص۲۷

(۲) افتخارامام صدیقی: آگرہ اسکول: ایک تعارف (رسالہ 'شاعر' ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر) ۱۹۹۷،ص ۳۸

(۳) دستورالاصلاح: سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصرالادب، آگرہ، باراول ۱۹۴۰،ص ۴۱ تا ۴۶

(۴) ایضاً: ص ۳۸ تا ۴۰

(۵) رسالہ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷،ص، ۲۲۸

(۶) ایضاً: ص ۲۲۸

(۷) ایضاً: ص ۲۲۸

(۸) ایضاً: ص ۲۲۸

(۹) ایضاً: ص ۲۲۸

(۱۰) ایضاً: ص ۲۲۸

(۱۱) ایضاً: ص ۲۲۸

(۱۲) ایضاً: ص ۲۲۸

(۱۳) رسالہ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷،ص، ۲۳۲

(۱۴) ایضاً: ص ۲۳۲

(۱۵) ایضاً: ص ۲۳۲

(۱۶) ایضاً: ص ۲۳۲

(۱۷) رسالہ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷،ص، ۲۳۶

(۱۸) ایضاً:ص۲۳۶

(۱۹) ایضاً:ص۲۳۶

(۲۰) ایضاً:ص۲۳۶

(۲۱) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص۲۴۰

(۲۲) ایضاً:ص۲۴۰

(۲۳) ایضاً:ص۲۴۰

(۲۴) ایضاً:ص۲۴۰

(۲۵) ایضاً:ص۲۴۰

(۲۶) ایضاً:ص۲۴۰

(۲۷) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص۲۴۴

(۲۸) ایضاً:ص۲۴۴

(۲۹) ایضاً:ص۲۴۴

(۳۰) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص۲۴۸

(۳۱) ایضاً:ص۲۴۸

(۳۲) ایضاً:ص۲۴۸

(۳۳) ایضاً:ص۲۴۸

(۳۴) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص۲۵۰

(۳۵) ایضاً:ص۲۵۰

(۳۶) ایضاً:ص۲۵۰

(۳۷) ایضاً:ص۲۵۰

(۳۸) ایضاً:ص۲۵۰

(۳۹) رسالہ' شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص،۲۵۴

(۴۰) ایضاً:ص۲۵۴

(۴۱) ایضاً:ص۲۵۴

(۴۲) ایضاً:ص۲۵۴

(۴۳) ایضاً:ص۲۵۴

(۴۴) ایضاً:ص۲۵۴

(۴۵) رسالہ' شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص،۲۶۴

(۴۶) ایضاً:ص۲۶۴

(۴۷) ایضاً:ص۲۶۴

(۴۸) ایضاً:ص۲۶۴

(۴۹) رسالہ' شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص،۲۷۱

(۵۰) ایضاً:ص۲۷۱

(۵۱) ایضاً:ص۲۷۱

(۵۲) ایضاً:ص۲۷۱

(۵۳) ایضاً:ص۲۷۱

(۵۴) ایضاً:ص۲۷۱

(۵۵) رسالہ' شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء،ص،۲۷۸

(۵۶) ایضاً:ص۲۷۸

(۵۷) ایضاً:ص۲۷۸

(۵۸) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء، ص ۲۹۰

(۵۹) ایضاً: ص ۲۹۰

(۶۰) ایضاً: ص ۲۹۰

(۶۱) ایضاً: ص ۲۹۰

(۶۲) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء، ص ۳۰۲

(۶۳) ایضاً: ص ۳۰۲

(۶۴) ایضاً: ص ۳۰۲

(۶۵) ایضاً: ص ۳۰۲

(۶۶) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء، ص ۳۰۶

(۶۷) ایضاً: ص ۳۰۶

(۶۸) ایضاً: ص ۳۰۶

(۶۹) ایضاً: ص ۳۰۶

(۷۰) ایضاً: ص ۳۰۶

(۷۱) ایضاً: ص ۳۰۶

(۷۲) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء، ص ۳۱۸

(۷۳) ایضاً: ص ۳۱۸

(۷۴) ایضاً: ص ۳۱۸

(۷۵) ایضاً: ص ۳۱۸

(۷۶) ایضاً: ص ۳۱۸

(۷۷) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ء، ص ۳۳۱

(۷۸) ایضاً:ص۳۳۱

(۷۹) ایضاً:ص۳۳۱

(۸۰) ایضاً:ص۳۳۱

(۸۱) ایضاً:ص۳۳۱

(۸۲) ایضاً:ص۳۳۱

(۸۳) ایضاً:ص۳۳۱

(۸۴) رسالہ'شاعر' آگرہ اسکول نمبر (کارواں) ۱۹۳۷ص،۳۵۶

(۸۵) ایضاً:ص۳۵۶

(۸۶) ایضاً:ص۳۵۶

باب پنجم

سیماب اکبر آبادی کی دیگر نثری تحریریں

دستورالاصلاح (۱۹۴۰)

''دستورالاصلاح'' سیماب اکبرآبادی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ میں مکتبہ قصرالادب، آگرہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بیشتر اجزا سیماب کے رسالہ 'شاعر' میں شائع ہو چکے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے ''دستورالاصلاح'' میں کئی قدیم و جدید اساتذہ کی اصلاحیں بھی درج کی ہیں اوران پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے۔ اس محاکمے میں انہوں نے بعض اصلاحوں کی توجیہ کی، تو بعض پر اعتراض بھی کیا اوران کی جگہ اپنی اصلاحیں درج کیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخری صفحات میں سیماب اکبرآبادی نے اپنی بھی بہت سی اصلاحیں درج کی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اوراس کے بعد خودان اصلاحات کی توجیہ بھی بیان کی ہے۔

ہندوستانی ادب میں استادی اور شاگردی کی روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ عہد قدیم سے اساتذۂ سخن اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح کرتے رہے ہیں اور یہ ہنر سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ لیکن کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس ہنر کا کوئی دستور تحریری شکل میں بھی ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ استادی اور شاگردی کا ادارہ غیر اہم ہوتا چلا گیا۔ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ بعض شعرا نے خود کو استاد کہلانے کے شوق میں اصلاحِ سخن کو عمومی اور بازاری بنا دیا۔ ان کے نزدیک یہ عمل یا تو تفریحِ طبع کی ایک صورت بن گیا یا پھر ذریعۂ معاش ہو گیا۔ لیکن کچھ سنجیدہ اساتذہ اب بھی باقی تھے جو شاعری کے تقدس کی حفاظت کے لیے فکرمند اورکوشاں رہتے تھے۔ انہی معدودے چند اساتذہ میں سیماب اکبرآبادی بھی شامل تھے۔ لیکن ان کی جدت پسند طبیعت انہیں ہمیشہ اس بات پر آمادہ کرتی رہتی تھی کہ اس ماحول کی اصلاح ضروری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے زمانے کے ساتھ اصلاح سخن کے فن کو ہم آہنگ کیا جائے، ایک دستور، ایک نصاب مرتب کیا جائے۔ یہی فکر اوراحساس ''دستورالاصلاح'' کی شکل میں معرض وجود میں آیا۔

جب ''دستورالاصلاح'' چھپ کر منظر عام پر آئی (جولائی ۱۹۴۰) تو ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ سنجیدہ اور ذمے دار اساتذہ اور شعر و ادب کے باشعور طالب علموں نے اس کتاب کو خوب سراہا اور سیماب اکبرآبادی کی علمی حیثیت بہت بلند ہوگئی۔ لیکن بعض روایت پسند اور دقیانوسی فکر کے حامل اساتذہ یا وہ جو اپنی اوسط فنی لیاقت کے باوجود استاد کا درجہ حاصل کیے بیٹھے تھے، اپنی قلعی کھل جانے کے خوف سے اس کتاب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس سے پہلے بھی سیماب اکبرآبادی کے خلاف محاذ کھلے ہوئے تھے جنہوں نے ایک اور ادبی معرکے کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔

یہاں ہم سب سے پہلے ''دستورالاصلاح'' کے تمہیدی جزو پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں صاحب کتاب نے شاعری اور شاعر کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے، بالخصوص شاعری میں اصلاح کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''دستورالاصلاح'' کی ابتدا ''تمہید'' سے ہوتی ہے۔ اس باب کی ابتدا میں سیماب نے ہندوستان کے شعرا کو اصلاح کے نقطۂ نظر سے تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ متکلمین ماضی

۲۔ محدثین عہد

۳۔ پیغمبران مستقبل

وہ شعرا جن کے کلام میں قدیم اور قدیم ترین موضوعات شاعری بالکلیہ موجود ہیں اور جنہیں اب تک تغزل کی روح سمجھا جاتا ہے انہیں وہ ''متکلمین ماضی'' کا نام دیتے ہیں، اور ''محدثین عہد'' کے ذیل میں ان شعرا کو رکھتے ہیں جو قدیم رنگ تغزل میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اس کے برعکس عصریات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ تیسرے اور آخری طبقے میں سیماب نے ان شعرا کو رکھا ہے جو دنیا کو مستقبل کا پیغام دیتے ہیں اور جن کا موضوع فکر ''ابدیت'' ہے۔ انہیں وہ

''پیغمبران مستقبل'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اصلاح لینے اور دینے کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سیماب لکھتے ہیں:

''اصلاح لینے اور دینے کا دستور اول الذکر طبقے میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ چونکہ مغربیات سے دلچسپی رکھتا ہے اس لیے اس کے ذہن میں یک گونہ آزادی اور خودداری ہے''۔

اور طبقہ آخر ''پیغمبران مستقبل'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''رہے ''پیغمبران مستقبل'' تو انہیں اصلاح کی ضرورت نہیں، یہ خود مصلح ہیں، اور دونوں طبقوں کو اصلاح کا فیض ان سے پہونچتا ہے''۔ (۱)

شعرا کے ان تینوں طبقات اور ان کے خصائص بیان کرتے ہوئے سیماب اصلاح کی اہمیت و افادیت کو ثابت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طبقہ وسطیٰ کی آزادہ روی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ بہر حال وہ اس بات پر تھوڑا اطمینان ضرور ظاہر کرتے ہیں کہ:

''...اور اس دور ناقدین نے اب اس طبقے کو بھی، کسی کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر عصر سے اصلاح لینے پر مجبور کر دیا ہے۔'' (۲)

سیماب اکبرآبادی کو بعض اساتذہ سے یہ شکایت بھی ہے جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس بدلتے ہوئے رویے کی وجہ کہیں نہ کہیں وہ اساتذہ بھی ہیں جنہوں نے تغزل کو چھوڑ کر مقتضائے وقت کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کر لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر عہد حاضر کے تمام اساتذہ اور کہنہ مشق شعرا صرف تغزل پسند ہوتے تو آج طبقۂ ثانی کی یہ تشنگی کسی طرح نہ بجھ سکتی۔ مگر

خیریت یہ ہوئی کہ رفتارِ زمانہ اور مقتضائے وقت کے مطابق بعض
تعلیم یافتہ اربابِ کمال نے اپنی روشِ افکار بدل کر روشِ جدید پر
چلنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔'' (۳)

شعرا کی یہ تقسیم مختلف نقادوں نے مختلف انداز میں کی ہے۔کہیں اسے کلاسکی اور جدید کا نام دیا گیا اور کہیں ترقی پسند اور ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اسی تقسیم کو سیماب اکبرآبادی نے ذرا مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔البتہ اس تقسیم کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی پسند کے مطابق مختلف طبقات کی معیار بندی بھی کر دی ہے۔شاعری کے تعلق سے اپنی رائے دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میں شاعری کو آخرالعلوم سمجھتا ہوں۔مگر کسی شاعر کو خاتم الشعرا
نہیں مانتا۔'' (۴)

سیماب اکبرآبادی شاعری کے مختلف مفکرین اور مختلف عہد اور اس کے بدلتے ہوئے رنگ کے حوالے سے اس قول کو استحکام بخشنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعری ایسا جامع علم ہے جس کے کلیات و جزئیات کا احاطہ تمام تر کوششوں کے باوجود نہیں کیا جا سکتا۔البتہ کوئی شاعر خاتم الشعرا نہیں ہوسکتا۔آگے وہ لکھتے ہیں:

''اس کا سبب سب کو معلوم ہے کہ شاعری 'الہام' ہے اور الہام کی
لامحدود قوتوں کا استقصاء انسانی قوت سے بالاتر ہے۔''

(۵)

شاعری کے الہام ہونے کی بات تو افلاطون سے لے کر اب تک کہی جاتی رہی ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے۔البتہ جب ہم اسے قطعاً ''الہام'' مان لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اس میں انسانی قوت اور اس کے اپنے ارادوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔اس کے بعد پھر استادی شاگردی اور اصلاح کی ضرورت مشکوک معلوم ہونے لگتی ہے۔لہذا یہ

کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری الہام نہیں بلکہ الہامی کیفیت کی حامل ہوتی ہے جس میں انسانی کوششوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ بہر حال آگے چل کر وہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ''فن شعر وہبی بھی ہے اور اکتسابی بھی۔''

سیماب استادی شاگردی کی رسمِ قدیم اور جدید تنقید کو شاعری کے لیے نہ صرف مقصد بلکہ مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں اور یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ یہ رسمِ قدیم ہر دور اور ہر عہد میں شاعری کی ضرورت رہے گی۔علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ ضرورتِ اصلاح میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ سیماب شاعری کو ذریعۂ اصلاح معاشرہ اور شاعر کو مصلح قوم تصور کرتے ہیں۔وہ جذباتی اور نشاطی شاعری کے اس تصور کو قبول نہیں کرتے جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''شاعری جنسیات کا ارتقاع ہے''۔سیماب پورے طور پر اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔سیماب اکبر آبادی اسے تنگ دائرے میں محدود کرنے کے بجائے اصلاح کے وسیع تناظر میں پیش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ لکھنؤ اسکول کے نشاطیہ لہجہ سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔البتہ وہاں کی زبان و بیان کی خصوصیات کا اعتراف کرتے ہیں۔وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے ساتھ آگرہ اسکول کی بھی وکالت کرتے ہیں اور نہ صرف آگرہ اسکول کی وکالت کرتے ہیں بلکہ اسے مرکزی حیثیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ آگرہ کو بطور ثالث پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی۔'' (۲)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکبر آباد (آگرہ) کو بطور ثالث مرکز یا دبستان کہا جائے تو کیوں کہا جائے؟ سیماب نے اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی۔اگر بغور دیکھا جائے تو آگرہ شروع ہی سے بڑا مردم خیز علاقہ رہا ہے لیکن آگرے کا کوئی مستند شاعر ہی کیوں نہ ہو، تاریخ

ادب میں بحیثیت مرکز یا دبستان اس کا ذکر نہیں اور نہ آگرہ میں سیماب سے پہلے کسی شاعر نے اس کا اس حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

اس موضوع کے تحت سیماب اکبرآبادی نے کلام پر اصلاح دینے سے پہلے مصلح کے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ ہمیں سیماب اکبرآبادی کے قائم کردہ اصول و معیار سے اختلاف کے باوجود ایک حد تک اتفاق کرنا پڑتا ہے۔اختلاف کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ادب کے دو تصورات ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے قائل ہیں۔ ان دونوں نظریات سے اپنے اتفاق کی وضاحت انہوں نے کر دی ہے مگر اس کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ہی شخص ''ادب برائے ادب'' کی بھی وکالت کر رہا ہے اور ''ادب برائے زندگی'' کی بھی۔ ان کی تشریحات سے قطع نظر کر کے بھی دیکھیں تو دنیا کے کسی بھی شاعر کی شاعری یک طرفہ نہیں ہوتی۔اس میں زندگی اور سماج کے عام پہلوؤں کے ساتھ کچھ خاص پہلو بھی ہوتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر ادیب سماج کا حصہ ہوتا ہے اور بحیثیت ادیب بھی اس کی ایک شناخت ہوتی ہے۔کسی ادیب کا مکمل ادبی سرمایہ نہ تو صرف ''ادب برائے ادب'' ہوتا ہے اور نہ ہی ''ادب برائے زندگی''، اس لیے اس کی تفریق ہی بے معنی ہے کیونکہ جو ادیب اپنی فکر، سوچ اور خیالات کو منصوبہ بند طریقے سے کسی ایک نظریے میں ڈھالنا چاہتا ہے اس کے یہاں بھی سماجی تانے بانے سے ہی نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلا ارادہ بھی ان کے موضوعات سماجی ہوتے ہیں اور بالواسطہ وہ سماج کو متاثر بھی کرتے ہیں۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ ادیب اور شاعر کو صرف ادب اور شاعری کے نظریے سے دیکھا جانا چاہیے۔

اب یہاں ہم سیماب اکبرآبادی کے قائم کردہ ذیلی عنوانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انہوں نے اس حصہ کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

ا۔ اصلاح زبان

۲۔ اپنی اصلاح

۳۔ اصلاح خیال

(۱) اصلاح زبان کے تحت انہوں نے اصلاح شاعری کے لیے مصلح کی زبان کو اصلاح یافتہ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ زبان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک عوام کی زبان اور دوسری خواص کی زبان۔عوام کی زبان کا مقصد صرف مافی لضمیر کی ادائیگی اور ایک دوسرے تک پیغام رسانی ہوتا ہے۔اس لیے اسے نا قابل اصلاح قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے خواص کی زبان کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہاں مقصد صرف پیغام رسانی نہیں بلکہ پیغام کو بہتر اور زیادہ بامعنی صورت میں پہنچانا ہوتا ہے۔اس لیے اس میں زبان کی چاشنی اور لطف کے ساتھ زبان اور لب و لہجے کا خیال رکھا جاتا ہے،ساتھ ہی مخاطب کے ذہنی معیار اور اس کی علمی سطح کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے تا کہ متکلم کی بات اپنے پورے معنی و مطالب کے ساتھ احسن طریقے سے مخاطب تک پہنچ سکے۔اسی لیے اسے ادب کا نام دیا جاتا ہے،اور اسی زبان میں شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔سیماب اکبرآبادی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''جب شاعر قوم و ملک کا ترجمان ہے'' تو اسے عوام ہی کی زبان بھی اختیار کرنی چاہیے تا کہ اس کا پیام ہر خاص و عام کی سمجھ میں آسکے اور اس کا کوئی کوئی نتیجہ نکل سکے۔ایسی زبان جس میں شوکت الفاظ سے بلندی پیدا ہو گئی ہو۔عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔اس لئے قابل ترک ہے''۔ (۷)

حالانکہ سیماب نے اس کا جواب خود دے دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''میں اس مطالبہ کو تسلیم کرنے میں سب سے پیش پیش ہوں مگر صرف اس قدر تبدیلی چاہتا ہوں کہ جو نظم یا غزل قوم کو مخاطب کر

کے لکھی جائے، یا جس نظم میں اجتماعیت کے مسائل سے بحث ہو
اس کا اسلوب بیان عام فہم ضرور ہونا چاہئے۔لیکن جہاں ''ادب
برائے ادب'' کا سوال ہو، جہاں ادب اردو کے احیاء و بقا کا
مسئلہ پیش نظر ہو،اور جہاں اردو کے ارتقائی ادب کا مظاہرہ
مدّنظر ہو وہاں صاف اور سادہ اشعار کام نہیں دیتے ہیں۔شوکت
الفاظ کو دانستہ شعر میں دینا برا ہے۔لیکن خیال کے لئے بلند الفاظ
لانا بھی ناگزیر ہے''۔ (۸)

سیماب اکبرآبادی نے اپنے ان خیالات کو ابن خلدون کے حوالے سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ یہ بحث ان سے بہت پہلے علامہ شبلی نعمانی ''موازنۂ انیس و دبیر'' اور ''شعرالعجم ''میں کر چکے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیماب اکبرآبادی اصلاح دینے سے پہلے اپنی اصلاح ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے مصلح کی زبان کو اصلاح یافتہ ہونا لازمی قرار دینے کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مصلح کو زبان و بیان کے رموز و نکات سے باخبر ہونا چاہئے اور عوام وخواص کی زبان میں تفریق کا ملکہ بھی ہونا چاہیے اور موضوعات کا ادراک بھی ،تا کہ وہ اصلاح دیتے وقت یہ فیصلہ کر سکے کہ کس جگہ شوکت الفاظ، بلندیِ خیال اور حسن بیان کی ضرورت ہے۔

(۲) انہوں نے ''اپنی اصلاح'' کو دوسرے نمبر پر رکھا ہے۔اس کے وہ تحت لکھتے ہیں:

''شاعری کے لیے اپنی اصلاح کی بھی ضرورت ہے'' (۹)

''اپنی اصلاح'' پر بحث کرتے ہوئے وہ دو بنیادی امور ''فطرت'' اور ''سیرت'' پر روشنی ڈالتے ہیں۔فطرت کو خارجی اور سیرت کو داخلی قرار دیتے ہوئے اول الذکر کو نا قابل تبدیل اور موخرالذکر کو خارجی عناصر سے متاثر ہو کر قابل تبدیل قرار دیتے ہیں۔لہذا وہ شاعر کو

مشورہ دیتے ہیں کہ شاعری کے لیے اچھی سیرت والا ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سیرت کا اثر خیالات پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔جس کی سیرت اچھی نہ ہو وہ اچھا شاعر کبھی نہیں بن سکتا''۔ (۱۰)

اچھی سیرت سے سیماب کی کیا مراد ہے، اس کی وضاحت وہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

''شاعر کی طبیعت میں انسانیت سے محبت اور ہمدردی سب سے مقدم اور ضروری ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہو جب شاعر کی سیرت بلند ہو''۔ (۱۱)

اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے کہ سیماب اکبر آبادی اچھے شاعر کے لیے اچھی سیرت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر میں سوسائٹی کا اثر قبول کرنے کے بجائے سوسائٹی کو متاثر کرنے کی خوبی ہونی چاہئے۔

(۳) اس ذیل میں تیسرا عنوان ''اصلاح خیال'' ہے۔اس کے تحت سیماب نے شاعر کے خیالات کو اس کی سیرت کی طرح پاکیزہ، بلند اور اعلیٰ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے شاعر کے لیے مفکر ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو مفکر نہیں ہوگا اس کی شاعری میں نئی فکر، نئے خیالات نہیں آسکتے۔ بقول سیماب سخنوری کی معراج فکر و خیالات ہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب اکبر آبادی شاعری سے اصلاح قوم کا کام لینا چاہتے تھے، جیسا کہ مولانا الطاف حسین حالی نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیماب خیالات میں پستی کو شاعری کے لیے مناسب نہیں سمجھتے اور ایسے تمام خیالات و افکار کی تردید کرتے ہیں جن سے سماجی اصلاح نہیں ہوسکتی ۔اس عنوان کے تحت سیماب نے تغزل برائے تغزل کے تحت کی جانے والی شاعری کو مخرب الاخلاق قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے اپنے

خیالات کو بلند رکھنا ضروری ہے ساتھ ہی اپنے اردگرد کے سماج اور معاشرے میں پیدا شدہ خرابیوں سے واقفیت بھی ضروری ہے، تبھی شاعر میں بلند پروازی اور اصلاح کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے سامنے رونما ہونے والے واقعات تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مگر اس کا اثر اور نتائج الگ الگ شکل میں مرتب ہوتے ہیں۔ سیماب کا اصرار ہے کہ شاعر سماج میں ہونے والے واقعات کے منفی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کے مثبت پہلوؤں پر توجہ دیں۔ ساتھ ہی چونکہ شاعر مصلح قوم ہے اس لیے اس کے افکار و نظریات سے انقلاب اور بیداری کا کام لیا جانا چاہئے ۔اور اس عمل کے لیے شاعر کے خیالات کا بلند و بالا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے سیماب نے قرآن کی ایک چھوٹی سی آیت کا سہارا لیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے خیالات ایک جگہ مرتکز نہیں ہوتے بلکہ ان میں ہمہ گیریت ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خیالات ہمہ گیر ہونگے تو شعر بھی بلند ہوگا اور جب شعر بلند ہوگا تو شاعر کا رتبہ بھی بلند مانا جائے گا۔

دراصل اس موضوع کا مقصد اجتماعی اصلاح ہے۔ سیماب اکبرآبادی کا مقصد یہ ہے کہ مبتدی شعرا کی اصلاح برسرِ مجلس کر دی جائے جیسا کہ قدیم زمانے میں رواج تھا، خاص کر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت ہی اساتذہ اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ اس سے اسٹیج پر موجود دیگر اساتذۂ سخن کے خیالات و نظریات بھی سامنے آ جاتے تھے اور ان کی تائید بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کلام پختہ اور ہر طرح کی خرابیوں سے پاک ہو جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ برسرِ مجلس کی گئی اصلاح شعر کی تمام جہتیں اور پرتیں کھول دیتی ہے اور صاحب اصلاح کے اندر پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سیماب نے ''مشاعروں کا جدید نظام عمل'' پر اعتراض کرتے ہوئے کچھ مفید مشورے دیے ہیں جو خاص کر موجودہ دور میں نا قابل عمل ہیں۔

''ضرورت اصلاح'' کے باب میں سیماب اکبرآبادی نے اصلاح سخن کی مختصر تاریخ، اصلاح کی اہمیت وضرورت، اصلاح کے عامیانہ رویے اور ایسے ہی دیگر مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔اصلاح سخن کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''سودا شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔سودا کے شاگرد شاہ نصیر اور ان کے شاگرد حضرت ذوق ہوئے اور ذوق کے شاگرد فصیح الملک حضرت داغ ہوئے اور ان کے شاگرد آج تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ ولی دکنی جو اردو شاعری کے بابا آدم مانے جاتے ہیں وہ بھی شاہ گلشن کے شاگرد تھے''۔ (۱۲)

اصلاح کی ضرورت کیوں پڑی اور اس کی وجوہات کیا تھیں،اس کی وضاحت کرتے ہوئے سیماب کہتے ہیں:

''میرے خیال میں ضرورت اصلاح کا داعی وہ ذوق تنقید تھا جو گیارہویں صدی ہجری کے بعد ملک میں پیدا ہوا۔شاعری کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں نے بکثرت شاعر پیدا کر دیئے اور ان کے کلام پر تنقیدیں ہونے لگیں۔مجبوراً شعرا کو اپنے لیے رہنماؤں کی ضرورت ہوئی جو انہیں تنقید کے بے پناہ وار سے بچا سکیں اور نکتہ چینوں کے قلم وزبان سے محفوظ رکھ سکیں''۔ (۱۳)

اصلاح سخن کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں سیماب اکبرآبادی کا کہنا ہے کہ اصلاح کی ضرورت شعر کی اکثریت پر مبنی ہے۔انہوں نے مثالوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح معمولی اصلاح سے شعر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور فنی خامیاں دور ہو جانے سے شعر نکھر جاتا ہے۔کئی ایسے بھی شواہد اور واقعات موجود ہیں کہ شاگرد نے استاد کی

خامیوں کی جانب اشارہ کیا اور استاد نے شکریہ کے ساتھ اصلاح مان لی۔ شاہ حاتم دہلوی کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے سیماب نے لکھا ہے:

''شاہ حاتم دہلوی کا معمول تھا کہ ہمیشہ چار گھڑی دن رہے شاہ تسلیم کے تکیے میں جو قلعہ معلّی کے پائیں میں واقع تھا آبیٹھتے تھے۔ ان کے اکثر شاگرد اور دوسرے لوگ وہاں آ کر ان سے ملا کرتے تھے ایک دن شاہ حاتم نے اپنا ایک مطلع سنایا۔

رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے　　　سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے

سعادت خاں رنگین بھی وہاں موجود تھے۔ کہنے لگے استاد مطلع تو بے پناہ ہے لیکن دوسرے مصرع میں ذرا سی ترمیم کی ضرورت ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ رنگین نے کہا کہ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے

''ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے''

شاہ حاتم نے سوچا تو انہیں معلوم ہوا کہ ''ہم لوٹا ہے'' غیر فصیح ہے ''ہم نے لوٹا ہے'' ہونا چاہئے۔ شاگرد کی اس ترمیم کو مان لیا۔ اور نہ صرف مان لیا بلکہ سب کے سامنے تحسین و آفریں بھی کی۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ پہلے زمانہ میں اصلاح و ترمیم کو ضروری ہی نہیں بلکہ مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ اور بمصداق ''رحم اللہ من ہدانی اعلی عیوبی'' اغلاط کی طرف متوجہ کرنے والے کو بنظر استحسان دیکھا جاتا تھا۔ (۱۴)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح کس قدر ضروری ہوتی ہے۔ بقول سیماب اصلاح بھی ایک قسم کا خاموش درس ہے اور شاعری ایک فن ہے۔ جس طرح دوسرے فنون کے لیے ماہر معلم کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح فن شعر کے لیے بھی ماہر ادیب کی رہنمائی ضروری

ہے۔اس سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔شاگردی اور اصلاح کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعر کے پاس اسالیب وتراکیب کے استعمال کے لیے ایک سند ہو جاتی ہے۔زبان ومحاورات کے اختلافات میں بھٹکنے سے وہ بچ جاتا ہے اور متروکات ومختورات کی تبدیلیوں سے اسے آگاہی ہو جاتی ہے۔یہی وہ باتیں ہیں جو اصلاحِ کلام کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہیں۔

اصلاح کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر اصلاح دینے والے کہنہ مشق شاعر کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اس کے شاگردوں پر بھی وہی رنگ چڑھ جائے۔رفتہ رفتہ اس کوشش میں کامیابی ملتی ہے اور پھر وہ شاگرد جو اپنے استاد کے رنگ کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں، ایک دن جانشین استاد اور پھر خود استاد بن جاتے ہیں۔اس کے علاوہ اس باب میں استاد وشاگرد کے رشتوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی۔

کتاب میں دو ابواب سب سے اہم ہیں پہلا ''اصلاح لینے کا طریقہ'' اور دوسرا '' اصلاح دینے کے طریقے جو عرصے سے میرے معمولات اصلاح میں شریک ہیں''۔اول الذکر باب میں شاگردی کے لیے ضروری گائیڈ لائن یا رہنما اصول بیان کیے گئے ہیں جو ایک طالب علم کے لیے مشعل راہ ہیں۔

دوسرے باب میں اصلاح کے اصول لکھے گئے ہیں جن سے سیماب کے معمولات اصلاح پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان تجربات کی روشنی میں استادانِ فن کی رہنمائی بھی ہو جاتی ہے۔بظاہر یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ آپ کسی استادِ فن کو یہ سکھائیں کہ اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔لیکن ذرا جدید نظامِ تعلیم پر غور کیجیے کہ آج سند یافتہ اور تربیت یافتہ اساتذہ کے لیے وقتاً فوقتاً تربیتی پروگرام کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے۔چنانچہ اگر آپ فن

شاعری کو تدریسی مضمون سمجھیں تو کیا مستند اساتذہ کو کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں؟ یہ کام اگر سب سے پہلے سیماب اکبرآبادی نے کیا تو یہ ان کا ایک بہت بڑا اجتہادی قدم ہے۔

افسانہ، ڈراما اور ناول

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سیماب اکبرآبادی نے باقاعدہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی اور کئی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ غالباً ۱۹۴۰ کے آس پاس انھوں نے ان دونوں اصناف ادب سے خود کو الگ کر لیا تھا اور شاید اس کا سبب ان کی بے پناہ مصروفیات تھیں۔ ان کے افسانے پیمانہ، تاج، شاعر اور دیگر معاصر رسائل میں شائع ہوتے رہے اور ان کی تعداد اتنی اچھی خاصی تھی کہ انھوں نے افسانوں کا ایک مجموعہ 'اساطیر' کے نام سے مرتب بھی کر لیا تھا جو شائع نہیں ہو سکا اور اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔ ان کے افسانوں کے تعلق سے بابو ہرگوبند دیال نشتر اپنے مضمون 'ہندوستان کا پہلا قادرالکلام ادیب' (مطبوعہ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۷) میں لکھتے ہیں:

> ''تقریباً ہر رسالہ اور ہر اخبار آپ کے افسانوں کا حامل ہے۔ آپ کے افسانوں کا رنگ اس قدر مضبوط اور اس قدر دل آویز ہے کہ ملک آپ کے ہر افسانہ پر داد تحسین دیے بغیر نہیں رہتا۔ آپ اپنی جدت طبع اور اختراعی قوتوں کو یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پلاٹ میں باہمی ربط، زبان کی عمدگی، واقعہ نگاری کے پہلو، تخلیق کا زور، الفاظ کی مناسبت اور نفسیات کی تحلیل اس عمدگی سے افسانوں میں نظر آتی ہے کہ ہر افسانہ کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی''۔ (۱۵)

سیماب اکبرآبادی نے 'کلیم عجم' میں اپنی غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست میں ڈراما 'کلجگ'

کا ذکر کیا ہے۔ راز چاند پوری مرحوم نے 'داستان چند' میں ان کے دو ڈراموں کا ذکر کیا ہے جن کے مسودے خود انھوں نے دیکھے تھے لیکن وہ ان ڈراموں کے نام بھول گئے۔ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے (۱۹۳۷تک) گیارہ ڈرامے لکھے تھے جن میں سے ایک کا نام 'کرشن کنول' تھا، ان میں سے بیشتر کولکاتا اور ممبئ میں اسٹیج بھی ہوئے اور کچھ شائع بھی ہوئے۔ مزید یہ کہ انھوں نے ایک فلم کی اسکرپٹ بھی لکھی تھی۔

ماہنامہ 'شاعر' ممبئ کے ہم عصر اردو ادب نمبر (مئی تا دسمبر۱۹۹۷) میں 'مطبوعات ومخطوطات سیماب' کے عنوان سے حضرت سیماب کی تصنیفات کی ایک فہرست افتخار امام صدیقی نے مرتب کی۔

مذکورہ ڈراموں کے تعلق سے کیا کچھ لکھا گیا اور ان کے محاسن ومعائب کیا تھے یا ان کی ادبی حیثیت کیا ہے، ہے بھی یا نہیں یہ راقم الحروف کے لیے بس ایک سوالیہ نشان ہی ہے۔ یہ میری اپنی کم علمی ہے کہ ان کے افسانوں کے تعلق سے زیادہ کچھ درج نہیں کرسکا لیکن بہر حال یہ ایک دلچسپ پہلو ہے سیماب کی ہمہ جہت شخصیت کا، جس پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسا ہی کچھ معاملہ ان کے ڈراموں کا بھی ہے۔

سیماب اکبر آبادی کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ ناولوں کی صحیح تعداد کیا ہے؟ اس کا پورا علم نہیں۔ افتخار امام صدیقی کی فہرست میں مطبوعہ ناولوں کی مختصر معلومات درج ہے۔ افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کی تمام دستیاب تفاصیل درج کررہا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

(۱) پیچ در پیچ: یہ مکمل ڈرامہ جو اسٹیج ہوتا رہا۔ اس کی طباعت ابوالعلائی پریس آگرہ میں ہوئی۔

(۲) داؤ پیچ یا خوبصورت بلا: ایک مکمل ڈرامہ ہے جو بارہا اسٹیج پر کھیلا گیا۔ ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع ہوا۔

(۳) فریب وفا عرف بناؤ بگاڑ: ایک معاشرتی ڈرامہ ہے جو بارہا اسٹیج پر کھیلا گیا۔ عزیزی پریس آگرہ میں طبع ہوا۔

(۴) ناکام تمنا: اپنے وقت کا مقبول ڈرامہ۔ ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع ہوا۔

(۵) ہریش چندر: اسٹیج پر کھیلا گیا ڈرامہ۔ بعد میں ابوالعلائی پریس نے طبع کیا۔

(۶) جوہر شمشیر: یہ ڈرامہ طبع نہیں ہوا لیکن اسے جوبلی تھیٹریکل کمپنی دہلی نے خرید لیا تھا۔

(۷) سرفروش: یہ ڈرامہ بھی طبع نہیں ہوا لیکن اسے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے خرید لیا تھا۔

(۸) غیبی تلوار: یہ ڈرامہ بھی طبع نہیں ہوا لیکن اسے پارسی تھیٹریکل کمپنی بمبئی نے خرید لیا تھا۔

(۹) آفتاب زندگی: یہ ایک سماجی اصلاحی ناول ہے۔ حکیم محمد یعقوب خاں نے دہلی سے شائع کرایا۔

(۱۰) آئینہ: یہ منفرد انداز کا ناول ہے۔ اس میں حضرت داغؔ کے ان اشعار کو ناول کی بنیاد بنایا گیا ہے، جو آئینہ سے متعلق ہیں۔ کہانیوں میں ان کے اشعار بڑی تعداد میں شامل کیے گئے ہیں۔ بال کشن مشین پریس آگرہ سے طبع ہوا۔

(۱۱) سترہ کہانیاں: مختلف موضوعات پر سترہ الگ الگ کہانیاں۔ عزیزی پریس آگرہ سے چھپیں۔

(۱۲) سردار ماں باپ کے دو سردار بیٹے: اس میں قصہ کے ذریعہ اصلاح سماج کی کوشش کی گئی۔ ابوالعلائی پریس آگرہ سے طبع ہوئی۔

(۱۳) سولہ کہانیاں: مختلف موضوعات پر الگ الگ سولہ افسانوں (کہانیوں) کا مجموعہ۔ عزیزی پریس آگرہ میں طبع ہوئی۔

(۱۴) شباب زندگی: یہ اصلاحی ناول دو حصوں پر مشتمل تھا۔ حکیم محمد یعقوب خاں نے دہلی میں طبع کرایا۔

(۱۵) شکیلہ بیگم: ابوالعلائی پریس آگرہ سے طبع ہوئی۔

(۱۶) وفا کی دیوی: یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ابوالعلائی پریس آگرہ سے طبع ہوا۔

(۱۷) اساطیر: مختلف اخبارات ورسائل میں جوافسانے شائع ہوئے۔ (۱۶)

خطبات شاعری(۱۹۳۶)

اس دور کے مذہبی اورسیاسی اجتماعات میں خطبۂ صدارت عام تھالیکن مشاعروں کا حال کچھ مختلف تھا۔مشاعروں میں عموماً سیاسی، مذہبی میدان کی مشہور شخصیات میں سے کسی کو صدر بنادیا جاتا تھا، اب ایک شخص جس کا شین قاف تک درست نہ ہو، خطبہ صدارت کیا پڑھتا۔عموماً ایسا بھی ہوتا کہ کسی کہنہ عمر شاعر کو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے صدارت دے دی جاتی، چاہے وہ فن شاعری، ادب کے موجودہ حالات ونظریات اورزبان وبیان کی باریکیوں سے واقف ہو یا نہ ہو۔سیماب اکبرآبادی اس غیر شاعرانہ رواج سے بہت نالاں تھے وہ چاہتے تھے کہ مشاعرے کی صدارت کسی شاعر ہی کے سپرد کی جائے اور صدر مشاعرہ صدارتی خطبہ بھی پیش کرے۔ دراصل وہ مشاعروں میں صرف غزل خوانی اور رسمی داد وتحسین کے مخالف تھے اوراسے سستی تفریح کا ذریعہ بننے سے بچانا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے مشاعروں میں نظم پڑھنے کی بھی حوصلہ افزائی کی اور'مناظمے' کو بھی رواج دیا۔

سیماب کی خواہش تھی کہ مشاعرے کا صدر علمی ادبی موضوعات پر صدارتی خطبہ پیش کرے جس میں اردوادب اورخصوصاً شاعری پر بات ہواورمشاعرے کا عام سامع اپنی علمیت میں اضافہ کرے۔ انھوں نے حوصلے اورہمت سے کام کا آغاز کیا اور سب سے پہلا خطبہ صدارت ۲۴؍دسمبر ۱۹۲۲کو گیا(بہار) کے کل ہند مشاعرے میں پڑھا اور اس طرح وہ مشاعروں میں خطبہ خوانی کے محرک اوّل ہیں۔

اپنی شاعرانہ زندگی میں سیماب نے کتنے مشاعروں میں شرکت کی، کتنے مشاعروں کی صدارت کی اور کتنے مشاعروں میں خطبہ صدارت پڑھا اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے لیکن 'کلیم عجم' طبع اول (۱۹۳۶) میں صرف چودہ خطبات شائع کیے گئے ہیں۔ مدیر'شاعر' افتخار امام صدیقی کے مطابق دیگر چوبیس خطبات 'شاعر' اور دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔

'کلیم عجم' میں شامل خطبات کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مولانا حالی کے 'مقدمہ شعروشاعری' کی دھوم مچنے کے باوجود اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اردو تنقید، تفہیم اور تحقیق کے واضح خدوخال ابھر کر سامنے نہیں آ سکے تھے بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ ہر اہل قلم نقاد تھا اور زیادہ تر تنقیدی مضامین معائب گردانتے اور اپنی علمیت بگھارنے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ مولانا حالی نے شاعری میں نئے رجحانات پر زور دیا۔ یہی نہیں بلکہ 'مقدمہ شعروشاعری' علمی، لسانی اور فنی معلومات کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ سیماب کے 'خطبات شاعری' کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خطبات دراصل مولانا حالی کے مقدمے کی توسیع ہیں لیکن نقل بہرحال نہیں، کیونکہ مقدمہ ایک مبسوط کتاب ہے جب کہ خطبات پندرہ برسوں میں مختلف حالات اور مختلف اذہان کے لیے کی گئی علمی اور ادبی تقریریں ہیں، گوکہ دونوں میں بہت حد تک موضوعات کی ہم آہنگی ہے لیکن 'خطبات شاعری' میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ بھی ضمناً آ گئی ہے۔ دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مولانا حالی نے دیگر مصنّفین کے بیان کردہ ادبی اور شعری رجحانات کو جابجا بطور سند پیش کیا ہے اور ان پر بہت زیادہ اعتماد بھی کیا ہے جب کہ سیماب کی اپنی ترجیحات ہیں، اپنے نظریات ہیں جو مستعار نہیں بلکہ ذاتی تجربات ومشاہدات کا نچوڑ کہے جاسکتے ہیں۔ یہاں 'خطبات شاعری' کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ صرف ان اہم ترین خطبات کا تذکرہ ہے جو سیماب کے علم و دانش کے مظہر ہیں۔

سب سے پہلا خطبۂ صدارت کانگریس کے اجلاس منعقدہ گیا (بہار) کے مشاعرے میں پڑھا گیا۔ اس کے آغاز میں 'آل انڈیا قومی مشاعرہ' احمد آباد کا ذکر کرتے ہوئے سیماب نے قومی شاعری کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ فہرست میں دیگر موضوعات خطبہ یوں درج ہیں: شاعر اور تبصرۂ حیات ہندوستان کے سب سے پہلے قومی شاعر، شاعر اور قومیات، رزم گاہ، انگورہ اور نصرتی، ملکی اور قومی انجمنوں میں شاعر کی ضرورت۔ اس خطبے میں انھوں نے قومی شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کی تحریکوں میں شعرا کی شمولیت پر زور دیا۔

دوسرا خطبہ ۵/اپریل ۱۹۳۰ کو مشاعرۂ آگرہ میں پڑھا گیا۔ اس کے عنوانات یہ ہیں: خطبہ صدارت کی ترویج، مبتدی اور منتہی شعرا کی مشارکت، آگرہ کی شاعرانہ فضیلت، آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق، شعرائے آگرہ سے اپیل اور مناظمہ۔ دوران خطبہ سیماب کہتے ہیں:

> ''...حضرات! مشاعرے کی داد و تحسین کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔
> اس رسمی مطالبہ نفس کی پروا نہ کیجیے۔ قدرت کلام یہ ہے کہ جب
> شعر کاغذ پر آئے تو پڑھنے والا چند منٹ تک اپنی نگاہ اس سے ہٹا
> نہ سکے۔ اس کی نگاہ میں اس کا دل سمٹ کر آجائے اور جو کچھ آپ
> نے کہا ہے، وہ نگاہوں کے راستے دل میں اُتر جائے''۔ (۱۷)

تیسرا خطبہ مشاعرۂ امراوتی (برار) ۲۹/نومبر ۱۹۳۰ کو پڑھا گیا۔ اس خطبے کے موضوعات بڑے اہم ہیں: برار کی تاریخی و ادبی اہمیت، شاعری کا اثر نظام حیات پر، عہد عتیق اور شاعری، اردو شاعری فارسی شاعری کے نقش قلم پر، اردو شاعری اور غیر فطری جذبات، طالب علم شاعری کا غلط اصول زندگی، غزل اور تغزل کی تشریح تقلید محض کی لعنت، شعر کی تعریف، کالجوں اور اسکولوں کے مشاعرے، شاعری اور ماحولی خصوصیات۔ اس خطبے کا ایک اقتباس دیکھیں:

> ''...لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں
> ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی

> پیداوار کی جگالی کے لیے مجبور کیوں کیے ہوئے ہیں اور ہم
> بیگانوں کے نقش قدم پر چلنے کو تدبیر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟
> کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ اور تخیلی تشنگی کو نہیں
> بجھا سکتا؟''۔ (۱۸)

چوتھا خطبہ مشاعرۂ دہرہ دون کا ہے جو سیماب نے ۱۳؍دسمبر ۱۹۳۰ کو پڑھا۔ اس کے موضوعات ہیں: مشاعروں میں خطبہ صدارت، عربی علم عروض، ہندی قواعد شاعری، سید انشا اور عروض، اردو میں قواعد کی ضرورت، ایطا، جمعیۃ الشعرا کے قیام کی ضرورت، ایرانی شاعری میں انقلاب، ہندوستانی شاعری اور تحریک وطن، موجودہ ذہنیت اور قواعد وضوابط میں انقلاب کی ضرورت۔

پانچوں خطبہ ۲۶؍دسمبر ۱۹۳۱ کو مشاعرہ ڈبائی میں پڑھا گیا جس کے موضوعات یوں ہیں: خطبہ خوانی کا غلط مصرف، اردو شاعری، غلط نظریہ، غلامانہ ذہنیت، شاعری اور مصوری، شاعر کے مدارج بلحاظ اثر، مشاعرے اور دور آزادی، اسباب قبولیت، رسمی ونشاطی شاعری، مشاعروں کی اصلاح، عام شاعری اور مشاعرے، جدید نظام عمل، ماضی وحال، شاعر کی عظمت، تلخ نوائی کی معذرت۔

'شاعری اور مشاعرے کی اصلاح' چھٹے صدارتی خطبے کا عنوان ہے جسے سیماب اکبرآبادی نے انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۲۷؍فروری ۱۹۳۲ کو پڑھا جس میں شاعری اور مشاعروں کی اصلاح، مروجہ اقسام شاعری، محاورات، مصطلحات اور اسالیب بیان کا تحفظ، میر وسودا اور غالب ومومن، اساتذۂ مقدمین کے دیوانوں کا تجزیہ، بدعات مشاعرہ، مشاعروں کی اصلاح کیوں کر ہو؟ شاعر اور مشاعروں میں انقلاب پیدا کرنے کی عملی تدبیر، جمعیۃ الشعرائے ہند کی تحریک جیسے موضوعات پر اظہار کیا۔

ساتوں خطبہ ۱۶؍اپریل ۱۹۳۳ کو مشاعرۂ بزم ادب جہلم (پنجاب) میں پڑھا گیا جس

کے مشمولات یہ ہیں: علم وادب، ادب اردو، مشہور شعرائے اردو کے چھ دور بہ لحاظ ترقی زبان، فارسی کا اثر اردو پر، ادب کا مواد اور مقصد ومنشا، قدیم وجدید ادب، نمو ئے ادب کے وسائل، شعر میں ادب کی جگہ، ملک کی اجتماعی زندگی پر ادب کا اثر، حیات قومی میں ادبیات کا حصہ، علم وادب کی تبلیغ وخدمت کے ذرائع، مستقبل کے متعلق مشورہ۔

'کلیم عجم' میں آٹھواں خطبۂ صدارت مشاعرۂ بزم ادب کاندھلہ ضلع مظفرنگر کا ہے، جو ۲۸/اکتوبر ۱۹۳۳ کو منعقد ہوا۔ اس کے موضوعات یوں ہیں: اردو شاعری کی ترقی اور معیار، مشاعرے، شعرا کی بے قدری وکسمپرسی، اس کا علاج، صدارت ناقص، مشاعرے کا غلط ماحول، خودرو شعرا کی اصلاح، محاکے کی ضرورت، غزل کا معیار، غزل کی زبان۔

نویں خطبے کا عنوان 'غزل' ہے۔ یہ کہاں پڑھا گیا درج نہیں ہے۔ البتہ 'محررۂ دسمبر ۱۹۳۵' تحریر ہے۔ اس میں جن موضوعات پر اظہار خیال فرمایا گیا وہ یہ ہیں: غزل کی صنفی خصوصیت، عرب کے بعد عجم میں، ہندوستان اردو شاعری سے پہلے، غزل ہندوستان میں، خلط مبحث، اقدامِ اصلاح، حکومت کا اثر غزل پر، دور غالب، مرزا داغ اور امیر وجلال کا زمانہ، حالی اور آزاد کا اثر غزل پر، غزل کا ارتقا، ایک مترنم انقلاب، حالی اور ان کے معاصرین، غزل کے قدیم موضوعات، غزل کا جدید رنگ، غزل اور واردات و جذبات ایک ضروری مشورہ۔ اس خطبے میں سیماب لکھتے ہیں:

> ''تاثیر صرف اسی شعر میں پیدا ہوسکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اس کی کیفیاتِ حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل اور دماغ پر محسوس نہ کرے اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرز پُر اثر، پیرایہ

متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا، زبان نہ مُلّایانہ، نہ بازاری،
روزمرہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے
ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے، نہ زبان الجھے، نیز
تقلیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہیے''۔

(۱۹)

آل انڈیا مشاعرۂ کانپور ۲/دسمبر ۱۹۳۵ میں سیماب نے 'موجودہ اردو شاعری پر ایک تنقیدی نظر' کے عنوان سے دسواں صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کے ذیلی عنوانات ملاحظہ ہوں: شاعری کا معیار، ادارہ ہائے شاعری اور ان کی شاخیں، آگرہ اسکول، آگرہ اسکول کی خصوصیات، حریفان کم مایہ، اردو شاعری پر تنقید، عام اردو شاعری کا ایک اور نقص، تقلید و قدامت پرستی، تنقید کا غلط معیار، موجودہ شاعری کا عملی کریکٹر اور مشاعرے، موجودہ شاعری کے نمونے، عصر حاضر سے عصر قدیم کا موازنہ، نظم گوئی کا رواج۔

انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کے مشاعرے میں ۹ فروری ۱۹۳۴ کو گیارہواں خطبہ پڑھا گیا جس کا عنوان ہے 'ہندوستانی یونیورسٹیاں اور ادب اردو' اس خطبے کے ذیلی عنوانات یوں ہیں: اردو زبان کی عالمگیری، مشاعروں کی افادیت، کالجوں کے مشاعروں اور ادبی مجالس کی اہمیت، طلبا اور شاعری، یونیورسٹیوں کی ادب اردو سے بے اعتنائی، یونیورسٹیاں کیا کر سکتی ہیں، تعلیم میں اردو کی ضرورت بحیثیت مادری زبان کے، نصاب تعلیم میں معیاری ادب کی ضرورت، ادبائے اردو کی ہمت افزائی، مدیران نصاب کی مردہ پرستی، کالج کی لائبریریاں، کالجوں کے رسالے، کالجوں کے مشاعروں کا معیار، خاتمہ۔

بارہواں خطبہ مشاعرۂ بزم اردو لشکر (گوالیار) میں ۲۸ فروری ۱۹۳۴ کو پڑھا گیا جس کا عنوان 'اردو' ہے۔ اس کے تحت ذیل کے موضوعات شامل ہیں: چند لمحے ماضی میں توضیح حال، اردو کی عامیت اور صوبہ جاتی گیرائی، اردو کس کی زبان ہے، اردو زبان کے خصائص،

مصطلحات اردو،قوت انجذاب، اردو بحیثیت اخباری زبان کے، اردو زبان کی علمی حیثیت، اردو کا تجارتی وزن، اردو اور سیاست، اردو اور شاعری، اردو کی تصنیفی قوتیں، اردو میں تاریخ وسیرت نگاری، اردو کا اخلاقی استحکام، اردو کا مذہبی اقتدار، اردو کی بین الاقوامی حیثیت، اردو کے مستقبل پر ایک نظر۔

تیرہواں خطبہ درباری مشاعرہ، منعقد درگاہِ حضرت شاہ ولایتؒ، نائی منڈی آگرہ میں ۲/ مارچ ۱۹۳۴ کو پڑھا گیا۔ اس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں: اربابِ طریقت اور شاعری، آگرہ کے صوفی شعرا، تصوف اور اردو شاعری۔

چودہواں صدارتی خطبہ مشاعرۂ بزم ادب اورئی ضلع جالون منعقدہ ۵/ جون ۱۹۳۵ کا ہے۔ اس کے عنوانات یہ ہیں: اورئی کا ادبی جغرافیہ، شاعری اور بقائے عمرانیت، شاعر کا تفوق جنسی، موجودہ شاعری اور تنوع خیال، آخری گزارش۔

ان خطبات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی صدرِ مشاعرہ کی رسمی تقاریر نہیں بلکہ تحقیق وتنقید کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ ان میں تاریخ، سماجیات، نفسیات، نظریات، فلسفہ، اصلاحی رجحانات اور عمیق مطالعے کو سمودیا گیا ہے۔ شستہ، معیاری اور سہل زبان میں ان خطبات کو تصنیف کیا گیا تا کہ مشاعرے کا عام سامع اُکتا نہ جائے اور ظاہر ہے کہ اگر اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو ممکن ہے کہ دو چار خطبوں کے بعد ہی یہ سلسلہ دم توڑ دیتا لیکن شواہد ہیں کہ عوام کو ان خطبات میں ویسا ہی لطف وانبساط حاصل ہوتا تھا جیسا غزل سن کر ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ سیماب اگر ان خیالات کو تنقیدی کتاب کی شکل دیتے تو اس میں مزید علمی اضافے ہوتے لیکن عوام کے لیے ادبی موضوعات پر اظہار خیال کوئی عام بات نہیں۔ بارہ تیرہ برسوں میں سیماب نے کئی مشاعروں کی صدارت فرمائی لیکن ۱۹۲۲ سے ۱۹۳۵ تک صرف چودہ خطبات کا انتخاب کیا جانا بھی اہمیت کا حامل ہے۔

خطوط نگاری

خط یا مکتوب دراصل دو افراد کے مابین ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے، جس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ خط کا لکھنا اور پڑھنا ایک سماجی عمل ہے اور انسان سماج سے علیحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ ہر انسان کے دوسرے انسانوں سے مختلف نوعیت کے روابط ہوتے ہیں۔ گھر اور خاندان سے انسانی رشتوں کی ابتدا ہوتی ہے، پھر دوستی کا رشتہ ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں الگ الگ رشتے قائم ہوتے ہیں جیسے استاد اور شاگرد کا رشتہ، تاجر اور خریدار کا رشتہ، ایڈیٹر کا رسالے کا رشتہ، مزدور اور مالک کا رشتہ وغیرہ ایسے بہت سے رشتے ہیں جنھیں قائم رکھنے اور مستحکم بنانے میں خط وکتابت اور مراسلت کا دخل ہوتا ہے۔ جب کسی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تو وہ خطوط کے ذریعے ربط پیدا کرتے ہیں۔ خطوط ملاقات کا بدل بن جاتے ہیں اسی لیے خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔

ادبی، علمی، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ادیبوں کے خطوط سے ان کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت، ان کے دور کی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں ان کے تصورات کیا تھے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے ان کی شعری اور ادبی تخلیقات کی تحسین میں بھی مدد ملتی ہے۔ عالموں اور دانشوروں کے خطوط کے ذریعہ جہاں مختلف علمی مسائل پر ان کے خیالات اور تبصروں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں ان سے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور ترقی میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کے خطوط ادبی شان رکھتے ہیں۔ اردو میں ایسے خطوط کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ جن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اس صنف ادب میں گراں

قدر اضافہ کیا ان میں علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سر سید احمد خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سیماب اکبرآبادی ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ انھوں نے اپنی مستقل تصنیفات کے ساتھ ساتھ مکتوبات کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ سیماب تاعمر کشاکش حالات اور کشمکش زندگی میں مبتلا رہے۔ گردشوں اور سختیوں نے ایک طویل عرصے تک انھیں مضطر بنائے رکھا۔ وہ وطن سے دور ملک کے مختلف شہروں میں بھی بھٹکے۔ اپنی تنگ دستیوں اور آزمائشوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مختلف النوع ذمہ داریوں کو نہایت مستعدی اور انہاک سے ادا کیا۔

سیماب بنام ضیا (مکاتیب سیماب اکبرآبادی) وہ خط ہیں جو اردو کے مشہور شاعر اور استاد سیماب اکبرآبادی نے اپنے عزیز شاگرد ضیا فتح آبادی کو لکھے تھے۔ مشہور اساتذہ کے خطوں کے جو مجموعے چھپے ہیں ان میں ایک قابل ذکر حصہ ایسا ملتا ہے جس میں علمی اور فنی نکات کا بیان محفوظ ہے۔ اس میں اصلاح کے واسطے شاگردوں کو زبان و بیان کی باریکیاں سمجھائی گئی ہیں یا ادبی استفسارات کا جواب دیا گیا ہے۔ خطوں کے ایسے ٹکڑے آج زبان و بیان پر کام کرنے والوں کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پیش نظر مجموعے میں جو خط ہیں ان میں ایسے اجزا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جو دو چار باتیں بعض خطوں میں ملتی ہیں، وہ بجائے خود چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس لحاظ سے زبان، قواعد زبان، قواعد شاعری اور فن اصلاح سخن کے طالب علموں اور شائقین کے لیے ان خطوط میں دلچسپی کے اجزا گویا موجود نہیں۔ ان خطوں کا مطالعہ اس لحاظ سے تو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ مجموعہ پند و نصائح کا دفتر یا متروکات سخن کا اعلان نامہ بھی نہیں ہے۔ یہ زندگی کی سرگزشت اور حالات کے پیچ و تاب کا مرقع ہے۔ سیماب کی زندگی پر کام کرنے والوں کو اس میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ خاص شاگردوں سے ان کے روابط

کا کیا حال تھا اس کا اندازہ ان خطوں کو پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد کو لکھے تھے۔ ان خطوں کی قدر و قیمت اس میں پنہاں ہے کہ ایک معروف استاد کے حالات کی تلخ و شیریں داستانیں ان میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب سے ساٹھ ستر سال پہلے تک شاگرد اور استاد کے درمیان کس قدر یگانگت ہوا کرتی تھی۔ ان خطوط میں استاد نے جس بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ اپنی مشکلات کا حال لکھا ہے شاگرد سے جس طرح فرمائش کی ہے۔ بعض موقعوں پر اُسے جس طرح تنبیہ کی ہے اور دل کے درد کو جس طرح کاغذ کے صفحات پر بکھیر دیا ہے، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاگرد کس قدر سعادت مند تھا اور وہ استاد کس قدر قدر دان تھا اور کس حد تک پریشان خاطر رہا کرتا تھا۔ ذرا اس اقتباس کو ملاحظہ کریں:

> ''یہی زیادہ مناسب ہے کہ جو مضمون چھپے، اس کی اجرت
> بھجوادی جائے۔ مضمون اگر کسی اور کے نام سے بھی چھپے گا تو مجھے
> عذر نہ ہوگا''۔ (۲۰)

اپنے رشحات قلم کو کوئی شخص آسانی کے ساتھ دوسروں کے حوالے نہیں کرتا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں مصحفی جیسا استاد بھی سرگراں نظر آتا ہے۔ بعض خطوط میں ذاتی پریشانیوں کا بیان کچھ اس طرح ملتا ہے کہ طبیعت پر بے طرح اثر ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں جو خط ہیں اس میں ہر طرح کی باتیں ملیں گی۔ شاعرانہ چشمک استاد بھائیوں کی لاگ ڈانٹ، مشاعروں کا تذکرہ، کتابوں اور رسالوں کی باتیں، اصلاح کے تذکرے، ہمت افزائی، تنبیہ، چشم نمائی وغیرہ غرض کہ بہت کچھ ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ ہر بیان اپنی سچائی پر گواہ نظر آتا ہے اور ہر بات برحق معلوم ہوتی ہے۔ بناوٹ، دکھاوے اور تکلف جیسے عوامل کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ خط صحیح معنی میں احساس اور جذبے کے ترجمان اور واقعات کا ایک طرح سے روزنامچہ ہیں:

> ''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ کے ذکر و فکر سے قصر الادب

خالی ہے۔قصرالادب تو سنگ وخشت کی ایک چاردیواری کا نام
ہے۔حقیقی قصرالادب میرادل ہے۔اس میں جسے باریابی ہوچکی
وہ بھلایانہیں جاسکتا''۔ (۲۱)

آج کی استادی وشاگردی کا جوانداز واحوال ہے اس کے پیش نظر، ان خطوط کی بہت سی باتیں ہمارے نئے شاعروں کو کہانیاں معلوم ہوں گی۔لیکن جس زمانے کی یہ داستان ہے، اس میں یہ مانوس اور متعارف سچائیاں تھیں۔اس مجموعے کو پڑھ کر یہ خوبی بطور خاص متاثر کرتی ہے کہ پرانا زمانہ اور پرانی روایتیں زندہ اور متحرک ہوکر سامنے آگئیں۔ہم آج ان روایتوں کے متعلق جورائے بھی قائم کریں، کل ان روایتوں پر عمل پیرا ہونا، تہذیبی زندگی کا فریضہ تھا۔

ان کا اسلوب تحریر صاف ستھرا ہے۔سیماب نے ان خطوط میں نہایت بے تکلفی سے خیالات کا اظہار کیا ہے۔سادگی بیان اور سادہ خیالی نے خطوں کی تحریر کو رواں اور برجستہ بنادیا ہے۔سیماب اکبرآبادی کے ان تمام مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب تحریر کو صفائی وسادگی، پاکیزہ اور عام فہم کا مرقع بنائے رکھا۔

رازعروض (۱۹۲۵)

سیماب اکبرآبادی نے اردوشاعری کے طالب علموں اور خصوصاً اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے دو کتابیں 'رازعروض' اور 'دستورالاصلاح' تحریر کیں، ان دونوں کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ قلیل وقتوں میں ہی ان کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔رازعروض کے تعلق سیماب اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''اواخر اکتوبر ۱۹۲۲ میں جب کلکتہ سے واپس آیا تو غیر ارادی طور پر
اپنے عزیز ترین دوست اور مخلص ترین شاگرد ابوالفاضل محمد صادق
راز چاندپوری کے یہاں کانپور مہمان رہنا پڑا۔تھکان سفر ابھی دور

نہ ہوئی تھی کہ راز صاحب کی طرف سے سادہ اردو میں ایک رسالۂ
عروض لکھنے کا تقاضا ہوا۔ میں اس سے پہلے بھی وعدہ کر چکا تھا، مگر
آج راز صاحب کی درخواست کو وعدہ پر نہ ٹال سکا۔ وہ ایک سادہ
کاپی مجھے دیکر دفتر چلے گئے اور میں نے صرف تین گھنٹے میں اس
مختصر رسالہ کو لکھ ڈالا۔ جسے میں انہیں کی اخلاص مندی اور محبت پر
معنون کرتا ہوں''۔ (۲۲)

'رازعروض' شاعری کے مبتدیوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس کتاب سے پہلے بھی اساتذۂ سخن نے عروض اور فن شاعری پر لاتعداد کتابیں لکھیں ان میں سے بیشتر یا تو فارسی میں تھیں یا عربی اور فارسی زدہ اردو میں۔ پھر نصاب کے نظریے سے ان کتابوں کو نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ استاد اپنی استادی منوانے کے لیے عروض کی کتابیں لکھتے تھے جن میں درجہ بدرجہ شعر کہنے کے مراحل کو ملحوظ رکھنے کے بجائے بحروں اور شعری نکات پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اس لیے ان کتابوں سے اوسط لیاقت کے حامل طلبہ بہت زیادہ فیض حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ سیماب چونکہ ہمیشہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے کوشاں رہے اور اردو زبان سے لے کر امور خانہ داری تک کئی نصابی کتابیں تحریر کیں، لہٰذا وہ تعلیمی اور نصابی ضرورتوں سے آگاہ رہے۔ انھیں اندازہ تھا کہ اب تک فن شاعری کو باقاعدہ نصاب کی حیثیت نہیں دی گئی اور اسے تاریخ، جغرافیہ، الجبرا یا سائنس کی طرح ایک تدریسی مضمون کا درجہ نہیں دیا گیا۔ شاید ان کے اسی خیال نے انھیں 'رازعروض' تحریر کرنے پر آمادہ کیا۔

'رازعروض' سیماب کی اہم ترین تصنیف ہے جو فن عروض پر مشتمل ہے۔ سیماب کی فن عروض پر بالکل ابتدائی کتاب جس میں اولیات فن پر عام فہم اردو پر بحث کی گئی ہے اور عروض کے ضروری قاعدے لکھ دیئے گئے ہیں۔ سیماب نے یہ کتاب صرف اپنے ایک عزیز شاگرد کی خوشنودی کے لیے تالیف کی تھی لیکن اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ طالبان فن میں یہ کتاب بہت

مقبول ہوئی اور طلبائے فن کو اس کے مطالعے سے کافی فائدہ پہنچا۔

'رازعروض' سیماب اکبرآبادی کا ایسا علمی کارنامہ ہے، جس کو اس وقت تک یاد رکھا جائے گا جب تک اس علم سے دلچسپی رکھنے والے موجود ہیں۔ علم عروض شاعری کے لیے جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل فن ہے۔ جس طرح گانے کے لیے موسیقی سے واقفیت لازمی ہے اسی طرح شاعری کے لیے علم عروض کا جاننا ضروری ہے۔ طبع موزوں کے تحت شاعری تو کی جا سکتی ہے لیکن اگر بحر و قافیہ کے فن سے واقفیت نہیں ہے تو آہنگ شعر پر قدرت ممکن نہیں۔ 'رازعروض' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فن عروض کو درجہ بدرجہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور مختلف مثالوں کے ذریعہ اس کے نکات کو ذہن نشین کرایا گیا ہے تاکہ یہ علم صرف ماہرین عروض تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

'رازعروض' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب اکبرآبادی نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ علم عروض سے متعلق کوئی نکتہ نظرانداز نہ ہو۔ بلاشبہ سیماب نے اس میں مکمل کامیابی حاصل کی ہے۔ 'رازعروض' میں شعر کہنے کے ابتدائی لوازمات، اصطلاحاتِ شاعری کی آسان تفہیم، شعر کہنا، علم کی ضرورت، ابتدائی مشق، آمد، آورد، آورد سے بچنے کا طریقہ، شعر کہنے اور تقطیع کرنے کا طریقہ مع مثال، ارکان اور وزن شعر، نظم کی قسمیں، علم بدیع، صناع معنوی، صناع لفظی، عیوب فصاحت، ایطا، انیس بحروں کا بیان، سبب وتد اور فاصلہ، زحاف کا بیان نہایت صاف اور سلیس اردو میں لکھا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو سیماب اکبرآبادی نے مروجہ بحروں کی سلیس زبان میں فہم، شعر کہنے کا طریقہ، نظم کی قسمیں مع مثال، عیوب فصاحت، صنائع و بدائع، متروک الفاظ کی فہرست، اور انیس (۱۹) بحروں کا بیان مع مثال و تقطیع نہایت صاف اور سلیس اردو میں لکھا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو سیماب نے بہت مختصر وقت میں تحریر کر دی لیکن طالب علموں کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ثابت

ہوئی۔

'رازعروض' کی ابتدا 'شعر کہنا' سے ہوتی ہے۔ اس میں سیماب اکبرآبادی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شعر کہنے کے لیے سب سے ضروری چیز 'موزونیت' ہے جسے خداداد سمجھیے۔ موزونیت سکھانے یا بتانے سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہاں جن لوگوں کو موسیقی (گانے بجانے) سے کچھ دلچسپی ہے ان کے لیے طبیعت کا موزوں کرلینا کس قدر آسان ہے۔ بحر (راگ) میں آواز کو موزوں کرتے رہنے سے یعنی گنگنانے سے اکثر موزونیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تقطیع کرنے کے قواعد پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو بھی شعر موزوں ہوسکتا ہے۔ اس طرح 'علم کی ضرورت' میں سیماب یہ کہتے ہیں کہ شعر کہنے کے لیے علم کی سخت ضرور ہے، مگر معمولی علم والے بھی اگر چاہیں تو شعر کہہ سکتے ہیں جنھیں اچھا علم ہے انھیں زیادہ مشکل کا سامنا نہیں ہوتا۔ اس لیے شاعری سیکھنے سے پہلے علم حاصل کرلینا ضروری ہے۔

سیماب کو شاعری کا شوق وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے غزلیات، نظمیں، مرثیے، سلام اور رباعیات وغیرہ لکھیں۔ انھیں زبان اور نکات شعری پر ایسی قدرت تھی کہ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا تھا۔ زبان اور شاعری کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر ایک طرح سے کلاسیکی تھا۔

اس مختصر سی کتاب میں سیماب نے ایسے بے شمار نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو پڑھ کر ایک طالب علم عروض پر پوری دسترس حاصل کرسکتا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں مروجہ انیس بحروں کے علاوہ اور بحریں بھی ہیں جن کو سیماب نے وضع کی ہیں جو مروجہ بحروں میں ملتبس ہونے کی وجہ سے مشہور نہیں ہوسکیں پھر بھی علمی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔

سیماب نے 'رازعروض' میں 'شعر کہنے کا طریقہ اور مثال' کے عنوان سے تفصیل سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شعر کیسے کہا جائے۔ شعر کہنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے اور پھر مثال

کے ساتھ تقطیع کے ذریعہ ایک اچھے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہر شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع کا ایک خاص وزن ہوتا ہے اسی کو بحر کہتے ہیں۔ زیادہ استعمال میں آنے والی بحریں تین، چار عربی لفظوں سے مرکب ہوتی ہیں۔ جیسے ؎

عشق جب سے دلربا کا ہو گیا

اس پورے مصرعہ کی تقطیع ہوگی فاعلاتن/فاعلاتن/فاعلن

سیماب اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''اب ہمیں اسی بحر میں شعر کہتے ہیں تو ہم نے پہلے قافیہ سوچا (یہ شعر کے آخر میں جو لفظ منزل کے آخر تک بار بار آتا ہے اسے ردیف کہتے ہیں اور ردیف سے پہلے جو لفظ ہوتا ہے اور جو ہر شعر میں بدل دیا جاتا ہے وہ قافیہ کہلاتا ہے) اس طرح میں 'ہو گیا' ردیف ہے۔ یہ لفظ 'ہو گیا' یہ شعر میں غزل کے آخر تک بدستور آئے گا۔ قافیہ ہے 'کا' یہ بدلتا رہے گا تو 'کا' کے قافیے کیا، وا، اور اچھا، میرا، ایسا، دھوکا وغیرہ نظر آئے۔ اب ہم نے ایک قافیہ لیا 'اچھا' اسے ردیف کے ساتھ لکھا۔ 'اچھا ہو گیا' اب مضمون سوچا کہ کیا اچھا ہو گیا، کون اچھا ہو گیا؟ دماغ نے جواب دیا 'بیمار' یہ لفظ بھی لکھا لیا۔ اب یہ صورت ہو گئی 'بیمار اچھا ہو گیا''۔

آگے مزید لکھتے ہیں:

''اب دیکھا جائے کہ مصرع پورا کرنے کے لیے کتنے الفاظ کی ضرورت اور ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہو گیا تو 'فاعلن' کے برابر ہے اور 'مار اچھا' فاعلاتن کے برابر ہے۔ اب ضرورت ہے صرف ایک ایسے ٹکڑے کی جو دوسرے 'فاعلاتن' کے برابر ہو اور اس ٹکڑے میں 'بیمار' کا 'بی' بھی کھپ جائے۔ گویا 'تن' کے

وزن پر تو 'بی' موجود ہے صرف 'فاعلا' کے وزن پر ایک ٹکڑا اور چاہیے۔ سوچا تو 'لے ترا' ذہن میں آیا اور مصرعہ کی پوری صورت یہ ہوگئی 'لے ترا بیمار اچھا ہوگیا' لے ترابی (فاعلاتن) ، مار اچھا (فاعلاتن) ہوگیا (فاعلن)۔ بس اسی کا نام تقطیع ہے اور اسی طرح مصرعوں کا وزن پر کیا اور جانچا جاتا ہے۔ اگر اسی مصرعہ کو یوں لکھیں 'لو تمہارا بیمار اچھا ہوگیا' تو گانے والا فوراً بتادے گا کہ مصرع غلط ہے اور عروض جاننے والا بھی کہہ دے کہ تقطیع سے خارج ہے''۔ (۲۳)

سیماب اکبرآبادی نے 'رازعروض' میں بعض مقامات پر اچھے انداز سے تشریح کی ہے کہ مبتدیوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ظاہر ہے کہ ہر علم کے حاصل کرنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مبتدی کو اکثر مقامات پر مسائل عروض سے کماحقہ واقفیت کے لیے کسی اہل فن سے دریافت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاہم سیماب نے اس امر کا حددرجہ التزام کیا ہے کہ مبتدی کو اس کے مطالب سمجھ لینے میں کسی استاد کی ضرورت واقع نہ ہو۔ بہرحال اس چھوٹی سی کتاب میں علم عروض کو مکمل طور سے پیش کرنے کے متعلق پوری کوشش کی گئی ہے۔ سیماب نے مختلف ابواب قائم کرکے مسائل عروض کو آسان صورت میں پیش کیا ہے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اردو میں سیماب کی کتاب 'رازِعروض' سے بہتر کتابیں علم عروض سے متعلق لکھی گئی ہیں جس طرح ہر کتاب طرزِ بیان کے لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے، اسی طرح یہ کتاب بھی سیماب کا گراں قدر کارنامہ ہے۔

سیماب اکبرآبادی ایک باصلاحیت اور کثیر جہتی شاعر تھے۔ زبان و بیان پر انھیں کامل عبور تھا۔ سیماب کی کتاب 'رازعروض' کی زبان بالکل آسان اور سلیس ہے۔ ممکن ہے کہ مبتدیوں کو کہیں کہیں پر لغت سے مدد لینے کی ضرورت پڑے۔ مگر مطالب اس قدر واضح ہیں کہ ذہانت

سے کام لینے والوں کو اعانت استاد کی ضرورت نہ واقع ہوگی اور کسی اہل فن سے بغیر پوچھے سب امورفن ان پر منکشف ہو جائیں گے۔

صحیح زبان سکھانے اور اردو شعروادب سے طالب علموں کو روشناس کرانے کے لیے تعلیم کی اس منزل پر جس انہماک اور توجہ کی ضرورت ہے عموماً اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس صورت میں عروض کی ایسی کتاب لکھنا جس سے طلبہ مستفید ہوسکیں اور اپنی دلچسپی کا اظہار کرسکیں اور بھی مشکل ہوتا ہے لہٰذا اس ضرورت کو پیش نظر اردو میں سیماب نے علم عروض کی ایک ایسی کتاب تالیف کی جس کا مطالعہ طلبہ دلچسپی کے ساتھ کرسکیں اور زبان دانی کے ساتھ ساتھ امتحانی نقطہ نظر سے بھی یہ کتاب ان کے لیے مفید ثابت ہو۔ سیماب اکبرآبادی کے ذریعے لکھی گئی 'رازعروض' متبدیوں کے لیے تیار کی گئی ایک کتاب ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے لوگوں کے لیے بھی استفادہ کی پوری پوری گنجائش اس کتاب میں موجود ہے۔

سیرۃ النبوی (۱۹۴۹)

سیرت نگاری نثر کی ایک نازک اور مشکل صنف ہے۔ اس کے لیے قرآن وحدیث اور کلاسیکل عربی زبان وادب سے واقفیت ضروری ہے نیز عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صادق جذبہ بھی لازمی ہے۔ پختہ اور محتاط قلم کار ہی اس صنف میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

سیرت نبوی کے ہر پہلو پر دنیا کی بیشتر زبانوں میں قابل قدر لٹریچر موجود ہے۔ اس موضوع پر مختصر کتابیں بھی ہیں، متوسط بھی اور ضخیم مجلدات بھی۔ بعض اہل قلم نے ٹھوس علمی تحقیقات پیش کی ہیں۔ بعض کی سرسری اور تاثراتی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں۔ بعض نے ناول کے طرز پر گل کاریاں کی ہیں تو بعض نے بچوں کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں سیرت طیبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر بھی عاشقان رسولؐ کی طبیعتیں سیر نہیں ہوئی ہیں اور حیات نبویؐ کے ایک لمحے کی

تفصیل جاننے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے کی کوشش کرنے والوں کی جانب سے **ھل من مزید** کا تقاضا رہا ہے۔ بعض اہل قلم نے ایک نئے اور منفرد انداز سے سیرت نگاری کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ مختصر الفاظ میں سیرت کا ایک ایک واقعہ بیان کر کے اس سے دروس واحکام کا استنباط کیا جائے اور یہ کام سیماب اکبرآبادی نے بخوبی انجام دیا ہے۔

'سیرۃ النبوی' کی ابتدا' حضور باری تعالیٰ میں' سے ہوتی ہے۔اس میں سیماب اکبرآبادی اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ الٰہی تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے مجھے انسان بنایا اور زبان و بیان کی قوتیں عطا فرمائیں۔ میں تیرے حضور میں اپنی لاعلمی و جہالت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں کیا ہوں؟ میں بھی نہیں جانتا۔ جو کچھ ہے وہ تو ہے۔ تیری قوتیں لامحدود اور تیری قدرت سمجھ میں نہ آنے والی ایک حقیقت ہے۔ آگے اللہ سے مزید دعا کرتے ہیں کہ اے عرش وفرش کے مالک جس طرح تو نے مجھ سے قرآن مجید کا ترجمہ نظم کرا لیا اسی طرح اپنے نبیؐ کی سیرت بھی لکھوا دے۔ میرا دماغ بن جا، میری قلم بن جا، میرا ہاتھ بن جا اور مجھ پر سیرۃ النبی کے وہ اسرار و رموز منکشف کر دے جو تیرے علم میں ہیں۔ سیماب اکبرآبادی لکھتے ہیں:

> ''مولا! یہ بھی تیری دستگیری کا وقت ہے۔ میرا ہاتھ تھام لے۔ تیرے نبیؐ، تیری دنیا کے انسان کامل کی سیرت لکھ رہا ہوں۔ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ کہیں بہک نہ جاؤں۔ کہیں خلاف شانِ رسالتؐ اور خلافِ ادب کوئی لفظ میرے قلم سے نہ نکل جائے، تیرے ہی بھروسے پر یہ کارِ اہم میں نے اپنے ذمہ لیا ہے اور تیری ہی توفیق وقوت اسے تکمیل تک پہنچائے گی''۔
>
> (۲۴)

اگلے باب 'بارگاہ رسالتؐ پناہ میں' سیماب حضور باری تعالیٰ میں اپنی نااہلیت وعصیاں کا اعتراف کرنے کے بعد آپؐ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں:

''یارسول اللہ! آپ کا سیرۃ نگار آپ کے غلاموں کا غلام، آپ
پر صلوٰۃ والسلام بھیجنے والا ایک گناہ گار آپ کی توجہ کا سائل ہے۔
آپ کی ایک نگاہ کرم کا طلب گار ہے۔ ایک ایسی نگاہ جو اسے
کونین سے مستغنی کردے۔ ایک ایسی نگاہ جو اس کے دردِدل کا
درماں ہو اور ایک ایسی نگاہ جو اسرار وحقائق کے پردے اٹھا کر
اسے معراج فکر کے مقام بلند پر پہنچا دے''۔ (۲۵)

ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ، آپ کی سیرت اور آپ کے حالات قلم بند کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں کیونکہ قرآن مجید آپ کی سیرت کا خود ترجمان ہے، جس کی سیرت کا خدا مداح ہو اس کی سیرت انسان ضعیف البنیان کی زبان سے کیونکر بیان ہوسکتی ہے؟ لیکن سیماب اکبرآبادی نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ سیماب نے 'سیرۃ النبوی' میں ایک ایسی شخصیت پر گفتگو کی ہے جو مخلوقات میں کامل ترین تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل وافر تھی، انتہائی ذہین تھے، حواس قوی اور مضبوط تھے۔ زبان مبارک فصیح تھی، آپ کی سکنات وحرکات متعدل تھیں۔ تمام مخلوقات سے محبت وشفقت کے ساتھ پیش آنے والے۔ لوگوں کے ایمان کی خواہش رکھنے والے، باوفا، سابقہ تعلقات کا لحاظ رکھنے والے، انتہائی انصاف پسند، امانت دار، اعلیٰ جواں مرد تھے۔ سچی زبان والے، خوبصورت انداز والے، دنیا سے بے رغبت، اللہ سے ڈرنے والے، اس کے فرمانبردار، ڈٹ کر عبادت کرنے والے، اس کے شکر گزار اور ہر وقت اس کی طرف رجوع کرنے والے، اللہ کا حق خوب ادا کرنے والے، اپنے پروردگار پر توکل رکھنے والے اور اس سے بھرپور محبت کرنے والے اور تمام اخلاق وفضائل کے جامع تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن کی سچی تصویر ہے۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنے والے تھے اور جہاں اللہ ناراض ہوتا تھا وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوجایا کرتے تھے۔ سیماب کی کتاب 'سیرت النبوی' پڑھنے کے بعد ان سب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے ایک ایسے نوجوان کا نمونہ سامنے آتا ہے جو کردار کا صاف ستھرا اور اپنی قوم کے لوگوں اور معاشرے کے افراد کے ساتھ امانت دار ہے۔ ایک ایسے داعی کا نمونہ سامنے آتا ہے جو لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہے اور اپنے پیغام کی تبلیغ کے راستے میں پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ ایک ایسے سربراہ حکومت کا نمونہ سامنے آتا ہے جو پوری مہارت اور انتہائی حکمت کے ساتھ معاملات نپٹاتا ہے۔ ایک ایسے مثالی شوہر کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔ ایک ایسے باپ کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنی اولاد کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتا ہے۔ ایک ایسے مسلمان کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنے رب کا عبادت گزار اور اس کی طرف یکسو ہوتا ہے اور اپنے اہل وعیال اور اصحاب کے ساتھ بھی پُر لطف زندگی گزارتا ہے اور دقت و باریکی کے ساتھ دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھتا ہے۔

آگے کے ابواب کچھ اس طرح ہیں: ولادت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، عرب کا جغرافیہ، عرب کی اخلاقی پستی، عرب کی مرکزیت، ولادت خاتم المرسلین، فی النعت مصطفیٰ، احمد ومحمود وغیرہ، دائی حلیمہ سعدیہؓ، آغاز اصلاح، نبی الصادق الامین اور خانۂ کعبہ کی تعمیر نو، نبوت سے چند سال پہلے، آثار بعثت، نبوت کا پہلا دن، ورقہ بن نوبل کی شہادت، نزول وحی، آغاز تبلیغ، تبلیغ کے ابتدائی تین سال، طریقۂ تبلیغ، رسواللہ کوہ صفا پر، مقامی اجتماعات میں، قبیلہ قریش کی مخالفت، کھلی ہوئی مخالفت، اعتراف واختلاف، اختلاف بالعمل، بات ابوطالب تک پہنچی، ترغیبات، آخری کوشش، ہجرت حبشہ، ابی سینا میں کفار قریش کی پہلی شکست، عم رسول حضرت امیر حمزہ کا قبول اسلام، حضرت عمر فاروق کا قبول اسلام، شعب ابی طالب میں نظر بندی، ابوطالب اور خدیجہؓ کا انتقال، طائف کا سفر، مکہ میں واپسی، معطم بن عدی، عرب کے مشہور ساحر ضماد ازدی یمنی کا قبول اسلام، معراج النبی، اسلام کا چرچا مکہ سے یمن اور مدینے تک، بیعت عقبہ اولیٰ،

بیعت عقبہ ثانیہ، ہجرت کا آغاز، آنحضرت صلی علیہ وسلم کے قتل کی سازش، رسولؐ خدا کی ہجرت کا معجزہ، غار ثور میں، اطلاع اور مشرکین کی گھبراہٹ، رسول کریم پر ہجرت کے تاثرات، آنحضرتؐ کا مدینہ منورہ میں ورود، قبا میں ورود، مدینہ مدینہ میں جلوہ افروزی، اسلام کا پہلا خطبہ، مسجد نبوی کی تعمیر، مہاجرین وانصار، مدینہ کی عام حالت، عبداللہ بن ابی بن سلول منافق، بین الاقوامی معاہدہ، قریشیوں کی سازشیں، مدافعت، غزوۂ بدر، حکم جہاد، تصادم، قتل ابوجہل، انجام اور جائزہ، اسیرانِ بدر کے ساتھ حسن سلوک، سن ۲ ہجری کے دوسرے اہم واقعات، قریش کے بوکھلاہٹ، غزوۂ سویق، جنگ احد، چھوٹے چھوٹے جھگڑے، غزوۂ خندق، غزوۂ بنی مصطلق، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، ایک اور آسانی، سلاطین عالم کو دعوت اسلام، غزوۂ خیبر، بعداز جنگ، کھانے میں زہر، جنگ موتہ، فتح مکہ، ابوسفیان حلقہ اسلام میں، مکہ معظّمہ میں جیوش اسلام کا ورود، معافیاں، غزوۂ حنین، قیدیوں کی رہائی، لات کو مات، غزوۂ تبوک، مسجد ضرار کا فتنہ، سرایا، وفود کی باریابی، وفد عذرہ، وفد خولان، وفد دوس، وفد صدا، وفد ثقیف، وفد بنو حنیفہ، وفد طارق، وفد بنو اسد، وفد طے، وفد اشعریہ، وفد ازد، وفد ہمدان، وفد نجیب، وفد بنی سعد، وفد بھرا، وفد محارب، وفد بنو حارث، وفد بنی عیش، وفا عامد، وفد بنی فزارہ، وفد نجران، وفد نخع، حج اکبر، حجۃ الوداع، روانگی جانب مکہ، ورود مکہ، صفا و مروہ، میدان عرفات، خطبہ حجۃ الوداع، عرفات سے روانگی، قربانی، خم غدیر، وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تنظیم ملت مکمل ہوچکی تھی۔ اصفاف صفہ، ائمہ مساجد، مؤذن، عسکری تنظیم، فیصلہ، مقدمات، مراسلات، دول اسلام، تحصیل دار، قوانین شریعت، آغاز علالت، دعائے شفا، واقعہ قرطاس، حالات بعد وفات، سیرت کی خصوصیات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض مخصوص ارشادات عالی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولا دامجاد اور آخر میں سیرۃ النبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایک عملی درس ہے۔ اس علاوہ سیماب نے اس کتاب میں مختصر الفاظ میں

سیرت کا ایک ایک واقعہ بیان کر کے اس سے دروس، نصائح، نتائج اور احکام مستنبط کئے ہیں کہ سیرت کا کوئی واقعہ پڑھنے کے بعد قاری میں یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ اس واقعہ سے اسے کیا نصیحت ملتی ہے۔ اسی لیے ان کی اس کتاب کو علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

بہر حال اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس پر کچھ لکھا جانا چاہیے تھا لیکن اس کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ لوگوں نے شاید یہ سمجھ کر ان کو نظرانداز کیا کہ وہ بس روایتی قسم کے تخلیق کار ہیں۔ ہاں ایک بات اور کہ ''سیرۃ النبوی'' کے عنوانات بھی علمی لحاظ سے بہت مفید اور دلچسپ ہیں۔ جگہ جگہ قرآن شریف کی آیتیں اور احادیث بھی نقل کی ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے ''سیرۃ النبی'' میں بالکل سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے، اس کی عبارت میں اس قدر روانی ہے کہ کہیں آورد کا احساس نہیں ہوتا۔

حواشی

(۱) دستورالاصلاح: سیماب اکبر آبادی، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، بار اول ۱۹۴۰، ص ۷

(۲) ایضاً، ص ۶

(۳) ایضاً، ص ۱۶

(۴) ایضاً، ص ۷

(۵) ایضاً، ص ۷

(۶) ایضاً، ص ۱۰

(۷) ایضاً، ص ۱۳

(۸) ایضاً، ص ۱۳

(۹) ایضاً، ص ۱۵

(۱۰) ایضاً، ص ۱۶

(۱۱) ایضاً، ص ۱۶

(۱۲) ایضاً، ص ۳۲

(۱۳) ایضاً، ص ۳۲

(۱۴) ایضاً، ص ۳۳، ۳۴

(۱۵) بحوالہ سیماب اکبر آبادی: حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۹، ص ۸۳

(۱۶) مطبوعات و مخطوطاتِ سیماب: مرتبہ، افتخار امام صدیقی (رسالہ 'شاعر' ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر) ۱۹۹۷، ص ۸۳

(۱۷) کلیم عجم (خطبات شاعری) سیماب اکبر آبادی، مطبوعہ رفاہ عام پریس، آگرہ، طبع اول

۱۹۳۶،ص ۱۷

(۱۸) کلیم عجم (خطبات شاعری) سیماب اکبرآبادی، مطبوعہ رفاہ عام پریس، آگرہ، طبع اول ۱۹۳۶،ص ۲۵

(۱۹) ایضاً ص:۱۰۱

(۲۰) مکاتیب سیماب اکبرآبادی: (ترتیب) ضیا فتح آبادی، کلر پرنٹنگ پریس، دہلی، بار اول ۱۹۸۱،ص ۷

(۲۱) ایضاً:ص ۷

(۲۲) رازِ عروض: سیماب اکبرآبادی، مطبوعہ آگرہ اخبار پریس، آگرہ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۳، ص ۲

(۲۳) ایضاً:ص ۶، ۷

(۲۴) سیرۃ النبوی: سیماب اکبرآبادی، تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور، طبع اول ۱۹۴۹،ص ۴، ۵

(۲۵) ایضاً:ص ۶، ۷

ماحصل

عاشق حسین سیماب اکبرآبادی کے دادا چودھری نبی بخش نے اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بخارا سے بغرض تجارت ہندوستان آکر آگرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی کچھ دنوں کے بعد ۱۸۸۰ میں سیماب آکبرآبادی کی پیدائش ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر مشہور اساتذۂ وقت سے اردو،عربی،فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں گورنمنٹ کالج اجمیر سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا لیکن ۱۸۹۷ میں صرف پچاس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو جانے کے وجہ سے گھریلو ضروریات پوری کرنے کی خاطر ان کو تعلیم منقطع کرنی پڑی۔اولاً آگرہ میں سیٹھ چھوٹانی کے یہاں ملازمت کی لیکن کچھ عرصہ بعد کانپور جاکر شیخ عبد الرزاق کمیشن ایجنٹ کے یہاں حساب کتاب دیکھنے پر مامور ہوئے۔سال بھر بعد آگرہ واپس آکر شادی کی اور ۱۹۸۹ میں دوبارہ کانپور جاکر کلرک کی نوکری کی اور اسی سال داغ دہلوی کی شاگردگی اختیار کی۔اس کے بعد اجمیر جاکر ریلوے آڈٹ آفس میں کلرک ہوگئے۔پانچ سال ریلوے کی ملازمت میں رہ کر بعض جسمانی عوارض کی بنا پر استعفیٰ دے کر آگرہ واپس آگئے اور کچھ عرصہ آگرہ قلعہ کے ملٹری ورکس آفس میں ملازمت کی۔ملازمت سے بالکلیہ آزاد ہونے سے قبل کچھ عرصہ ٹونڈلہ میں بھی رہے اور پھر تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ میں کراچی منتقل ہونے تک آگرہ میں ہی سکونت رہی،کراچی کے قیام کے دوران ان پر فالج کا حملہ ہوا اور ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ کو اس دنیا کو خیرآباد کہہ دیا۔شاید یہ ان کے تخلص کی تاثیر تھی کہ وہ آخری وقت تک سیماب ہی کی طرح بکھرتے اور سمٹتے رہئے اور غالباً اسی رودادِ غم کو انھوں نے اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے:

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سیماب آ کبرآبادی کا یہ شعر بھلے ہی اپنے جیسے بہت سے پریشاں حال لوگوں کے ذریعہ اپنے کنبہ کی پرورش،کسب معاش،جسمانی بیماری وغیرہ کے سلسلہ میں دنیاوی صعوبتوں کوجھیلنے میں قدرمشترک کی نشان دہی کرتا ہرلیکن انھوں نے اپنی خداداد علمی وفنی صلاحیتوں کو بروئے کارلا کر دنیائے شعروادب کی جوفقیدالمثال خدمات انجام دی اور جس طرح صاحب استعداد افراد کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تربیت کی نیز عوام میں صالح فکر کی آبیاری کے جو کارنامےانجام دیئےان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ واقعی اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔

سیماب نے اپنے اجمیر قیام کے دوران طرحی غزلیات کی اشاعت کے لئے ایک گلدستہ بعنوان ’فانوس خیال‘ جاری کیا تھا۔۱۹۲۲میں آگرہ واپسی پر’قصرالادب‘ نام کےادارے کی بنیاد رکھی اوراس کےتحت ۱۹۲۳ میں ایک جریدہ’ پیمانہ‘ نام سے شروع کیا ۱۹۲۵ تک جاری رہا۔’پیمانہ‘ کی شکستگی کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لئے لاہور چلے گئے پھر واپس آ کر دلی میں ایک دوسراادارہ’دارالتصنیف‘ نام سے قائم کیالیکن دلی کا قیام راس نہ آیااورآگرہ واپس آ کر ۱۹۲۹ میں ہفتہ وار’تاج‘ جاری کیااگلے برس ۱۹۳۰ میں مشہور جریدا’شاعر‘ کااجرا کیاجوکہ پندرہ روزہ تھا،۱۹۳۳ کے بعد وہ ماہانہ رسالہ میں تبدیل ہوگیااورتاحال اردوزبان وادب کی خدمت کررہا ہے۔

سیماب نے ۱۹۲۱میں قائم کئے گئے’قصرالادب‘ کےذریعہ میر،غالب،نظیر کے دبستان اکبرآبادمیں اپنی فکرواجتہاد سے نہ صرف نئی روح پھونکی بلکہ تاحیات شاعری کو پروان چڑھایااور شاعری کومقصدیت سے سجاکرادب وفن کی خدمت انجام دی۔ان کے صدہا شاگردوں میں راز چاند پوری ، الطاف مشہدی،مخمور جالندھری،اعجاز صدیقی،الم مظفرنگری،ضیاجالندھری،ساغر نظامی،نثاراٹاوی،شفاگوالیاری،نوربجنوری،افسراحمدنگری،حسامی مانکپوری اورآغاز برہانپوری وغیرہ نے اپنے استاد کی شعری روایت کومزید ترقی دے کراستاد کا نام روشن کیا۔سیماب کا

طریقہ اصلاح بھی منفرد تھا۔ اپنے شاگردوں کے لئے انھوں نے جو اصول وضوابط مرتب کئے تھے وہ کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) اصلاح کے لئے غزل بھیجنے سے قبل از خود اچھی طرح نوک پلک درست کر لیں تاکہ ترمیم و تنسیخ کی زیادہ گنجائش نہ رہے نیز یہ کہ اشعار کے درمیان کافی فصل ہو اور کاغذ کا آخری ایک چوتھائی حصہ خالی چھوڑا جائے تاکہ اصلاح لکھنے میں دشواری نہ ہو۔

(۲) شاگرد کو ضروری شعری اصطلاحات اور فن عروض سے واقفیت ہونا چاہئے۔

(۳) قدیم وجدید شعرائے کرام کے کم از کم پانچ سو اشعار یاد ہونے چاہئے۔ متروکات و معائب سخن نیز زبان کی صحت کا خیال رکھا جائے۔

(۴) سوقیانہ کلام اور توہین آمیز اشعار سے گریز کیا جائے۔

(۵) ضروری ہو تو غیر مستعمل یا غیر معروف الفاظ کا ستعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۶) بغیر اصلاح کرئے کلام کو نہ تو شائع کرایا جائے اور نہ کہیں پڑھا جائے۔

(۷) اگر کسی دوسرے استاد سے اصلاح لی جا چکی ہو تو اس کلام کو اصلاح کے لئے قطعی نہ بھیجا جائے۔

(۸) اگر کسی غزل کے تمام یا اکثر اشعار اصلاح طلب ہوئے تو ایسی غزل پر اصلاح نہیں دی جائے گی۔

سیماب نے داغ کی شاگردی تو ضرور اختیار کی لیکن ان کے کلام میں داغ کے لب ولہجہ کی صرف جھلک ہی دکھائی دیتی ہے۔ سیماب کی غزلیات پڑھ کر قاری کو برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں رعنائی و دلکشی اور فنکارانہ چابکدستی ہی نہیں بلکہ صالح اقدار، متانت و سنجیدگی اور عارفانہ خیالات کے تحت مسائل زندگی کے تمام احساسات کی کامیاب ترجمانی کی گئی ہے اور ان کی غزلیات میں جلوۂ صدرنگ اپنی بھرپور غنائیت کے ساتھ موجود ہے۔ مولانا الطاف حسین

حالی نے قدیم شعرا کے طرز سے انحراف کرتے ہوئے غزل کو عشق و عاشقی کے تنگ کوچہ سے نکال کر اصلاح غزل کی جو ابتدا کی تھی، اس روایت کو سیماب نے بڑی عمدگی سے آگے بڑھایا۔ ہم اپنی بات کو وضاحت کے لئے ان کی غزلیات کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں:

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کریں، آ رہا ہوں میں

☆

خلوص دل سے جو سجدہ ہوا اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا، جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

☆

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

☆

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے پر
ہزاروں دل میں انگارے بھرے ہیں لگ گئی ہوگی

☆

دنیا ہے خواب، حاصل دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

☆

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

سیماب کے غزلیہ کلام سے یہاں چند اشعار ہی درج کیے گئے ہیں جو اس امر کے غماز

ہیں کہ انھوں نے غزل کے قدامتی فکر سے ہٹ کر اپنے علوئے تخیل سے ایک نئے رنگ و آہنگ کی بازیافت کی جس میں جمالیاتی حس اور وقیع خیالات کا مساویانہ انداز ملتا ہے۔

سیماب کی نظموں میں بھی بصیرت ،ادراک و آگہی سموئے ہوئے جلوہ ہائے ہزار دکھائے دیتے ہیں۔انھوں نے تاریخی، ادبی، اصلاحی،قومی، سیاسی، رثائی،ترجمہ شدہ، بچوں کی نظمیں حتیٰ کہ ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی کرنے والی نظمیں بڑی تعداد میں کہی ہیں۔ابن آذر،ابن عمران،ابن مریم،گرونانک،سلطان شہید وغیرہ ان کی شاہکار تاریخی نظمیں ہیں۔ بچوں کے لئے جو نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں بچوں کی نفسیات اور جذبات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔مولانا روم کی مثنوی (مثنوی معنوی) کا پر اثر ترجمہ 'الہام منظوم' کے نام سے کیا اور اسی طرح قرآن پاک کے پورے تیسوں پاروں کا ترجمہ (وحی منظوم) ان کی پرگوئی کی واضح مثالیں ہیں۔ترقی پسند افکار لئے ہوئے ان کی نظمیں مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام،طوفان کی گرج، بھوکا ہندوستان،مزدور اور کسان اور اے ہجرہ نشینو وغیرہ میں ترقی پسند رجحانات کی بھر پور ترجمانی کے ساتھ ادبیت کی چاشنی اور شعریت کی دل آویزی موجود ہے۔سیماب وطن کی محبت سے سرشار ہو کر وطن کی عظمت کے گن ہی نہیں گاتے بلکہ اس کی زبوحالی کا ادراک کر کے آنسو بھی بہاتے ہیں۔چنانچہ اپنے ایک صدارتی خطبے میں شرکائے مشاعرہ سے فرمایا کہ:

> ''اپنے وطن کر سرد و گرم ،رطب و یابس سے متاثر ہو کر نشاطیہ یا المیہ اشعار کہیں تو ہماری شاعری دوسری زبانوں کی شاعری سے ممتاز ہو سکتی ہے۔ بلکہ آج بھی ہمارے ملک میں حسان ،فردوسی اور شیکسپیئر سے بھی بہتر شاعر پیدا ہو سکتے ہیں۔''

انسانیت اور وطنیت کے جذبہ کے تحت سیماب ہندوستانی نوجوانوں میں قومیت اور انسان دوستی کے اوصاف پیدا کرنے کہ خواہش مند ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر سیماب بھی اقبال کی طرح سچے وطن پرست اور عظمت مشرق کے دلدادہ ہیں۔ان کی نظم ہم ہندوستانی، حب الوطنی،

قوم پرستی اور انسان دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ان کی سیاسی نظموں میں گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مسیح الملک اور ظفر علی خاں کے ساتھ دیگر عالمی سیاسی شخصیات کا بھی ذکر ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں مجلس اقوام اور بساط سیاست بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ سیماب کی رثائی مجموعوں سرودِغم اور نفیرِغم سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ انھوں نے رثائی کلام کو آہ وبکا کی حدود سے نکال کر قوم کے تزکیہ کا وسیلہ بنایا۔

سیماب نے غزل اور نظم کی مختلف ہیئتوں میں طبع آزمائی کے ساتھ رباعی جیسی صنف سخن میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں اور بڑی دل پذیر رباعیات تخلیق کی ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہر نفس پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں
جھگڑے ہیں اور انسان ہے اور کچھ بھی نہیں
تھی وسعت عالم کبھی جنت یکتا
اب جنگ کا میدان ہے اور کچھ بھی نہیں

علامہ سیماب اکبرآبادی نے تمام تر دنیاوی الجھنوں کے رہتے ہوئے اپنی فکر رسا اور جودت طبع کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ ان کی اختراعی ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشاعروں کی مجالس کو صرف سخن طرازی اور سماعت سخن کی اسٹیج تک محدود رکھنے کے بجائے ان شعرائے کرام اور سخن فہم حضرات کی تربیت گاہ بنانے کی غرض سے صدر مشاعرہ کے صدارتی خطبہ کی بنا ڈالی۔ سیماب ہی نے دیگر شعرا سے بہت پہلے آزاد نظم کو اردو میں ڈھالا تھا۔ ان کے اس ہئیتی تجربہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ ۱۹۳۵ تک مختلف موضوعات پر ۲۸۴ کتابیں تصنیف کر چکے تھے، جن میں کیمیائے سخن، کلیم عجم، سدرۃ المنتہٰی، کار امروز، ساز وآہنگ، شعر انقلاب، عالم آشوب، نفیرِغم، سرودِغم، راز عروض، دستور الاصلاح، کرشن گیتا، سیرت النبی،

الہام منظوم اور وحی منظوم وغیرہ دنیائے شعروادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

میں بلا تکلف اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ سیماب جیسے قادرالکلام شاعر اور میدان سخن کے عظیم سپاہی کی جس طرح قدر دانی ہونا چاہیے تھی، اس میں اہل زبان وفن سے خاصی کوتاہی ہوتی ہے حتیٰ کہ آج تک نہ تو کسی صاحب ذوق نے اور نہ ہی کسی صاحب انجمن یا سرکاری ادارے نے ان کے کلیات شائع کرانا ضروری خیال کیا۔ یہ سعادت بھی ان کے پوتے اور رسالہ ''شاعر'' کے حالیہ ایڈیٹر افتخار امام صدیقی کے حصہ میں آنا تھی جنہوں نے صاحب فراش رہتے ہوئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور امید ہے کہ عنقریب کلیات سیماب زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائقین فن کی تشنگی دور کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مرتب	ناشر/مطبع	سنہ اشاعت
۱	الہام منظوم جلد اول تا ششم	سیماب اکبرآبادی	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	سنہ ندارد
۲	دستورالاصلاح	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۰
۳	رازعروض، طبع اول	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۲۳
۴	سازوآہنگ، طبع اول	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۱
۵	سرودِغم	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ پرچم، کراچی	۱۹۵۸
۶	سازحجاز	سیماب اکبرآبادی	سیماب اکیڈمی، پاکستان	۱۹۸۲
۷	سدرۃالمنتہیٰ	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۶
۸	سیرۃالنبوی، طبع اول	سیماب اکبرآبادی	تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور	۱۹۴۹
۹	شعرانقلاب	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۷
۱۰	عالم آشوب	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۴
۱۱	کلیم عجم	سیماب اکبرآبادی	سیماب اکادمی، پاکستان	۱۹۸۵
۱۲	کارامروز، طبع دوم	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۷
۱۳	لوح محفوظ	سیماب اکبرآبادی	سیماب اکادمی، پاکستان	۱۹۹۴
۱۴	نفیرغم	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ پرچم، کراچی	۱۹۵۸
۱۵	نیستاں	سیماب اکبرآبادی	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۲۵
۱۶	وحی منظوم	سیماب اکبرآبادی	پرچم پرنٹنگ پریس، کراچی	سنہ ندارد

ثانوی مآخذ

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مرتب	ناشر/مطبع	سنہ اشاعت
۱	آئینہ اصلاح	جوش ملسیانی	مرکز تصنیف وتالیف نکودر جالندھر	۱۹۶۹
۲	آہنگ اور عروض	کمال احمد صدیقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،	۲۰۰۴
۳	آب حیات	محمد حسین آزاد	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۵
۴	اصلاح مع ایضاح	شوق نیموی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۲
۵	اصلاح سخن	شوق سندیلوی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۶
۶	ایضاح سخن بتوضیح اصلاح سخن	تمنا عمادی مجیبی	عافین پریس ڈھاکہ	سنہ ندارد
۷	ابر احسنی اور اصلاح سخن	مرتبین عنوان چستی و نعیم الدین رضوی	اردو سماج جامعہ نگر	۱۹۹۰
۸	اثبات ونفی	شمس الرحمٰن فاروقی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۲۰۱۱
۹	اردو شاعری میں اصلاح سخن کی روایت	ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ	مجلس ترقی اد، لاہور، اشاعت اول، مئی	۲۰۰۸
۱۰	اردو شاعری پر ایک نظر (جلد اول)	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۲۰۱۱
۱۱	اردو کا ابتدائی زمانہ	شمس الرحمٰن فاروقی،	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی،	۲۰۱۱
۱۲	اصلاح نامہ	عنوان چشتی	شیروانی آرٹ پرنٹر، دہلی	۱۹۹۷
۱۳	اصلاح الاصلاح	ابر حسنی گنوری	مرتضی بروقی پریس، رامپور	۱۹۴۹

۱۴	ابر حسنی گنوری حیات اور ادبی کارنامے	ڈاکٹر یسین علی عثمانی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۱۴
۱۵	اردو شاعری پر ایک نظر (جلد دوم)	کلیم الدین احمد	ایوان اردو، پٹنہ	۱۹۶۶
۱۶	ادبی جائزے	غلام مصطفیٰ خاں	الکتاب آرام باغ روڈ، کراچی	۱۹۶۵
۱۷	اردو غزل	یوسف حسین خاں	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۵۷
۱۸	بہار طفلی	تلوک چند محروم	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی	۱۹۶۰
۱۹	تاریخ ادب اردو	سیدہ جعفر، گیان چند جین	قومی کونسل فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸
۲۰	ترجمہ کافن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۲۰۱۱
۲۱	جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری	مکتبہ عزم و عمل، کراچی	۱۹۶۶
۲۲	داستان چند	راز چاندپوری	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۸
۲۳	داستان عہد گل	راز چاندپوری	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۱
۲۴	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر: عہد میر تک	پروفیسر محمد حسن	اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۹
۲۵	ذکر سیماب	ضیا فتح آبادی	خواجہ پریس، دہلی	۲۰۰۹
۲۶	رباعیات محروم، بار دوم	تلوک چند محروم	رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ، نئی دہلی	۱۹۵۴
۲۷	رباعیات حکیم عمر خیام نیشاپوری	ابوالفتح غیاث الدین عمر بن ابراہیم نیشاپوری	انتشارات سفیر صبح، تہران	۲۰۰۰
۲۸	سیماب کی نظمیہ شاعری	ڈاکٹر زرینہ ثانی	بزم سیماب، دہلی	۱۹۸۴
۲۹	سیماب اکبرآبادی	حامد اقبال صدیقی	ساہتیہ اکادمی، دہلی	۲۰۰۹

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۳۰	شاعری کی تنقید	ابوالاکلام کاسمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۱
۳۱	عروض آہنگ اور بیان	شمس الرحمٰن فاروقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۱
۳۲	فن ترجمہ نگاری	خلیق انجم	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۹۶
۳۳	کتاب شناسی	ظ۔انصاری	بمبئی یونیورسل پریس	۱۹۸۱
۳۴	مشاطۂ سخن	صفدر مرزاپوری	میتھوڈسٹ پبلیشنگ ہاؤس لکھنؤ	۱۹۳۶
۳۵	مالہ وماعلیہ	نیاز فتح پوری	تقسیم کار مکتبہ جدید	سنہ ندارد
۳۶	میری اصلاحیں	ابرحسنی گنوری	اعلی پرنٹنگ پریس دہلی	سنہ ندارد
۳۷	مثنوی مولوی معنوی دفتر اول	مولانا قاضی سجاد حسین	سب رنگ کتاب گھر، دہلی	۱۹۷۴
۳۸	مثنوی مولوی معنوی دفتر دوم اور سوم	مولانا قاضی سجاد حسین	سب رنگ کتاب گھر، دہلی	۱۹۷۶
۳۹	مثنوی مولوی معنوی دفتر چہارم	مولانا قاضی سجاد حسین	سب رنگ کتاب گھر، دہلی	۱۹۷۷
۴۰	مثنوی مولوی معنوی دفتر پنجم، ششم	مولانا قاضی سجاد حسین	سب رنگ کتاب گھر، دہلی	۱۹۷۸
۴۱	مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی جد اول تا ششم	مولوی محمد یوسف علی	منشی نول کشور، لکھنؤ	سنہ ندارد
۴۲	مکاتیب سیماب اکبرآبادی بار اول	ترتیب: ضیا فتح آبادی	کلر پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۸۱

۴۳	نئی شعری روایت	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۸
۴۴	ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی ادیب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۸

رسائل و جرائد

۱	احسن، سیماب نمبر	رامپور	مئی ۱۹۵۱
۲	الوارث، سیماب نمبر	بمبئی	جنوری، فروری ۱۹۴۹
۳	پرچم، تعزیت نمبر	کراچی	۱۹۵۱
۴	رسالہ ''شاعر''	آگرہ	جولائی ۱۹۳۵
۵	شاعر، کارامروز نمبر	آگرہ	۱۹۳۵
۶	شاعر، کارامروز نمبر	آگرہ	جولائی ۱۹۳۷
۷	شاعر، اسکول نمبر (کارواں)	آگرہ	۱۹۳۷
۸	شاعر	آگرہ	اپریل ۱۹۴۴
۹	شاعر	بمبئی	اپریل ۱۹۵۱
۱۰	شاعر، خاص نمبر	بمبئی	۱۹۵۸
۱۱	شاعر، خاص نمبر	بمبئی	۱۹۶۳
۱۲	شاعر، سالنامہ	بمبئی	۱۹۶۴
۱۳	شاعر، سالنامہ	آگرہ	اپریل ۱۹۴۲
۱۴	شاعر	بمبئی	اگست، ستمبر ۱۹۶۱

۱۵	شاعر، ماہنامہ	آگرہ	نومبر۱۹۶۵
۱۶	شاعر	بمبئی	اگست۱۹۶۶
۱۷	شاعر، خاص نمبر	بمبئی	جنوری۱۹۶۹
۱۸	ماہنامہ ''شاعر''	بمبئی	۱۹۷۶
۱۹	شاعر	بمبئی	۱۹۷۹
۲۰	رسالہ ''شاعر'' ہم عصر اردو ادب نمبر	بمبئی	مئی تا دسمبر۱۹۹۷
۲۲	ماہنامہ ''کندن'' سیماب نمبر		فروری۱۹۹۳
۲۳	نگار	کراچی	اپریل۱۹۳۵

سیماب اکبرآبادی اور ان کی ادبی خدمات

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مقالہ نگار

مقیم احمد

نگراں

پروفیسر احمد محفوظ

شعبۂ اردو

فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی

SEEMAB AKBARABADI AUR UNKI ADABI KHIDMAT

Thesis

submitted to

Jamia Millia Islamia

In partial fulfilment of the requirements of the award of the Degree of

Doctor of Philosophy

URDU

by

Moqeem Ahmad

Under the supervision of

Prof. Ahmad Mahfooz

Department of Urdu
Faculty of Humanities and Languages
JAMIA MILLIA ISLAMIA
New Delhi

ماحصل

عاشق حسین سیماب اکبرآبادی کے دادا چودھری نبی بخش نے اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بخارا سے بغرض تجارت ہندوستان آکر آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی کچھ دنوں کے بعد ۱۸۸۰ میں سیماب آکبرآبادی کی پیدائش ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر مشہور اساتذۂ وقت سے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں گورنمنٹ کالج اجمیر سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا لیکن ۱۸۹۷ میں صرف پچاس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو جانے کے وجہ سے گھریلو ضروریات پوری کرنے کی خاطر ان کو تعلیم منقطع کرنی پڑی۔اولاً آگرہ میں سیٹھ چھوٹانی کے یہاں ملازمت کی لیکن کچھ عرصہ بعد کانپور جا کر شیخ عبد الرزاق کمیشن ایجنٹ کے یہاں حساب کتاب دیکھنے پر مامور ہوئے۔سال بھر بعد آگرہ واپس آکر شادی کی اور ۱۹۸۹ میں دوبارہ کانپور جا کر کلرک کی نوکری کی اور اسی سال داغ دہلوی کی شاگردگی اختیار کی۔اس کے بعد اجمیر جا کر ریلوے آڈٹ آفس میں کلرک ہو گئے۔پانچ سال ریلوے کی ملازمت میں رہ کر بعض جسمانی عوارض کی بنا پر استعفیٰ دے کر آگرہ واپس آگئے اور کچھ عرصہ آگرہ قلعہ کے ملٹری ورکس آفس میں ملازمت کی۔ملازمت سے بالکلیہ آزاد ہونے سے قبل کچھ عرصہ ٹونڈلہ میں بھی رہے اور پھر تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ میں کراچی منتقل ہونے تک آگرہ میں ہی سکونت رہی، کراچی کے قیام کے دوران ان پر فالج کا حملہ ہوا اور ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ کو اس دنیا کو خیرآباد کہہ دیا۔شاید یہ ان کے تخلص کی تاثیر تھی کہ وہ آخری وقت تک سیماب ہی کی طرح بکھرتے اور سمٹتے رہے اور غالباً اسی روداد غم کو انھوں نے اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے:

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سیماب آ کبرآبادی کا یہ شعر بھلے ہی اپنے جیسے بہت سے پریشاں حال لوگوں کے ذریعہ اپنے کنبہ کی پرورش،کسب معاش،جسمانی بیماری وغیرہ کے سلسلہ میں دنیاوی صعوبتوں کو جھیلنے میں قدر مشترک کی نشان دہی کرتا ہر لیکن انھوں نے اپنی خداداد علمی وفنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دنیائے شعروادب کی جو فقید المثال خدمات انجام دی اور جس طرح صاحب استعداد افراد کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تربیت کی نیز عوام میں صالح فکر کی آبیاری کے جو کارنامے انجام دیئے ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ واقعی اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔

سیماب نے اپنے اجمیر قیام کے دوران طرحی غزلیات کی اشاعت کے لئے ایک گلدستہ بعنوان ’فانوس خیال‘ جاری کیا تھا۔۱۹۲۲ میں آگرہ واپسی پر ’قصرالادب‘ نام کے ادارے کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت ۱۹۲۳ میں ایک جریدہ ’پیمانہ‘ نام سے شروع کیا ۱۹۲۵ تک جاری رہا۔’پیمانہ‘ کی شکستگی کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لئے لاہور چلے گئے پھر واپس آ کر دلی میں ایک دوسرا ادارہ ’دارالتصنیف‘ نام سے قائم کیا لیکن دلی کا قیام راس نہ آیا اور آگرہ واپس آ کر ۱۹۲۹ میں ہفتہ وار ’تاج‘ جاری کیا اگلے برس ۱۹۳۰ میں مشہور جریدا ’شاعر‘ کا اجرا کیا جو کہ پندرہ روزہ تھا،۱۹۳۳ کے بعد وہ ماہانہ رسالہ میں تبدیل ہو گیا اور تاحال اردو زبان وادب کی خدمت کر رہا ہے۔

سیماب نے ۱۹۲۱ میں قائم کئے گئے ’قصرالادب‘ کے ذریعہ میر،غالب،نظیر کے دبستان اکبرآباد میں اپنی فکر واجتہاد سے نہ صرف نئی روح پھونکی بلکہ تاحیات شاعری کو پروان چڑھایا اور شاعری کو مقصدیت سے سجا کر ادب وفن کی خدمت انجام دی۔ان کے صدہا شاگردوں میں راز چاند پوری ، الطاف مشہدی،مخمور جالندھری،اعجاز صدیقی،الم مظفر نگری،ضیا جالندھری،ساغر نظامی،نثار اٹاوی،شفا گوالیاری،نور بجنوری،افسر احمد نگری،حسامی مانکپوری اور آغاز برہانپوری وغیرہ نے اپنے استاد کی شعری روایت کو مزید ترقی دے کر استاد کا نام روشن کیا۔سیماب کا

طریقہ اصلاح بھی منفرد تھا۔ اپنے شاگردوں کے لئے انھوں نے جو اصول وضوابط مرتب کئے تھے وہ کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) اصلاح کے لئے غزل بھیجنے سے قبل از خود اچھی طرح نوک پلک درست کرلیں تا کہ ترمیم و تنسیخ کی زیادہ گنجائش نہ رہے نیز یہ کہ اشعار کے درمیان کافی فصل ہو اور کاغذ کا آخری ایک چوتھائی حصہ خالی چھوڑا جائے تا کہ اصلاح لکھنے میں دشواری نہ ہو۔

(۲) شاگرد کو ضروری شعری اصطلاحات اور فن عروض سے واقفیت ہونا چاہئے۔

(۳) قدیم و جدید شعرائے کرام کے کم از کم پانچ سو اشعار یاد ہونے چاہئے۔ متروکات و معائب سخن نیز زبان کی صحت کا خیال رکھا جائے۔

(۴) سوقیانہ کلام اور توہین آمیز اشعار سے گریز کیا جائے۔

(۵) ضروری ہو تو غیر مستعمل یا غیر معروف الفاظ کا ستعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۶) بغیر اصلاح کرئے کلام کو نہ تو شائع کرایا جائے اور نہ کہیں پڑھا جائے۔

(۷) اگر کسی دوسرے استاد سے اصلاح لی جا چکی ہو تو اس کلام کو اصلاح کے لئے قطعی نہ بھیجا جائے۔

(۸) اگر کسی غزل کے تمام یا اکثر اشعار اصلاح طلب ہوئے تو ایسی غزل پر اصلاح نہیں دی جائے گی۔

سیماب نے داغ کی شاگردی تو ضرور اختیار کی لیکن ان کے کلام میں داغ کے لب ولہجہ کی صرف جھلک ہی دکھائی دیتی ہے۔ سیماب کی غزلیات پڑھ کر قاری کو برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں رعنائی و دلکشی اور فنکارانہ چابکدستی ہی نہیں بلکہ صالح اقدار، متانت و سنجیدگی اور عارفانہ خیالات کے تحت مسائل زندگی کے تمام احساسات کی کامیاب ترجمانی کی گئی ہے اور ان کی غزلیات میں جلوۂ صدرنگ اپنی بھرپور رعنائیت کے ساتھ موجود ہے۔ مولانا الطاف حسین

حالی نے قدیم شعرا کے طرز سے انحراف کرتے ہوئے غزل کو عشق و عاشقی کے تنگ کوچہ سے نکال کر اصلاح غزل کی جو ابتدا کی تھی، اس روایت کو سیماب نے بڑی عمدگی سے آگے بڑھایا۔ ہم اپنی بات کو وضاحت کے لئے ان کی غزلیات کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں:

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کریں، آرہا ہوں میں

☆

خلوص دل سے جو سجدہ ہوا اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا، جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

☆

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

☆

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے پر
ہزاروں دل میں انگارے بھرے ہیں لگ گئی ہوگی

☆

دنیا ہے خواب، حاصل دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

☆

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

سیماب کے غزلیہ کلام سے یہاں چند اشعار ہی درج کیے گئے ہیں جو اس امر کے غماز

ہیں کہ انھوں نے غزل کے قدامتی فکر سے ہٹ کر اپنے علوئے تخیل سے ایک نئے رنگ و آہنگ کی بازیافت کی جس میں جمالیاتی حس اور وقیع خیالات کا مساویانہ انداز ملتا ہے۔

سیماب کی نظموں میں بھی بصیرت ،ادراک و آگہی سموئے ہوئے جلوہ ہائے ہزار دکھائے دیتے ہیں۔انھوں نے تاریخی، ادبی، اصلاحی، قومی، سیاسی، رثائی، ترجمہ شدہ، بچوں کی نظمیں حتیٰ کہ ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی کرنے والی نظمیں بڑی تعداد میں کہی ہیں۔ابن آذر، ابن عمران، ابن مریم، گرونانک، سلطان شہید وغیرہ ان کی شاہکار تاریخی نظمیں ہیں۔ بچوں کے لئے جو نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں بچوں کی نفسیات اور جذبات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔مولانا روم کی مثنوی (مثنوی معنوی) کا پر اثر ترجمہ 'الہام منظوم' کے نام سے کیا اور اسی طرح قرآن پاک کے پورے تیسوں پاروں کا ترجمہ (وحی منظوم) ان کی پرگوئی کی واضح مثالیں ہیں۔ترقی پسند افکار لئے ہوئے ان کی نظمیں مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام، طوفان کی گرج، بھوکا ہندوستان، مزدور اور کسان اور اے ہجرہ نشینو وغیرہ میں ترقی پسند رجحانات کی بھرپور ترجمانی کے ساتھ ادبیت کی چاشنی اور شعریت کی دل آویزی موجود ہے۔ سیماب وطن کی محبت سے سرشار ہو کر وطن کی عظمت کے گن ہی نہیں گاتے بلکہ اس کی زبوحالی کا ادراک کر کے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک صدارتی خطبے میں شرکائے مشاعرہ سے فرمایا کہ:

> ''اپنے وطن کر سرد و گرم، رطب و یابس سے متاثر ہو کر نشاطیہ یا المیہ اشعار کہیں تو ہماری شاعری دوسری زبانوں کی شاعری سے ممتاز ہو سکتی ہے۔ بلکہ آج بھی ہمارے ملک میں حسان، فردوسی اور شیکسپیئر سے بھی بہتر شاعر پیدا ہو سکتے ہیں۔''

انسانیت اور وطنیت کے جذبہ کے تحت سیماب ہندوستانی نوجوانوں میں قومیت اور انسان دوستی کے اوصاف پیدا کرنے کہ خواہش مند ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر سیماب بھی اقبال کی طرح سچے وطن پرست اور عظمت مشرق کے دلدادہ ہیں۔ان کی نظم ہم ہندوستانی، حب الوطنی،

قوم پرستی اور انسان دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ان کی سیاسی نظموں میں گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مسیح الملک اور ظفر علی خاں کے ساتھ دیگر عالمی سیاسی شخصیات کا بھی ذکر ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں مجلس اقوام اور بساط سیاست بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ سیماب کی رثائی مجموعوں سرودِ غم اور نفیرِ غم سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ انھوں نے رثائی کلام کو آہ و بکا کی حدود سے نکال کر قوم کے تزکیہ کا وسیلہ بنایا۔

سیماب نے غزل اور نظم کی مختلف ہیئتوں میں طبع آزمائی کے ساتھ رباعی جیسی صنف سخن میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں اور بڑی دل پذیر رباعیات تخلیق کی ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہر نفس پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں
جھگڑے ہیں اور انسان ہے اور کچھ بھی نہیں
تھی وسعت عالم کبھی جنت یکتا
اب جنگ کا میدان ہے اور کچھ بھی نہیں

علامہ سیماب اکبرآبادی نے تمام تر دنیاوی الجھنوں کے رہتے ہوئے اپنی فکر رسا اور جودت طبع کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ ان کی اختراعی ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشاعروں کی مجالس کو صرف سخن طرازی اور سماعت سخن کی اسٹیج تک محدود رکھنے کے بجائے ان شعرائے کرام اور سخن فہم حضرات کی تربیت گاہ بنانے کی غرض سے صدر مشاعرہ کے صدارتی خطبہ کی بنا ڈالی۔ سیماب ہی نے دیگر شعرا سے بہت پہلے آزاد نظم کو اردو میں ڈھالا تھا۔ ان کے اس ہئیتی تجربہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ ۱۹۳۵ تک مختلف موضوعات پر ۲۸۴ کتابیں تصنیف کر چکے تھے، جن میں کیمیائے سخن، کلیم عجم، سدرۃ المنتہٰی، کار امروز، ساز و آہنگ، شعر انقلاب، عالم آشوب، نفیرِ غم، سرودِ غم، راز عروض، دستور الاصلاح، کرشن گیتا، سیرت النبی،

الہام منظوم اور وحی منظوم وغیرہ دنیائے شعر وادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

میں بلا تکلف اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ سیماب جیسے قادر الکلام شاعر اور میدان سخن کے عظیم سپاہی کی جس طرح قدر دانی ہونا چاہیے تھی، اس میں اہل زبان وفن سے خاصی کوتاہی ہوتی ہے حتیٰ کہ آج تک نہ تو کسی صاحب ذوق نے اور نہ ہی کسی صاحب انجمن یا سرکاری ادارے نے ان کے کلیات شائع کرانا ضروری خیال کیا۔ یہ سعادت بھی ان کے پوتے اور رسالہ ''شاعر'' کے حالیہ ایڈیٹر افتخار امام صدیقی کے حصہ میں آنا تھی جنہوں نے صاحب فراش رہتے ہوئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور امید ہے کہ عنقریب کلیات سیماب زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائقین فن کی تشنگی دور کرنے کا ذریعہ بنے گی۔